

رمضان

PDFBOOKSFREE.PK

کتب

مُنْجَفٌ

نڑواڑ

القریش پبلی کیشنر

سرکر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37668958 , 042-37652546

www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

خوب سے خوب تر کتابیں
جدت اور معیار کے ساتھ

با اہتمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں ।

ایڈیشن 2013

طبع نیرساہد پریس لاہور

کمپوزنگ کالاگنس گرافس

قیمت 450/- روپے

النَّسَابُ

سیر کے بہترینے دوستے
سیر کے بہترینے نیچر۔

۶۰

ایک بہت خوبصورت لڑکی

سوہیہ عزیز

کے

نام

ہر اس حسینہ کے شکریے کے ساتھ
جو آپ سیدیے کرتی ہیں
اور جو کچھ آپ نے نہ کہا یا اور سکھایا ہے
میں شاید کسی اور سے نہ سیکھ پائی

پیش لفظ

مصحف.....

یہ کہانی میں نے فی البدیہ یہ لکھی ہے۔ بالکل فی البدیہ یہ۔

اس کو لکھنے سے قبل جو مرکزی خاکہ میرے ذہن میں تھا، لکھنے کے بعد وہ ذرا سا مختلف تو ہوا ہی، مگر کردار..... جو مرکزی کردار میرے پلاٹ کے ستون تھے، ان میں سب وہی ہیں جو آپ اس ناول میں پڑھیں گے، ہوائے فرشتے ابراہیم کے۔

فرشتے کا کردار اس کہانی کا بھی بھی حصہ نہیں تھا۔ نہ میرے پلاٹ میں، نہ ذہن میں۔ یہ کردار اپنے پہلے منظر میں کہاں سے ابھرا، میں خود بھی نہیں جانتی۔ بس اس کردار نے میرے قلم سے خود کو خود ہی لکھوا�ا۔ اس کی شخصیت، کردار سازی، ہیئت اور مکالے تک یہ خود ہی لکھواتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ کردار پوری کہانی بن گیا۔ فرشتے اس ناول کی ہیر و نہیں تھی، مگر اس نے خود کو ہیر و نہ سے زیادہ مقبول کر لیا..... اور پھر اس کا انجام..... اس کا اخیر..... ان سب چیزوں کا فیصلہ بھی اس کردار نے خود ہی کیا۔ ”مصحف“ کا انجام میں نے وہ نہیں لکھا، جوان چھ ماہ میں میرے ذہن میں رہا تھا۔ جب یہ ناول خواتین ڈائجسٹ میں چھپ رہا تھا اس کہانی کے انجام انجام کا بھی اسی کردار نے ہی تعین کیا ہے۔

مصحف، دراصل ”مصحف“ کے ساتھ جائزے والی دوڑکیوں کی کہانی ہے۔ یہ سنگ مرمر کے چمکتے برآمدوں اور اوپنچے ستونوں والی مسجد کی کہانی ہے۔ یہ امانت اور رحم کے حق ادا کرنے والوں کی کہانی ہے۔ یہ صبر کرنے اور شکوہ نہ کرنے والوں کی کہانی ہے۔ یہ قسم پوری کرنے والوں کی کہانی ہے۔ اور یہ کہانی ہے خیانت کرنے والوں کی..... علم پر غرور کرنے والوں اور تقویٰ پر ناز کرنے والوں کی.....

یہ مجمل اور فرشتے کی کہانی ہے۔

میں ان تمام لوگوں کی احسان مند اور شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی تحریک میں میری مدد کی۔ میں اپنی ایڈیٹر امت الصبور کی تہہ دل سے ممنون ہوں، جنہوں نے اس کے انجام کو

آڑا تر چھا، چھوٹے بڑے ہر انداز میں یہی لکھا تھا۔ وہ لڑکی کبھی کبھی ہی اس کے بیک کو دیکھتی تھی، مگر محمل کے تو روز کے دس منٹ اس سیاہ قام لڑکی کا جائزہ لیتے ہی گزرتے تھے۔

وہ بھی عجوب پُر اسرار کردار تھی۔ یہاں اسلام آباد میں سیاہ قام نظر آہی جاتے تھے، مگر وہ اپنے جیسوں سے مختلف تھی۔ سر پر رومال باندھ کر گروں کے پیچھے گردہ لگاتی اور نیچے اور کوٹ، موٹے ہونٹ، سیاہ رنگت..... مگر چمکیلی آنکھیں..... کوئی ایسی چمک تھی ان میں کہ محمل کبھی ان آنکھوں میں دیکھنے پائی تھی، ہمیشہ نگاہ چڑا جاتی۔ شاید ڈیڑھ مہینہ قبل سے وہ اسے اپنے مخصوص اوقات میں اشینڈ پر دیکھتی تھی۔ اور ان ڈیڑھ ماہ میں اس کا انداز ہمیشہ یکساں رہا تھا۔

کمر سیدھی رکھے الرٹ سی بیخ پر بیٹھی، خاموشی سے سامنے سیدھے میں دیکھتی وہ بہت چپ سی لڑکی معلوم نہیں کون تھی۔ اور پھر اس کی وہ پُر اسرار کتاب.....! سیاہ جلد والی بھاری سی کتاب، جس کا سیاہ سر ورق بالکل خالی تھا، اس کی گود میں دھری ہوتی اور کتاب کے کناروں پر اس کے سیاہ ہاتھ مضبوطی سے جھے ہوتے۔ اس کے انداز۔۔۔ کچھ خاص جھلکتا تھا۔ کتاب کی حفاظت کا احساس یا شاید اس کے بیش قیمت ہونے کا۔

کتاب بالشت بھر مولی تھی۔ صفحوں کے جھلکتے کنارے پیلے اور خستہ لگتے تھے، جیسے کوئی بہت قدیم کتاب ہو، سینکڑوں برس پرانا کوئی نہ ہو۔ کچھ تھا اس میں۔ کوئی قدیم راز، کوئی پُر اسرار کتھا۔ وہ جب بھی اس کتاب کو دیکھتی، یہی سوچتی، اور آج جانے کیا ہوا، وہ اس خاموش سی لڑکی سے مخاطب ہو ہی گئی۔ شاید تجسس عاجز کر رہا تھا۔

”دیکسکیو زی! ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟“

”پوچھو۔“ سیاہ قام لڑکی نے اپنی چمکیلی آنکھیں اٹھائیں۔

”یہ کتاب کس کی ہے؟“

”میری!“

”میرا مطلب ہے، اس میں کیا لکھا ہے؟“

وہ چند لمحے محمل کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے بولی۔

”میری زندگی کی کہانی؟“

”اچھا.....“ وہ حیرت پچھا نہ سکی۔ ”میں بھی، یہ کوئی قدیم کتاب ہے۔“

”قدیم ہی ہے۔ صدیوں پہلے لکھی گئی تھی۔“

”تو آپ کو کہاں سے ملی؟“

”مصر کی ایک پرانی دکان سے۔ یہ کچھ کتابوں کے نیچ پڑی تھی۔ جب میں نے اسے نکلا تو اس پر زمانوں کی گرد تھی۔“ وہ محبت سے سیاہ جلد پر ہاتھ پھیرتے کہہ رہی تھی۔ اس کے لیوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ ”میں نے وہ گرد جھاڑی اور اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ پھر جب پڑھا تو معلوم ہوا کہ اسے تو کسی نے میرے لئے لکھوا کر ادھر رکھا تھا۔“

محمل منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں کیا دلچسپی ہے اس میں؟“

”میں اس کے بارے میں مزید جانتا چاہتی ہوں۔ کیا میں اسے پڑھ سکتی ہوں؟“
وہ ہلکا سامکرانی۔

”تم نئے دور کی نئی لڑکی ہو۔ اس قدیم زبان میں لکھے نئے کو کہاں سمجھو گی؟“

”مگر یہ ہے کیا؟ اس میں کیا لکھا ہے؟“ وہ تجھس اب اسے بے چین کر رہا تھا۔

”میرا مااضی۔“

اسی پل ہارن بجا تو محمل نے چونک کر سامنے سڑک پر آتی بس کو دیکھا۔

”میرا حال.....“ وہ سیاہ قام لڑکی کہہ رہی تھی۔

محمل بیک کا اسٹریپ پکڑے کھڑی ہوئی۔ اسے جلدی کالج پہنچنا تھا۔

”اور میرا مستقبل بھی۔ مجھے کیا پیش آنے والا ہے، یہ کتاب سب بتاویتی ہے۔“

”میں چلتی ہوں۔“ وہ بس کی طرف دیکھتے مغدرست خوابانہ انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

”اس میں تمہارا ذکر بھی ہے محمل؟“

وہ اٹھئے پیروں مڑی۔

”میرا ذکر؟..... میرے بارے میں کیا لکھا ہے؟“ وہ ششدہ بی تورہ گئی تھی۔
”یہی کہ میں تمہیں یہ کتاب دے دوں۔ لیکن میں تو اسے تمہیں تب ہی دوں گی،
جب تم تھک کر خود مجھ سے مانگنے آؤ گی۔ کیونکہ اس میں تمہاری زندگی کی کہانی بھی ہے۔
جو ہو چکا ہے اور جو ہونے والا ہے، سب لکھا ہے۔“

بس کا تیز ہارن بجا تو وہ کچھ کہے، نا تیزی سے اس طرف پکی۔ راذ پکڑ کر اوپر
چڑھتے اس نے پل بھر کو پلٹ کر دیکھا تھا۔
وہ سیاہ قام لڑکی اسی طرح مسکرا رہی تھی۔

پُراسرار، معنی خیز مسکراہٹ۔ محمل کو ایک دم اس سے بہت ڈر لگا تھا۔



کانج کے بعد وہ اپنی دوست نادیہ کے ابو کی اکیڈمی میں سیونٹھ کلاس کے بچوں کو
سائنس اور میتھس پڑھاتی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے اسے روز ساڑھے تین ہو جاتے تھے۔
گیٹ عبور کر کے پورچ میں دیکھا تو تین گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ دل کراہ
کر رہ گیا۔ گھر میں گاڑیوں کی قطار کے باوجود وہ بسوں کے دھکے کھانے پر مجبور تھی۔
”ہم پچاؤں کے رحم و کرم پر پلنے والے قیموں کی نصیب بھی کتنے شیم ہوتے ہیں
نا!“ خود پر ترس کھاتی وہ اندر آئی تھی۔

لا دنچ میں خاموش دوپہر اتری ہوئی تھی۔ وہ سب کے منونے کا نائم تھا۔ آغا جان،
اس کے سب سے بڑے تایا، اس وقت تک آفس سے لوٹ آتے تھے اور ان کی بھی نیند
کے باعث پورے گھر کو حکم ہوتا تھا کہ پتا بھی نہ کھڑ کے، ورنہ وہ ڈشرب ہوں گے۔ حکم
بظاہر پورے گھر کو اور درحقیقت محمل اور سرت کو سنایا جاتا تھا۔ اور آخر میں جب آغا جان
کی بیگم تائی مہتاب ان الفاظ کا اضافہ کرتیں۔

”اور سرت! ذرا اپنی بیٹی کو سمجھا دینا کہ جب لو رلو رشہر پھرنے سے فارغ ہو جائے
تو گھر آتے ہوئے میں ڈور آرام سے کھولا کرے، آغا صاحب کی نیند خراب ہوتی ہے۔
اب میں کچھ کہوں گی تو اسے برالگے گا۔ گز بھر کی تو زبان ہے اس کی۔ نہ چھوٹے کا لحاظ،
نہ بڑے کا ادب۔ استغفار اللہ! ہماری بیٹیاں بھی کانج میں پڑھی ہیں، ان کے انداز ایسے

نہ نکلے، جیسے محمل کے۔ ”وغیرہ وغیرہ تو اسے تو آگ بی لگ جاتی۔

ہر روز دروازہ کھولتے ہوئے یہی فقرہ ساعت میں گونجتا تو وہ چونے کے باوجود دروازہ آہستہ بند کرتی۔

پچھن کی طرف آئی تو سنک میں جھونٹے برتنوں کا ذہیر لگا تھا۔ ناگواری سے ناک چڑھائے، اس نے بیگ سلیب پر رکھا اور ہاث پاٹ کی طرف بڑھی۔ صبح ناشتے کے بعد سے اب تک پچھنہ کھایا تھا، اور اب زوروں کی بھوک لگی تھی۔

ہاث پاٹ کھولا تو وہ خالی تھا۔ رومال پر روٹی کے چند ذراتے پھرے تھے۔ اس نے فرنگ کھولنا چاہا تو وہ لاکڑھ تھا۔ مہتاب تائی اس کے آنے سے قبل فرنگ لاک کر دیتی تھیں۔ پہلے سرت اس کے لئے کھانا بچا کر ہاث پاٹ میں رکھتی تھیں، مگر جب سے مہتاب تائی نے کھانے کی خود گرانی شروع کی تھی، ہاث پاٹ ہر تیرے دن خالی ہی ملتا تھا۔

تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن پھر ضبط کر کے باہر نکلی اور آہستہ سے گیٹ عبور کر کے کالونی کے باہر نکلا دالے ہوٹل سے ایک نان اور ایک کباب لے آئی کرتے ہی پہنچے تھے۔

واپسی پر وہ پھر سے پرانی محمل بن چکی تھی۔ لاونچ کا دروازہ کھول کر دھرام سے بند کیا۔ فرش پر پڑی فٹ بال اٹھا کر پوری قوت سے دیوار پر ماری اور صوفے پر ناگ پر ناگ رکھ کر بیٹھی نان کباب کا لفافہ کھولنے لگی۔

لمحے بھر بعد ہی آغا جان کے کمرے کا دروازہ کھلا اور تنقیتی ہوئی تائی مہتاب باہر آئیں۔

”محمل.....!“ وہ گر جیس تو اس نے آرام سے سرا اٹھایا۔

”کباب کھائیں گی تائی اماں؟“

”شش اپ..... ہزار دفعہ کہا ہے کہ آرام سے دروازہ کھولا کر وگر تم.....!“

”آہستہ بولیں تائی اماں! اس وقت آغا جان سور ہے ہوتے ہیں، اٹھ جائیں گے۔“ وہ نان پر کباب رکھ کر پاؤں جھلاتی، بے نیازی سے کھا رہی تھی۔

”تم..... احسان فراموش..... تمہیں ذرا بھر بھی احساس ہے کہ آغا صاحب دن

بھر کے تھکے....."

مگر فقرہ مکمل ہونے سے قبل ہی وہ اپنا نام کتاب اٹھائے اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔

تائی مہتاب تملاتی، گلستی رہ گئیں۔

اندر صرت آوازوں پر چاگ چکی تھی۔

"کیا ہوا ہے محمل! بھابی جیگم کیوں ناراض ہو رہی ہیں؟"

"دماغ خراب ہے ان کا۔ پیدائشی مسئلہ ہے۔ آپ کو نہیں پڑھے؟" اس نے بے زاری سے نام کتاب کا لفافہ بستر پر رکھ دیا۔

"مگر ہوا کیا ہے؟" ان کی نگاہ پھسل کر لفافے پر گئی۔ "بھر باہر سے کھانا لائی ہو؟ فرج میں....." اور پھر خود ہی خاموش ہو گئیں۔

"آپ کے لئے لائی ہوں۔ آپ نے کچھ کھایا؟"

"میں کھا چکی ہوں، یہ تم کھاؤ۔ مجھے معلوم ہے، تم نے کچھ نہیں کھایا۔" وہ تھکاوت سے مسکرائیں تو محمل نے لمحہ بھر کو ماں کو دیکھا۔ سادہ، گھسے ہوئے کاشن کے جوڑے میں، سفید ہوئے بال اور جھریلوں زدہ چہرے والی اس کی تھکی تھکی، بے ضرری ماں، جو واقعی اس عالی شان کوٹھی کی مالکن ہوتے ہوئے بھی ملازماہ لگتی تھی۔

"دل برامت کیا کرو محمل! اللہ کا نام لے کر کھالو۔"

"مجھے غصہ آتا ہے ان لوگوں پر اماں!"

باہر تائی مہتاب کے بولنے کی آواز برابر آرہی تھی۔ وہ اب شور کر کے جانے کس کو بتا رہی تھیں۔

"ناشکری مت کرو بیٹا! انہوں نے رہنے کے لئے ہمیں جھبت دی ہے، سہارا دیا ہے۔"

"احسان نہیں کیا، میرے باپ کا گھر ہے۔ اسے ابا نے ہمارے لئے بنایا تھا۔ یہ بُنس، یہ فیکریاں، یہ سب ابا نے خود بنایا تھا۔ سب کچھ ابا نے ہمارے نام کیا تھا۔"

"تمہارے ابا اب زندہ نہیں ہیں محمل! وہ اب کہیں بھی نہیں ہیں۔" وہ جیسے تھک کر

کہہ رہی تھیں اور وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ پھر سر جھٹک کر لفاظ اٹھایا۔
تاں سخت ہو گیا تھا اور کتاب بٹھندا۔ وہ بے دلی سے لقے توڑنے لگی۔

۶۰

یہ بٹھندا، بے لذت کھانا کھا کر وہ کچھ دیر ہی سو پائی تھی کہ ٹھاہ کی آواز کے ساتھ
کمرے کے دروازے سے فٹ بال نکرا یا۔
وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔

باہر دیواروں پر فٹ بال مارنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔
بھی نیند ٹوٹی تھی۔ وہ برا سامنہ بنائے، جماں روکتی اٹھی۔ سلیپر پہنے اور ہاتھوں سے
بال پیشیتے دروازہ کھولا۔

اس کا اور مسرت کا مشترکہ کمرہ دراصل کچن کے ساتھ ملحقہ اسٹور روم تھا۔ بہت
چھوٹا، نہ بہت بڑا۔ عرصہ پہلے اسے کاٹھ کبڑی سے خالی کروائے کے ان دونوں کو ادھر منتقل کر
دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ باٹھ روم نہ تھا، اس لئے ان کو لاونچ پار کر کے گیست باٹھ روم
کی طرف جانا پڑتا تھا۔

باہر لاونچ میں نامہ چاچی کے چھوٹے معاذ اور معیز فٹ بال ادھر ادھر مارتے
دوڑتے پھر رہے تھے۔

”تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو؟ دیکھ کر کھیلا کر دے، میں سورہی تھی۔“

کچن کے کھلے دروازے پر کھڑی، اندر کسی سے بات کرتی نامہ چچی فوراً مڑیں۔

”اب میرے پیچے کھلیں بھی نہ؟..... تمہارا تو کام ہی سونا ہے۔ نہ دن دیکھنا، نہ
رات، ہر وقت بستر ہی توڑتی رہتی ہو۔“

ہاں، تو میرے باپ کے پیسے یہ بستر آئے تھے۔ توڑوں یا پھوڑوں، میری
مرضی۔ ابا کی ڈیجھ سے پہلے اسد پچا تو غالباً بے روزگار تھے نا؟“

وہ بھی محمل تھی، سارے حساب فوراً چکا کر بے نیازی سے باٹھ روم کی طرف چلی۔
ادھر نامہ چچی بڑا بڑا تی رہ گئیں۔

منہ باٹھ دھو کر اس نے اپنے سلکی بھورے بال دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر اوپنے

کئے اور پونی باندھی۔ بہت اوپنجی سی بجوری یہ پونی ٹیل اس پر بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ ذرا بھی سر بلاتی تو اوپنجی پونی ساتھ ہی گردن کے اوپر جھوٹتی۔

اس کی آنکھیں کائچ سی شہری تھیں اور ہلکا سا کا جل بھی ان کو دہکا دیتا تھا۔ وہ بلاشبہ گھر کی سب سے حسین لڑکی تھی۔

اسی لئے تو جلتی ہیں یہ سب۔ اے نہیں آگئی۔ ایک نظر خود پر ڈالی۔ جیز کے اوپر کھلا سا گرتا اور گردن کے گرد لپٹا دوپٹا، مفلکی طریقہ ایک پوسانے کو لٹکتا اور دوسرا کمر پر گرتا۔ وہ واقعی سب سے منفرد تھی۔

کچن میں تائی مہتاب نکش نکال کر مسرت کے سامنے رکھ رہی تھیں، جو بہت تابعداری سے ایک طرف چائے کا پانی چڑھا کر، دوسری طرف کڑا ہی میں ٹیل گرم کر رہی تھیں۔ اس پر نظر پڑی تو نکش رکھتے ہوئے ذرا لاپرواٹی سے گویا ہوئیں۔

”یہ بچوں کے لئے فراتی کر دو مسرت! اب ہر کوئی تو باہر سے منہ مار کر نہیں آتا۔“

”بجا فرمایا تائی اماں! یہاں تو لوگ گھر کے اندر ہی دوسروں کے مال پر منہ مارنے ہیں۔“ وہ اطمینان سے کہہ کر کول سے پانی کا گلاں بھرنے لگیں۔

”زبان کو سنبھالو لڑکی! تو بے، ہماری بیٹیاں تو کبھی ایسے ہمارے آگے نہ بولیں۔“

”آپ برامت مانیں بھائی بیگم! میں سمجھا دوں گی۔“ گھبرا کر مسرت نے ایک ملتوی نگاہ محمل پر ڈالی۔ وہ کندھے اچکا کر کھڑے کھڑے پانی پینے لگی۔

”سمجھا دینا، بہتر ہو گا۔“ اس پر ایک تنفس بھری نگاہ ڈال کر تائی مہتاب باہر چل گئیں۔ ہاعمدہ چھپی پہلے ہی جا چکی تھیں۔ اب مسرت اور محمل ہی کچن میں رہ گئے تھے۔

”اب یقیناً برتن بھی آپ کو ہی دھونے ہوں گے اماں!“

”دھو بھی دوں تو کیا ہے، ان کے احسان کم ہیں ہم پر؟“ وہ مصروفی ایک ایک کر کے نکش کڑا ہی میں ڈال رہی تھیں۔

محمل نے ایک گھری سانس لی اور آستینیں موڑ کر سنک کی طرف متوجہ ہوئی۔ اے علم خان کہ اگر وہ نہ کرے گی تو مسرت کو ہی کرنا ہو گا۔ اور ابھی تو انہوں نے رات کا کھانا بھی تیار کرنا تھا۔

”ترہنے دو بیٹا! میں کرلوں گی۔“

”مجھے پتہ ہے آپ کر لیں گی۔ مگر میں بھی ان لوگوں پر ذرا احسان کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ برتن دھو کر فارغ ہوئی تو صرتھ ٹرالی بھر چکی تھیں۔

”مholm! یہ باہر لے جاؤ۔ سب لان میں ہوں گے۔“

وہ بنا احتجاج ٹرالی گھینٹنے لگی۔ لان میں روز شام کی طرح کریاں گلی تھیں۔

آغا کریم اخبار کھولے دیکھ رہے تھے، ساتھ ہی مہتاب تائی اور ناعمہ چچی باتیں کر رہی تھیں۔ ناعمہ چچی سب سے چھوٹے پچا اسد کی بیوی تھیں، جو قریب ہی بیٹھے غفران پچا سے کچھ کہہ رہے تھے۔ غفران پچا اور محمل کے ابا، آغا ابراہیم جڑواں تھے۔ آغا کریم ان سے بڑے اور اسد پچا چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

غفران پچا کی بیگم فضہ چچی یہ آمدے میں کھڑی، اپنی بیٹی کو آواز دے رہی تھیں۔ اسے ٹرالی لے کر آتا دیکھ کر مسکرا میں۔

”اوے محمل جان! تم اکیلی لگی رہیں، ندا یا سامیہ کو کہہ دیا ہوتا، تمہاری ہیلپ کروا دیتیں۔“

فضہ چچی، ناعمہ اور مہتاب کی طرح زبان کی کڑوی نہ تھیں، بلکہ اتنی میٹھی تھیں کہ جب یہ شخص اپنے بیوی سے دوسرے کے حلق میں آندھیتیں تو وہاں کانے اُگ آتے۔

”اُس اوکے۔“ وہ بھی بس مسکرا کر ٹرالی آگے لے گئی۔ اب کیا کہتی کہ ندا اور سامیہ نے پہلے کون سے کام کئے تھے جواب کرتیں۔ اگر وہ انہیں بلاقی تو وہ فوراً چلی آتیں، ایک دو چیزیں پکڑا تیں، چولہا جلا تیں، باشیں بگھارتیں اور پھر آہستہ سے کھسک جاتیں۔

اس کے بعد لان میں فضہ چچی سب کو ایک ایک چیز یہ چکھیں، میری سامیہ نے بنائی ہے۔“ اور ”میری ندا کے ہاتھ میں تو بہت ذائقہ ہے۔“ کہہ کر پیش کرتیں۔ اس پر

مہتاب تائی ان کی تعریف تو نہ کرتیں مگر صرتھ اور محمل کو کاہلی کے وہ طعنے ملتے کہ اس سارے قضاۓ سے بچنے کو محمل نے بھی ان دونوں کو بلا نے کی غلطی نہ کی تھی۔ مگر فضہ چچی کی یہ میٹھی زبان ہی تھی کہ نہ وہ بھی ان کو پلٹ کر جواب دے سکی، نہ ہی کچھ جتسکی تھی۔ وہ موقع ہی نہ دیتی تھیں۔

”لاو.....لاو۔ جلدی کرو۔ دنوں ماں بیٹی لگتی ہیں، پھر بھی گھنٹہ لگ جاتا ہے۔“

”تاں! آپ کوئی ملازمہ کیوں نہیں رکھ لیتیں؟ کم از کم آپ کو ہم ماں بیٹی پہ چلانا تو نہ پڑے گا۔“ وہ تیزی سے کہہ کر ٹرالی وہیں چھوڑے واپس چلی گئی۔ سب باشیں چھوڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

”احسان کرنے کا زمانہ ہی نہیں رہا۔“ تاں نے ٹرالی اپنی طرف کھینچی۔ آغا کریم نگاہیں چدا کر پھر سے اخبار میں گم ہو چکے تھے۔

وہ واپس کچن کی طرف آئی تو فواد تیزی سے سڑھیاں پھلانگا نیچے آ رہا تھا۔

”چائے لگ گئی؟“ آخری سڑھی اترتے، مصروف سے انداز میں کہتے وہ کلامی پہ گھری باندھ رہا تھا۔

”سنیکس لے گئی ہوں، چائے لاتی ہوں۔“ وہ زیادہ غور سے سے بغیر باہر نکل گیا۔ محمل نے رک کر لمحہ بھر کو اسے جانتے دیکھا۔

وہ مہتاب تاں کا بڑا بینا تھا۔ حنان، وسیم اس کے بعد تھے اور سدرہ اور مہرین سب سے چھوٹی تھیں۔ فواد، آغا جان کے آفس جاتا تھا۔ اوپر لبا، خوش شکل تو تھا، مگر ڈرینگ اور دولت کی چمک دمک سے مزید پُرکشش اور پہنڈسٹ لگتا تھا۔ خاندان کا سب سے پاپولر لڑکا، جس پہ ہر لڑکی کا دل اور لڑکی کی ماں کی نظر تھی۔ عدا اور سامیہ ہوں، یا ناعمه کی مغرور، نخیلی آرزو، سب فواد کے آگے پیچھے پھرتیں۔ رضیہ چھپو تو اپنی الکوئی فائقہ کے لئے بھی فواد کو ڈنر پہ بلا رہی ہیں تو کبھی فائقہ امدادوں کا حلہ بنا کر اس کے لئے لارہی ہے۔ فواد بیٹھا شوق سے کھاتا تھا، سو یہ لڑکیاں، ماڈوں کے بناۓ کو ”اپنا“ کہہ کر بہت شوق سے پیش کرتی تھیں۔ مگر وہ بھی سدا کا بے نیاز تھا۔ اپنی اہمیت کا احساس تھا کہ بے نیازی اور اتراءہ کم نہ ہوتی تھی۔ اور وہی تو تھا جس پہ مہتاب تاں گردن اوپر کر کے پھرتی تھیں، ورنہ حنان تو بمشکل ایف اے کر کے دہنی ایسا گیا کہ نہ تو پھر خط پڑ لکھا، نہ ہی پھوٹی کوڑی گھر بیجی۔ تعلیمی ریکارڈ اس کا اتنا برآ تھا کہ تاں کو حصتی رہتی تھیں۔ مگر یہ وسیم تھا جس نے تاں اور آغا جان کا ہر جگہ سرشم سے جھکایا تھا۔

تالائیں، نکلا، ایف اے میں دوبار فیل ہو کر پڑھائی چھوڑ کر آوارہ گردی میں مشغول،

سگریٹ کا عادی..... اور کہنے والے تو بے لفظوں میں کہہ بھی دیتے تھے کہ ان گلیوں کا بھی پرانا شناسا ہے، جہاں دن سوتے اور راتیں جا گتی ہیں۔

وہ سر جھٹک کر کچن میں آئی تو مسرت جلدی جلدی کپڑے سے سلیب صاف کر رہی۔ تھیں۔ ان کی پیالی میں آدھا کپ چائے پڑی تھی۔ ان سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ اس نے ٹرے اٹھا لی۔

لان میں فضہ چجی کے ساتھ والی کرسی پر فواد بیٹھا تھا اور وہ مسکرا کر بہت توجہ سے کچھ بتا رہی تھیں اور وہ لاپرواں سے سن رہا تھا۔ یقیناً ندا یا سامیہ کی خوبیوں کا کوئی قصہ تھا۔ محمل اس کے کپ میں چائے اٹھیں لی رہی تھی کہ وہ کہہ اٹھا۔

”میرے کپ میں چینی مت ڈالنا۔“

”نہیں ڈالی۔“ وہ بیجوں کے بل گھاس پر بیٹھی سب کو چائے اٹھا کر دے رہی تھی۔

”اے بیٹا! چینی کیوں نہیں پی رہے؟“ فضہ چجی بہت زیادہ فکر مند ہوئیں۔

”یونہی کچھ دیہت لوز کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”اتھے تو اسارت ہو۔ اور کیا لوز کرو گے؟“ آرزو اسی میں سامنے والی کرسی پر آبیٹھی تھی۔ ”اور میری چائے میں آدھا چچہ چینی، محمل!“

وہ فواد کے بالکل سامنے ناگ پٹا ناگ چڑھا کر بیٹھی تھی۔ چست سا سفید ٹراؤزر اور اوپر قدرے کھلے گلے والی ریڈ شارٹ شرٹ۔ کندھوں تک اسٹیپ میں کئے بال اور گندی عام سا چہرہ جس کو بہت محنت سے اس نے قدرے پر کوشش بنایا تھا۔ مگر پنکی کمان سی آئی بروز اس کو بہت شااطر دکھاتی تھیں۔ وہ ناعمر چجی اور اسد پچا کی اکلوتی اور لاڈی بیٹھی تھی۔

”فٹ تو رکھنا پڑتا ہے خود کو۔ محمل! یہ کباب کپڑا نا۔“ فواد نے ہاتھ بڑھا کر کہا تو محمل نے فوراً کباب کی پلیٹ اٹھا کر دینا چاہی اور دیتے دیتے اس کی انگلیاں فواد کے ہاتھوں سے مس ہوئیں۔ وہ چونکا تو گھبرا کر محمل نے پلیٹ چھوڑ دی۔ وہ گر جاتی اگر وہ تمام نہ لیتا۔ محمل نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ پلیٹ کپڑے یک نک اسے دیکھ رہا تھا۔ چونک کر، سب کچھ بھول کر، جیسے اسے پہلی وفاد دیکھا ہو۔ بس لمحے بھر کا عمل تھا۔ اس نے رخ

پھر لیا تو وہ بھی دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔

فضہ چھی اور آرزو کسی اور طرف متوجہ تھیں۔ کسی نے بھی وہ لمحہ محسوس نہ کیا تھا جو آکر گزر بھی چکا تھا اور فواد، وہ وقٹے وقٹے سے اس پر ایک نگاہ ڈالتا تھا، جو بچوں کے مل گھاس پر بیٹھی سب کو چائے سرو کر رہی تھی۔ ذرا سار جھکاتی تو بھوری پونی ٹیل اور اوپر لگتی تھی۔ سر اٹھاتی تو پونی ساتھ ہی جھولتی اور وہ کافی سی سنہری آنکھیں، ان ساری لڑکیوں کے پاس اس جیسا کچھ بھی تو نہ تھا۔

وہ چائے کے سب لیتا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔



شام میں وہ کمرے میں بند پڑھتی رہی، پھر مغرب ڈھل گئی تو کچن میں آگئی جہاں صرت پھرتی سے لٹنگ بورڈ پر پیاز ٹماڑ کا ٹھی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ کچن میں اور کوئی نہ تھا اور سارا پھیلاوا یقیناً انہی کو سیٹنا تھا۔

”اماں! یہ تائی اماں یا چاچیوں میں سے کوئی کھانے کی ذمہ داری کیوں نہیں لیتا؟“
ہمیشہ آپ ہی کیوں بناتی ہیں؟“ وہ یہ سب دیکھ کر ہول گئی تھی۔

”تو ہمارا گھر ہے بیٹا! میں یہ کروں گی تو کیا ہو جائے گا؟“

”آپ تھکتی نہیں ہیں ان کی خدمت کرتے کرتے؟“

”نہیں، تھکن کیسی؟“ وہ اب جھک کر چولہا جلا رہی تھیں۔

”اچھا بتائیں۔ کیا بناتا ہے؟ میں کچھ کراؤں۔“

”بریانی تو بناتی ہی ہے، باقی مہتاب بھائی سے پوچھتی ہوں۔“ اور اسی پل مہتاب تائی نے کچن کے دروازے سے جھانکا۔

”کھانا بناتا اب شروع بھی کر دو صرت! روز دیر ہو جاتی ہے۔“

صرت چولہا جلاتے فوراً پڑیں۔ ”جی بھائی! بس شروع کر رہی ہوں۔ آپ بتائیں، بریانی کا ویسیں بیٹھا کہہ گیا تھا، ساتھ کیا بناؤں؟“ وہ دوپٹے سے ہاتھ پوچھتے ان کے سامنے جا کر پوچھنے لگیں۔

”ساتھ مژر قیسہ بناؤ۔ کباب بھی ٹل لیتا، اور دوپھر والا اردوی گوشت بھی گرم کر

لینا، آلو کا ایک سالن بھی بنالو، سلا درائے بھی نہ بھولنا۔“

”جی، اور میٹھے میں؟“

”ذکر لو۔“ وہ بے نیازی و خوت سے گویا ہوئیں۔ ”پڑنگ بنالو۔ یا ڈبل روٹی کی کھیر۔“ وہ ایک اچھتی نظر اس پر ڈال کر پلٹ گئیں۔

”ایک نائم پر دیکھے بھر بھر کے آپ تین، تین چار چار ڈشز بناتی ہیں، مگر رات کے لئے کچھ بچتا ہی نہیں ہے۔“ وہ لکستی بھی تھی اور حیران بھی ہوتی۔

”تم خود ہی تو کہتی ہو کہ وہ ہمارا مال حرام طریقے سے کھاتے ہیں، پھر حرام میں کہاں برکت ہوتی ہے بیٹا؟“ ان کے لبھے میں برسوں کی تھکن تھی اور وہ کہہ کر پھر سے لٹنگ بورڈ پر جھک گئیں۔

وہ بالکل چپ سی ہو گئی۔ واقعی کیوں یہاں دیکھے کے دیکھے ایک وقت کے کھانے پر ختم ہو جاتے تھے؟ اس نے تو کبھی اس پہلو پر سوچا ہی نہ تھا اور اماں بھی ان کے ہر ظلم و زیادتی سے آگاہ تھیں، پھر بھی چپ چاپ سہے جاتی تھیں۔

”ہمارا مال!“ دل میں ایک کانٹا سا چھا۔ گیارہ برس قبل ابا کی ڈیجھ سے پہلے یہ فیکٹریاں، یہ جائیدادیں، بینک بیلفس، یہ امپورٹ ایکسپورٹ کی پوری بزنس ایمپائر، سب ابا کا تھا اور یہ آغا کریم خان، یہ راجہ بازار میں کپڑے کی ایک دکان چلاتے تھے۔ غفران پچا ایک معمولی سی کمپنی میں انجینئر بھرتی تھے اور آرزو کے والد اسد پچا، وہ تو دیسمبر کی طرح تھے: بے روزگار، نگتے، نکھلو اور نالائق۔ پھر کیسے ابا کے چہلم کے بعد وہ اپنے اپنے کرائے کے گھر خالی کر کے باری باری ادھر آن بے۔

یہ آغا ابراہیم کا گھر ”آغا ہاؤس“ تین منزلہ عالیشان، محل ندا کوئی تھی۔ نخلی منزل پر آغا جان کی فیملی نے بسیرا جمایا، بالائی پر فضا چاچی نے اور سب سے اوپری منزل پر اسد پچا کی فیملی کا قبضہ تھا۔ وہ چند دن کے لئے آئے تھے، مگر پھر وہ چند دن کبھی ختم نہ ہوئے۔

بات بے بات جگہ کی کمی کا رو نہ ریا جاتا، یہاں تک کہ ماشر بیڈروم سے سرست اور محل کو نکال کر اسٹور میں شفت کر دیا گیا۔ وہ اس وقت چھوٹی تھیں، شاید نو دس برس کی، مگر جیسے جیسے شعور کی منزلیں پار کیں تو اندر ہی اندر لا دا پکنارہا۔ اب تو عرصہ ہوا، اس نے دبنا

چھوڑ دیا تھا۔ گھر کے مردوں کے سامنے تو خیر وہ زبان بند ہی رکھتی، مگر تائی چبیوں سے برابر کا مقابلہ کرتی اور کرزز تو کسی لحاظتے میں نہ تھیں۔ لیکن اس زبان چلانے کے باعث اس پر سختیاں بڑھتی گئیں۔ وہ محض زبان سے جواب دے سکتی تھی، مگر تائی اماں وغیرہ دوسرے حریبے بھی استعمال کرتے۔ جب سے اس نے اپنے ذاتی جیب خرچ کے لئے ایک دوست کے والد کی اکیڈمی میں ٹیوشنز دینی شروع کی تھیں، اس کو گھر واپسی میں دیر ہو جاتی اور نیتھیا یا قصداً اس کے لئے دوپہر کا کھانا نہ رکھا جاتا۔ ایک دفعہ اماں ایک روٹی اور سالن کی پلیٹ بچا کر کرے میں لے گئیں، مگر تائی مہتاب کی نگاہ پڑی ہی گئی اور گھر میں بھونچاں ہی آگیا۔ وہ وہ باتیں سنائیں مسروت کو، ایسے ایسے ”چوری“ کے الزامات و القابات سے نوازا کہ مسروت پھر کبھی اس کے لئے کچھ بچا کر کرے میں نہ رکھ سکیں۔ شاید تائی یہ سب اس لئے کرتی تھیں تاکہ وہ ٹیوشن چھوڑ دے اور جو پندرہ سور دیسیہ اس ٹیوشن سے ملتا ہے، وہ اسے نہ ملا کرے۔

اور ٹیوشن کی اجازت بھی تو کتنی منتوں سے اسے ملی تھی۔ جب سب کے سامنے ہی اس نے پوچھ لیا تو شروع میں تو سب ہی اکھڑ گئے۔ لیکن اس کا فقرہ کہ ”ٹھیک ہے، آج کیم تاریخ ہے، لایے آغا جان! میری پاکٹ منی نکال لئے۔ مگر وہ اتنی ہی ہو جتنی سدرہ اور مہرین بائی کو ملتی ہے۔ کیونکہ اگر مجھے پاکٹ منی نہ ملی تو میں سدرہ اور مہرین کے ہر اچھے اور صہنگے جوڑے کو آگ لگا دوں گی۔“ اور وہ پہلی دفعہ اتنی جنونی ہو کر بولی تھی کہ مزید دس منٹ کی بحث کے بعد اسے اجازت مل ہی گئی تھی۔ اور ابھی جو اماں نے یاد دلا دیا کہ وہ لوگ ان کا مال لھاتے ہیں، تو وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ کچھ ایسا ضرور ہے کہ آغا جان اس میں سالہ لڑکی سے خائف ہیں۔ اگر کبھی جو وہ اپنا حصہ مانگنے کھڑی ہو جائے تو..... تو کیا ان کا کیس اتنا کمزور ہے کہ وہ عدالت کا فیصلہ اپنے حق میں نہ کر سکیں گے۔ اور انہیں ہر چیز محل کے حوالے کرنا پڑے گی؟ اور کیا وہ میں سالہ لڑکی اتنی باہمت ہے کہ وہ ان سب کو، ان شترنج کے اتنے ماہر اور چالباز کھلاڑیوں کو اپنی الگیوں پر نچا سکے؟

جواب ایک زوردار ”نہیں“ تھا۔ وہ بھی بھی ان کے خلاف اٹھ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن..... اگر کبھی اس کے ہاتھ ان کی کوئی کمزوری لگ جائے، کوئی ڈکھتی رگ جے

دبا کر وہ اپنے سارے حساب چلتا کر سکے، تو کتنا مزا آئے..... مگر ایسی کیا ذکھتی رگ ہو سکتی ہے ان کی؟

”بات سنو!“ مہتاب تائی نے پھر سے کچن میں جھانگا تو وہ اپنے خیالات کی بہکتی رو سے چونکی۔

”فواڈ کہہ رہا ہے، میٹھے میں چاکلیٹ سو فلے ہونا چاہئے۔ یوں کرو، ابھی ساتھ ساتھ شروع کر دو۔ اور ہاں، کوئی کی نہیں ہونی چاہئے۔ بہت عرصے بعد میرے بیٹے نے کسی خاص میٹھے کی فرمائش کی ہے۔“ بہت مان و فخر اور تنقیہ بھرے انداز میں کہہ کر وہ پلٹ گئیں اور محمد کی ذہن کی بھلکتی روایی ایک نکتے پر منجذب ہو گئی۔

”میرا بیٹا..... میرا بیٹا!“

تو آغا جان اور مہتاب تائی کی کمزوری، ذکھتی رگ اور ترپ کا پتا، سب کچھ ”فواڈ“ ہی تھا۔

اور اگر..... اگر جو یہ ذکھتی رگ اس کی انگلی تلے آجائے..... تو؟
”محمد! یہ آلو کاث دو۔ میرا خیال ہے، آلو اثرے بھی بنا لیتے ہیں، سب شوق سے کھاتے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ سوچ میں گم ان کے قریب آئی اور آلو چھیننے لگی۔
مرست نے بریانی کا مسala بنایا، قیمه مژبھی پکنے کے قریب تھا۔ محمد نے شامی کباب تلے، پھر آلو اثرے کا سالم، سلاور رائست، سب بنا چکی تو مرست روٹی پکانے لگیں۔

”فواڈ کے لئے سو فلے بنا کر فرنج میں رکھ دیا تھا نا؟“

”جی اماں! آپ غفرہی نہ کریں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ اسے شام لان میں فواڈ کا خود کو چونک کر دیکھنا اور لمحے بھر کو بہوت ہونا یاد آیا تھا۔ جو غلطی خاندان کی ساری لڑکیاں کرتی تھیں، وہ محمد کو نہیں دہرانی تھی۔ اسے اپنی اہمیت نہیں گنوافی تھی، اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ ذرا دیر کو وہ ہاتھ بک کر مرست سے نظر بچا کر باہر لا دُنج میں گئی، جہاں تمام لڑکیاں اس وقت بیٹھی ہیں وی دیکھ رہی تھیں۔

آرزو اسی چست بس میں ٹائگ پہ ٹائگ رکھے بیٹھی تھی۔ فواد کی بہنیں سدرہ اور مہرین بھی قریب ہی تھیں۔ سدرہ چوبیں برس کی بہت عام شکل کی لڑکی تھی، اسی کی کوپورا کرنے کے لئے خوب سارا میک اپ اور جیولری گھر میں بھی زیب تن کئے رہتی۔ سیاہ بالوں میں گولڈن اسٹریکنگ بھی کروار کھی تھی، پھر بھی زیادہ فرق نہ پڑاتھا۔

تیس سالہ مہرین کا البتہ قد چھوٹا تھا۔ کافی چھوٹا۔ اور بال بے حد گھنگھریا لے۔ وہ سارا سارا دن اپنے بال سیدھے کرنے یا قد لبا کرنے کے نوٹکے آزماتی رہتی۔ نقش اس کے سدرہ کی نسبت بہتر تھے۔

فضہ چھپ کی ندا اور سامیہ میں سے ندا بڑی تھی اور سامیہ چھوٹی مگر سامیہ اپنے بے حد لمبے قد کے باعث بڑی لگتی تھی۔ مہرین اس سے اسی باعث خارکھاتی اور سامیہ بھی ماں کی طرح میٹھی میٹھی باتوں میں سارا دن مہرین کو مزید احساس دلاتی رہتی۔ ندا کی شکل ذرا اچھی تھی، سانوی رنگت پر بڑی بڑی آنکھیں اسے قدرے ممتاز بناتی تھیں اور تمہی آرزو اس کو ناپسند کرتی تھی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ فواد کے لئے اس کے مقابلہ پر سامیہ کمزور جبکہ ندا ایک مضبوط امیدوار تھی۔

فواد کی بہنیں سدرہ اور مہرین تو بی۔ اے کر کے ہی پڑھائی چھوڑ چکی تھیں جبکہ بائیں سالہ سامیہ، تیس سالہ ندا بی۔ اے کرنے کا لمح اور تیس سالہ آرزو ماشرز کے لئے یونورٹی جاتی تھیں۔ آرزو مرمر کر پاس ہونے والوں میں سے تھی اور اس کے یونورٹی پہنچ جانے کی بڑی وجہ آغا جان کی سفارشیں تھیں۔ یہ سفارشیں سدرہ اور مہرین کے وقت بھی کام آ جاتیں اگر جوانیں پڑھنے کا رتی بھر بھی شوق ہوتا۔

”بات سنیں۔“ اس نے بظاہر عجلت میں سب کو مخاطب کیا۔ ”رات کھانے کے لئے سو قلے بنانا ہے، آپ لوگوں میں سے کوئی ہیلپ کرائے گا؟“

”نہیں۔“ آرزو نے روپوٹ سے چینل بدلتے اسے دیکھنا بھی گوارانٹیں کیا۔

ندا اپنے ناخنوں پر سے کیوں کس کھرچ رہی تھی، لمبی سی سامیہ فوراً فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مہرین نے چہرے کے آگے رسالہ کر لیا اور سدرہ بہت انہاک سے اسی وقت نیوی دیکھنے لگی۔

”چلیں، فائن۔“ وہ واپس کچن میں آگئی۔
ڈائنگ ہال میں روز کی طرح کھانا کھایا گیا۔

محمٰل ہمیشہ کی طرح سب سے آخری کری پے موجود تھی، جو آغا جان کی سربراہی کری کی بالکل سیدھے میں تھی۔ مسرت ادھر ادھر چیزیں پکڑاتی پھر رہی تھیں۔

”یٹھا لے آؤ۔“ کھانا ختم ہوا تو مہتاب تائی نے محمٰل کو اشارہ کر کے کہا۔ مسرت ابھی جھوٹے برتن اٹھا کر کچن کی طرف گئی تھیں۔

”یٹھا تو آج نہیں بنائے۔“ وہ بہت اطمینان سے با آواز بلند بولی تو سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

”مگر...“ فواد نے الجھ کر ماں کو دیکھا۔ ”میں نے کہا تھا کہ چاکلیٹ سو فلے بنانا ہے۔“

”می۔ مگر آپ کا چاکلیٹ سو فلے نہیں بنائے۔“

”محمٰل! یہ کیا بد تحریزی ہے؟“ تائی ماں نے گھر کا۔

”بد تحریزی؟..... فواد بھائی! آپ یہ کھانے کی ڈشز گئیں۔ بریانی، مژقہ، اردوی گوشت، آلو، کباب، سلاو، راستہ۔ ذرا گن کر دیکھیں، یہ سب ماں نے اسکیلے بنایا ہے۔ میرے ایگزا مر ہو رہے ہیں، میرے پاس وقت نہیں تھا کہ بناتی۔ اور آپ کی ان بہنوں سے کہاں بھی کہ فواد بھائی کے لئے سو فلے بنانا ہے، ہیلپ کروادو، مگر سب نے انکار کر دیا۔ اب اتنا سب کرنا اور اپر سے یٹھا بنانا ہمارے بس سے باہر تھا۔ سوری، میں کل بن دوں گی یا اگر میری ماں کی تھکن سے بڑھ کر آپ کو اپنا ٹیکسٹ عزیز ہے تو میں انہیں کہہ دیتی ہوں۔ ماں!..... ماں!“ اس نے آواز لگائی اور جہاں لڑکیاں بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں اور مہتاب تائی کچھ سخت سنانے ہی لگی تھیں، وہ کہہ اٹھا۔

”نہیں، نہیں..... اس ادکے۔ میں نے خیال نہیں کیا کہ تمہارے ایگزام ہیں۔ اور می!“ اس نے ماں کو تنبیہی نکاہوں سے دیکھا۔ ”کچن کا کام صرف محمٰل اور مسرت چھی کی ذمہ داری نہیں ہے، ان ساری نوابزادیوں کو بھی کہا کریں، ہاتھ تو بٹا سکتی ہیں یہ۔“

”ہاں تو کرتی تو ہیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ آغا جان نے نیکپن سے ہاتھ صاف کرتے بات ختم کرنا چاہی۔ جوان بیٹا جوان سے اوپر اتھا، اس کی بات کے آگے انہیں اپنی بات کمزور لگ رہی تھی۔ مہتاب تائی پہلو بدل کر رہ گئیں۔ ناعمہ پچھی زیر لب کچھ بڑا ایس۔ اور تو اور فضہ پچھی بھی خاموش سی ہو گئی تھیں۔ لا کیاں الگ شرمندہ۔

وہ اطمینان سے فواد کے اٹھنے سے قبل ہی اٹھ گئی تھی۔ سرت کو برتن اٹھاتے پہلے تو علم بھی نہ ہو سکا کہ کیا ہوا ہے۔ اور جب ہوا تو معافی تلافی کرنے لگیں۔ اندر آ کر محمل کو بھی ڈالنا مگر وہ پروا کے بغیر کتابوں میں سردیے بیٹھی رہی۔ فواد کے اٹھنے کے بعد یقیناً تائی نے بہت سنائی تھیں، مگر فواد کے الفاظ کا اثر زائل نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کی گھر میں ایک مضبوط حیثیت تھی اور پہلی دفعہ کسی مضبوط حیثیت والے نے محمل اور سرت کی طرف داری کی تھی، سو بہت سی خواتین رات کو گودھتے ہوئے سوئی تھیں۔



صحح کان بس کے لئے وہ اشٹاپ پر کھے بیٹھ کی طرف آئی تو ذہن ابھی تک ادھر ہی الْجَمَا تھا۔

بیٹھ پر بیٹھتے ہوئے اس نے سرسری سادی کھا، وہ سیاہ فام لڑکی اسی طرح بیٹھی تھی۔ گود میں رکھی کتاب کے کناروں پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے خاموشی سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

وہ جماں روکتی بیٹھے ہی گئی اور بے دلی سے بس کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے وہی کل والا اجرک کا گرتہ جیز کے اوپر پہن رکھا تھا اور بال اوپنجی پونی میں بندھے تھے۔ سوچ دیں فواد کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ صحح وہ جلدی نکلتی تھی، تب تک وہ نیچے نہیں آیا ہوتا تھا۔ اس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا، جو تھی تو غفران پچا، فضہ چھپی کی آماجگاہ، مگر وہ کنارے والا کمرہ فواد کا پسندیدہ تھا، سو وہ اس کو عرصہ پہلے الٹ کر دیا گیا تھا۔ فضہ چھپی کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا حسن ہی تھے، سو وہ کمرہ ان کی ضرورت سے زائد تھا۔ اور یہ تو محمل کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کمرہ تو اپانے بنوایا ہی اس کے لئے تھا، مگر.....

سیاہ فام لڑکی اسی خاموشی سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ بور ہونے لگی تو ادھر ادھر گردن گھمائی۔ سیاہ کتاب دیکھ کر کل کا واقعہ یاد آیا۔

”یہ کتاب کب ملی تھی آپ کو؟“ بغیر تمہید کے اچانک سوال۔ اس لڑکی نے اطمینان سے گردن اس کی طرف موڑی۔

”دو سال پہلے۔“

”یہ کس نے آپ کے لئے خصوصاً چھوڑی تھی؟“

”ہے کوئی۔“ وہ ذرا سامسکرائی۔ مولیٰ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

”آپ کو اچھا لگتا ہے وہ؟“ اس نے غور سے اس چمک کو دیکھ کر کہا۔

”بہت زیادہ۔“

”آپ اسے کیسے جانتی تھیں؟..... میرا مطلب، یہ تو صدیوں پرانی کتاب ہے۔“

”بس، میں جانتی ہوں۔“

”اور یہ کتاب..... یہ آپ کو آپ کا مااضی، حال اور مستقبل کیسے دکھاتی ہے؟“

”اس میں سب لکھا ہے۔ گزرے واقعات اور وہ جو میرے ساتھ پیش آنے والا ہے اور مجھے ایسے موقع پر کیا کرنا ہے، سب لکھا ہے۔“

محمل کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ سیاہ قام لڑکی اسے بہت عجیب بات بتاری تھی۔
جانے کیسی پڑا سرار، بجید بھری کتاب تھی وہ۔

”آپ کو اس سے کتنا فائدہ ہوتا ہے؟“

”جتنا تمہاری سوچ سے بھی اوپر ہے۔“

”پھر آپ کے تو بہت مرنے ہوں گے۔ آپ اس کو پڑھ کر سب کچھ جان جاتی ہوں گی۔“

”ہاں، مگر اس میں کچھ عمل ہیں، پہلے وہ پر فارم کرنے ہوتے ہیں، پھر ہر چیز دیکھی ہوتی ہے، جیسے اس میں لکھا آتا ہے۔“

”عمل..... عملیات.....؟“ وہ چونکی۔ اندر کوئی الارم سا بجا۔ یہ تو کوئی سفلی علم کی ماہر پیشی تھی، اس سے ذرا احتراز برداشتا چاہئے۔

”ہاں۔“ سیاہ قام لڑکی مسکرائی۔ ”جو وہ عملیات کر لے، وہ اس کتاب کے ذریعے دنیا پر راج کرتا ہے۔ سب لوگ اس کی مٹی میں آ جاتے ہیں اور ہر شے اس کے لئے تغیر ہو جاتی ہے۔ صرف مٹی نہیں، اگر تم بھی اس کتاب کا خاص علم یکھو تو تمہیں اس کے الفاظ میں اپنا مااضی، حال اور مستقل نظر آنے لگے گا۔“

”اور..... اور اس کے بعد؟“ وہ سحر زدہ سی سوال کے جا رہی تھی۔
”اس کے بعد تم اس کتاب کو چھوڑ نہیں سکتیں، تمہیں اپنی زندگی اس سے باندھ کر
بھی گزارنی ہو گی۔“

”اوہ اگر میں اسے چھوڑ دوں تو؟“
”تو تم تباہ ہو جاؤ گی۔ تمہاری ہر چیز، ہر محبت، سب تباہ ہو جائے گا۔ اس کو لے کر تم
چھوڑ نہیں سکتیں۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔“
محل گھبرا کر انٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میری بس.....“ اسی بل بس قریب آتی نظر آئی، وہ
دوڑ کر بس کی طرف جانے لگی۔

”تم ایک دن ضرور آؤ گی میرے پاس۔“ سیاہ قام لوگ کی مسکرائی تھی۔ ”تم ایک دن
ضرور گزر گذا کر یہ کتاب مانگنے آؤ گی۔ میں جانتی ہوں، تم لوگوں کی ستائی ہوئی ہو۔ تمہارا
دل خنی اور ہاتھ خالی ہیں۔ اور جس دن یہ دل پوری طرح ٹوٹ جائے گا، میں تمہیں یہ
کتاب دے دوں گی۔ جاؤ، تمہاری بس آگئی ہے۔“

وہ خوف زدہ سی بس کی طرف لپک گئی۔ آج راؤ پکڑ کر اندر چڑھتے اسے چھپے دیکھنے
کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔



شام کو اس نے بہت محنت سے چاکلیٹ سو قلے بنا یا۔ اور جب وہ خوب شنڈا ہو گیا
تو ٹرے میں سجا کر اوپر سیرھیاں چڑھنے لگی۔ ابھی دوسری سیر گی پہنچی کہ آرزو یخچے
آتی دکھاتی رہی۔

”یہ کس کے لئے ہے؟“ وہ مانچے پہ مل ڈالے لیے بھر کو رکی۔ ”فادی کے لئے
ہے؟“

”مجی۔ انہوں نے کل کہا تو تھا، میرے پاس ٹائم کہاں تھا۔ آج بھی کسی کو یاد نہ آیا تو
ہاتھی دیا۔“ اس نے بے نیازی سے شانے جھکلے۔ وہ دوسری سیر گی پڑے انھائے کھڑی
مشترک تھی کہ آرزو یخچے اترے اور وہ اوپر جاسکے۔

”اوہ ذر کی تیاری کر لی تم نے؟“ آرزو یخچے سے اتر کر اس کے بالکل سامنے آ

کھڑی ہوئی۔

”اماں بنارہی ہیں۔“

”قورمہ بنالیا ہے؟ می نے کہا بھی تھا۔ تم نے چیک کیا؟“

”آپ سید ہے سید ہے کہہ دیں کہ میں چلی جاؤں اور آپ یہڑے فواد بھائی کو دے کر اپنے نمبر بنالیں تو لیں، پکڑیں۔“ اس نے ٹھرے زور سے اسے تھماں۔ ”مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔“ وہ کھٹ کھٹ سیرھیاں اتر کر کچن کی طرف چلی گئی۔
”بد تیز۔“ وہ بڑ بڑائی۔

مگر محمل کو معلوم تھا کہ اس کی بلند آواز فواد سن چکا ہو گا اور اب آرزو جو چاہے کر لے، وہ جانتا تھا کہ کام کس نے کیا تھا اور نمبر کون بنانا چاہ رہا تھا۔
اور پھر یہی ہوا۔

رات کھانے پر جب سرت نے چاکلیٹ سو-فلمے لا کر رکھا تو فواد نے سب سے پہلے ڈالا۔

”یہ تم نے بنایا ہے محمل؟“

”جی۔“ وہ سادگی سے بولی۔

آرزو نے تاکواری سے پہلو بدلا۔

”بہت نیسٹی ہے، تم ہی روز بیٹھا کیوں نہیں بنا تھیں؟“

”اتنی فارغ نہیں ہوں میں، سو کام ہوتے ہیں مجھے۔ ایگزام ہو رہے ہیں میرے۔
دل کرے گا تو بنا دیا کروں گی، ورنہ سب جانتے ہیں، محمل سے یہ جی حضور یاں نہیں
ہوتیں۔ اماں! ایک پھلکا مجھے اٹھا دیں۔“ وہ معروف سی اماں کے ہاتھ سے پھلکا لینے لگی،
جیسے اسے فواد کے تاثرات کی پرواہی نہ ہو۔

وہ تائید اسراہلا کر سو فلمے کھانے لگا مگر پار بار نگاہ بھٹک کر اس کے موی چہرے پر جا
لکھتی تھیں، جو بہت مگن سی ابھی تک کھانا ہی کھا رہی تھی۔ سو فلمے کو اس نے ہاتھ بھی نہیں
لگایا تھا۔

وہ بچن میں کھڑی سنک کے سامنے دوپہر کے جھوٹے برتن دھو رہی تھی، جب سامنے بڑی سی کھڑکی کے پار آسمان پر سرمی باول اکٹھے ہونے لگے۔ وہ ابھی تک اس فتح پلیٹوں پر مارتے ہوئے اس سیاہ فام لڑکی کے متعلق سوچے جا رہی تھی، جس سے وہ گزشتہ کچھ دنوں سے احتراز برداشت رہی تھی۔ عین بس کے نائم پر اشاض جاتی اور بیٹھنے پر بیٹھنے کے بجائے ذرا فاصلے پر کھڑی ہو جاتی۔ نہ تو دانستہ اس لڑکی کو دیکھتی اور نہ ہی قریب جاتی۔ معلوم نہیں کیوں اسے اس سے اور اس کی سیاہ جلد والی کتاب سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

باول ذرا اگر بجے تو وہ چونکی۔ نیلگوں شہری شام پر ذرا سی دیر میں چھایا ہو گئی تھی بجلی چمکی اور یکا یک موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

محمول نے جلدی جلدی آخری برتن دھو کر یک میں سجائے، ہاتھ دھوئے اور باہر لان کی طرف بھاگی۔ بارش دیکھ کر اس کا دل یونہی پھل جایا کرتا تھا۔

”محمول! جاؤ مسرت سے کبو، بلکہ.....“ تائی مہتاب جو برآمدے میں کرسی پر بیٹھی لڑکیوں سے گپ شپ میں مصروف تھیں، اسے آتے دیکھ کر حکم صادر کرتے کرتے رکیں۔ اس کے چہرے پر بارش میں کھیلنے کا شوق رقم تھا۔ تائی نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر حکم میں ترمیم کر دی۔ ”بلکہ جاؤ، پکوڑے بننا کر لاؤ۔ ساتھ میں دھنیے کی چنی بھی ہو۔ اور معاذ، معیز کے لئے آلو کے چسپ فرائی کر لو۔“

اس کے چہرے پر پھیلا اشتیاق پھیکا پڑ گیا۔ اس نے قدرتے بے بس سے ان کو دیکھا۔

”مگر تائی! ابھی کیسے؟ وہ بارش..... بعد میں کر دوں گی۔“ وہ مننا کی۔

”ہاں تو بارش کے لئے ہی تو کہہ رہی ہوں۔ جاؤ شاباش! جلدی کرو۔ اور ندا! یہ سوت پھر تمہیں کتنے کا پڑا تھا؟“ وہ ندا کے دوپٹے کو الگیوں میں مسل کرستائی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”صرف ڈیڑھ ہزار کا تائی! میں کل ہی آپ کو بھی لے چلتی ہوں۔ وہاں بہت اچھے پرش آئے ہوئے تھے۔ آپ کا ملکیکش تو ویسے بھی بہت فیور ہے، آپ پر تو ہر رنگ ہی

کھل جاتا ہے۔“

وہ آپس میں صرف ہو گئی تھیں۔

محمل پر پختی امداد آئی۔ آلو چھیل کر کائے، بیس گھول کر رکھا تو تب تائی مہتاب نے آواز لگائی۔

”مکس پکوڑے بنانا، فواد کو پیازوں والے پکوڑے بہت پسند ہیں۔“

”بھاؤ میں گئی اس کی پسند۔“ اس نے زور سے چھری سلیپ پہنچی۔ آلو قلوں میں کائے تھے۔ اب پھر سے ان کو چھوٹا کرنا پڑے گا۔ مر چیں، پیاز بھی کائے پڑیں گے۔ شدت بے بی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ آج اماں بیمار تھیں، صح سے بخار تھا، سو اگر وہ نہ کرتی تو صرت کو بیماری میں اٹھ کر کرنا پڑتا۔ وہ ناں بھی نہ کر سکتی تھی۔

پیاز کا شتہ ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو نکلتے گالوں پر پھسل رہے تھے۔ تب ہی فواد، ماں کو پکارتا کھن کے کھلے دروازے پر ٹھنک کر رکا۔

کھلی جیز پر لمبا گرتہ اور گردن کے گرد مفلک کی طرح دوپٹہ لپیٹی، بھوری اوپنجی ٹیل باندھے وہ سر جھکائے کھڑی کنگ بورڈ پر ٹھنک ٹھنک پیاز کاٹ رہی تھی۔ آنسو گالوں پر چمک رہے تھے۔

”محمل!“ وہ بے چین ساقریب چلا آیا۔ ”کیا ہوا، تم روکیوں رہی ہو؟“

”میری مرضی۔ آپ لوگوں کو کیا؟ آپ لوگوں کو تو اپنے کھانوں سے غرض ہوتی ہے۔“ فواد کے دل میں جگہ بنانے کے سارے ارادے بھلا کر دہڑخ کر بولی۔

”پھر بھی، کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”یہاں کہتا کوئی نہیں ہے، سب حکم صادر کرتے ہیں۔“ اس نے چھری والے ہاتھ کی پشت سے گال صاف کیا۔ ”اور مجھ سے ابھی کوئی بات نہ کریں، میں بہت غصے میں ہوں۔ یا تو چھری مار دوں گی، یا پکوڑوں میں زہر ملا دوں گی۔“

”اچھا!“ وہ پتہ نہیں کیوں نہ دیا تھا۔

وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کیوں نہیں؟“

”کچھ نہیں۔ خیر، بناؤ پکوڑے۔ اور مکس والے بنانا۔“ وہ اپنی پسند بتا کر لے بے لے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

اس کے آنسو پھر سے بننے لگے۔ جانے کس بھول پن میں وہ یہ سوچ بیٹھی تھی کہ اگر وہ اس کی مٹھی میں آگیا تو.... اس نے نفی میں سر جھکا۔ وہ سب ایک جیسے تھے۔ بے جس، خود غرض، مطلی۔

اور جب تک پکوڑے بنے، بارش ہلکی ہو چکی تھی۔ وہ سب لڑکے لڑکیاں برآمدے میں بیٹھے دو منٹ میں ہی پکوڑے چٹ کر گئے تھے اور اب حسن سب کو لاگ ڈرائیور پر لے جانے کا پلان بنارہا تھا۔

”تم لوگ بھی کیا یاد کرو گے، کس سخن سے پالا ڈیا تھا۔“ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا فرضی کا لرجھاڑ کر کہہ رہا تھا۔

حسن، فضہ چینی کا بینا اور ندا، سامیہ کا بھائی تھا۔ شکل میں ندا سے مشابہ تھا، بڑی بڑی پرکشش آنکھیں اور سانوںی رنگت۔ البتہ عادتوں میں وہ قدرے مختلف تھا۔ اس نے فضہ کی میٹھی زبان تو مستعاری تھی، مگر کڑوا دل نہیں لیا تھا وہ گھر کا واحد فرد تھا، جو دل کا بھی اچھا تھا۔ زم کو صاف دل اور بینڈسم۔

ابھی ابھی وہ آفس سے آیا تھا اور کوٹ کری کے پیچھے نکائے آستینیں فولڈ کئے بیٹھا وہ تھکن کے باوجود سب کو آؤٹنگ پر لے کر جانے کی دعوت دے رہا تھا۔

”کون کون چلے گا؟“ سامیہ بلند آواز میں پوچھنے لگی تو محمل بھی دل میں محلت خواہش کے باعث قریب آگئی۔

”میں بھی چلوں گی۔“

سب نے رُک کر اسے دیکھا تھا۔

کندھے پر پس لٹکائے، بالوں کو ایک اشائل سے بینڈ میں جکڑتی آرزو نے، جو اندر سے باہر آ رہی تھی، قدرے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ”ان کو بھی یہ شوق ستانے لگے ہیں۔“ اور پھر سب ہی ساتھ ساتھ بولنے لگے۔

”تمہاری جگہ نہیں بنے گی۔“

”ہم پاپا کی ہائی ایس لے کر جا رہے ہیں، سب کی سیلیں پوری ہیں۔“

”تم باہر جا کر کیا کرو گی؟“ سدرہ تمسخرانہ تھی۔ مہتاب تائی کی فونٹو کاپی۔ ”بیٹا جان! آپ کے تو ایکزام ہور ہے ہیں۔“ فضہ چھی بہت فکرمندی اور پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ”خوب دل لگا کر پڑھو۔ آپ نے بہت اچھے مارکس لینے ہیں۔ جاؤ شاباش! کورس کم از کم دو دفعہ ضرور یواائز کرنا، ابھی شروع کرو گی تو رات تک پورا ہو گا۔“

تائی مہتاب نے فضہ چھی کی بات ختم ہونے کا انتظار کیا اور پھر تیزی سے بولیں۔

”تاں تم نے باہر کیا کرنا ہے؟ رات کا کھانا کون بنائے گا؟ ماں الگ ڈرامے کر کے بستر پر پڑی ہے، کوئی پوچھنے والا ہے ان کو؟ بس مفت کی روٹیاں توڑے جاتے ہیں۔“

فواڈ نے لمحے بھر کو کچھ کہنا چاہا، پھر خاموش رہا اور حسن جو خاموشی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا، بالآخر کہہ اٹھا۔

”کوئی محل سے بھی تو پوچھئے کہ وہ کیا چاہتی ہے؟“

”ہاں، اب ہم اس سے پوچھتے رہیں۔“ تائی بگڑ کر بولیں۔ حسن لمحے بھر کو بالکل چپ ہو گیا۔ مگر فضہ نے بیٹی کے جھاڑے جانے پر واضح برآما۔

”جاو، تم اندر جاؤ۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکیں۔ تائی مہتاب سے مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔

وہ پیر پختی بھاگ کر کچن میں آئی اور سنک پر جھکائے پھر وہ کھوت کر رونے لگی۔

کافی دیر بعد روتے روتے سراہیا تو کھڑکی کے پار ڈرائیورے پہ باہر نکلتی ہائی ایس دکھائی دی۔ اس میں ایک دلوگوں کی جگہ تو واضح طور پر بن جانی تھی۔

بے اختیار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ رات کے کھانے میں ذہر ملا دے۔ اور کاش وہ ایسا کر سکتی۔

انھی تو سر بھاری سا ہو رہا تھا۔ بمشکل ہی ایک نوکھا توں اور چائے کی آدمی پیاں طلق سے اتاری اور باہر نکل آئی۔

اسٹاپ پر معمول کی خندی صبح اتری تھی۔ بیخ پر وہ سیاہ فام لڑکی دیے ہی بیٹھی خاموشی سے سیدھے میں دیکھ رہی تھی۔ گود میں سیاہ جلد والی کتاب رکھی تھی اور اس کے سیاہ ہاتھ کتاب کے کناروں پر مضبوطی سے جمعے تھے۔

آج وہ قدرے تھیں تھکی اور پژمردہ تھی، سو جا کر بیخ پر بیٹھنے لگی۔ دس منٹ ہی کاٹھے تھے تو اتنا کیا احتراز بر تنا۔ سیاہ فام لڑکی نے ذرا سی گردن اس کی جانب موڑ لی۔

”رات کو ٹھیک سے سوئی نہیں؟“

”بس ایسے ہی۔“ وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔

سامنے سڑک خالی تھی۔ دوسری طرف اکاڑ کا لوگ بس کے منتظر ہیں رہے تھے۔

”لوگوں کی ستائی ہوئی ہو؟“

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟“ محتاط انداز میں پوچھا۔

”تمہارے چہرے پر لکھا ہے، تمہارا دل غمگین اور روح بوجھل ہے۔ تم تکلیف میں ہوا اور لوگوں کی باتیں تم سے برداشت نہیں ہوتیں۔ ہے نا؟“

”معلوم نہیں۔“ اس نے بظاہر لاپرواٹ سے شانے اچھائے۔ البتہ اندر دل زور سے دھڑکا تھا۔

”اور تم مستقبل کے بارے میں خوف زده اور ماضی کے بارے میں غمگین ہو شاید۔“

”شاید۔“ اب کے وہ واضح چونکی تھی۔ بے اختیار ہی لبوں سے پھسلا تھا۔

”تم اپنا مستقبل اور اپنی تمام پریشانیوں کا حل جاننا چاہتی ہو۔ کچھ ایسا ہو جس سے یہ تمہیں تنگ کرنے والے لوگ تمہارے آگے پیچھے پھر نے لگیں، تمہارا محبوب تمہارے قدموں میں آگرے، مال و دولت تم پر نچاہو رہ جائے، تم سب کو اپنی مشنی میں کر کے دنیا پر راج کرو، کیا تم یہی نہیں چاہتیں؟“

”ہاں۔“ محمل نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کا دل موم کی طرح پکھل رہا تھا۔

وہ سیاہ قام لڑکی اس کی ہر ذکھتی رگ کو اپنے ہاتھ میں لے رہی تھی۔ ”میں بھی چاہتی ہوں۔“

”اور اگر میں تمہیں کچھ ایسا دے دوں تو؟“

”کیا یہ... یہ کتاب؟“ اس نے جھوکتے ہوئے پوچھا۔ اسے لگ رہا تھا، وہ زیادہ دری تک resist نہ کر پائے گی۔

”ہاں، اگر تم یہ کرو گی تو سب کچھ تمہاری مشی میں آجائے گا۔ سب کچھ۔“ محل متذبذب کی لب کھلنے لگی۔ اس لڑکی کی باتیں بہت پُر فریب، بہت پُر کشش تھیں۔ اسے لگا، وہ جلد ہی پھسل پڑے گی، بہک جائے گی۔

”کیا یہ سب اتنا آسان ہے؟“

”شاید نہیں۔ تمہیں اس کتاب کے عمل کرنے میں بہت مشقت لگے گی، مگر ایک دفعہ سیکھ جاؤ گی تو سب آسان ہو جائے گا۔ زندگی سہل ہو جائے گی۔ اور پھر جن کے لئے تم روتنی ہو، وہ تمہارے لئے روئیں گے۔ وہ تمہارے پیچھے آئیں گے۔“

بس کا تیز ہارن اسے ماہول میں واپس لایا۔ وہ چونکی اور بیگ کا اسٹریپ کندھے پر ڈالے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دس منٹ ختم ہو چکے تھے۔

”میری بس.....“

”جاو۔“ سیاہ قام لڑکی مسکرا دی۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی بس کی جانب بڑھ گئی۔ دل ابھی تک زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔

”محبوب قدموں میں، لوگ مشی میں، دولت نچاہو، اور دنیا پر راج.....“

”کیا یہ سب ممکن تھا.....؟“ وہ اس کے کہے گئے الفاظ پر سارا راستہ غور کرتی رہی تھی۔

لیکن پھر بار بار خود کو جھڑک دیتی۔

یہ کالے علم، سفلی علم، جادو ٹوٹنے، چلے دغیرہ برے کام تھے، اسے ان میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اسے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہئے۔

کانج کے دروازے پر اترتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ اس سیاہ

فام لڑکی کے قریب بھی نہیں جائے گی۔ بیٹخ پہ بیٹھے گی، نہ ہی اس سے بات کرے گی۔ اسے ذرخا کہ اگر ایک دفعہ پھر اس نے اس کی آفرن لی تو شاید وہ اسے قبول کر کے کسی ایسے گم نام راستے پہ نکل پڑے گی، جہاں سے واپسی کا سفر ناممکن ہو۔

● ● ●

اُس روز سدرہ کے رشتے کے سلسلے میں کچھ لوگ آ رہے تھے۔ یہ خبر مسرت نے اسے تب دی، جب وہ گھر بھر کی صفائیاں اور لڑکیوں کی پھرتیاں دیکھ کر حیران سی ماں کی طرف آئی تھی، ورنہ پہلے تو جب بھی سہ پہر میں لاونچ کا دروازہ آہستہ سے کھول کر آتی تو گھر میں سناٹا اور ویرانی چھائی ہوتی تھی اور آج.....

لبی سی سامیہ بانس کے جھاؤ سے چھت کے جالے صاف کر رہی تھی۔ سدرہ ڈرائیکٹر روم کی ڈیکوریشن کو از سرنو ترتیب دے رہی تھی۔ نہ، ماں کے سر پہ کھڑی لان کی صفائی سترہائی میں مشغول تھی تو مہرین، مہتاب تائی سے سر ہلاتے کوئی ہدایت سن رہی تھی۔ ایک آرزو ہی تھی، جو ٹیکس میں ٹائگ پہ ٹائگ رکھے بیٹھی، کانوں پہ واک میں لگائے، کسی میگزین کے درق الٹ رہی تھی۔ بے پروا، بے نیاز اور مغدر۔ شکر کہ وہ خوب صورت نہ تھی، ورنہ شاید وہ آسمان سے نیچے نہ اترتی۔

”رشتہ سدرہ کا ہے اور یہ خود غرض خاندان سارے کا سارا الگا ہوا ہے، مطلب؟“
”اوہ..... آہستہ بولو۔“ مسرت نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، پھر آہستہ سے بتانے لگیں۔ ”درachi bhabai بیگم کا محض اندازہ ہے کہ رشتہ سدرہ کا ہی ہو گا۔ نعمان بھائی کی بیگم نے خصوصاً کسی کا نام نہیں لیا، سو فضیہ کو شاید کچھ امید ہو۔“

”نعمان بھائی کی بیگم کون؟“

”تمہارے ابا کی دُور کی رشتہ دار ہیں۔ ان کا بیٹا فرقان ایرونائیکل انجینئر ہے۔ بہت اچھا گھرانہ ہے۔ اور ایک بیٹی ہے، شادی شدہ۔ آسٹریلیا میں رہتی ہے۔ بیگم نعمان نے کسی کے ذریعے کہلوایا ہے۔“

”اور یہ ساری لڑکیاں اس امید پہنچی ہوئی ہیں کہ شاید وہ ان کا رشتہ ماگنگ لیں۔“
”واث ربش۔“ وہ تمسخرانہ نہس کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شام میں سرت نے اسے پکن میں مدد کے لئے بلوایا تھا۔

”اچار گوشت، بریانی، سخ کباب، فرائیڈ پھلی اور کتنا کچھ کریں گی آپ؟“ وہ برسنوں کے ذہنکے انھا انھا کر جھانکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”یہ سب تو تیار ہے۔ تم میٹھے میں دو چیزیں، اور رشین سلااد بنادو۔ اور چائے کے ساتھ اسنیکس بھی۔“

”چائے بھی اور کھانا بھی؟“ وہ کمرپ پا تھر رکھے حیرت سے بولی۔ ”اتنا کچھ کس لئے؟ کیا اتنارشتون کا کال تھا، سدرہ بائی کے لئے؟“

”اوہ نہ، آہستہ بولو۔“

”میں کسی سے ڈرتی تھوڑی ہوں؟ ابھی جا کر منہ پر بھی کہہ سکتی ہوں۔“

”اور تمہارے اس کہنے پر باقی تو مجھے سننی پڑتی ہیں محمل؟“ وہ تھکن سے آزروہ سی بولیں تو وہ خاموش سی ہو گئی، پھر دوپٹہ کی گردہ کس کر کام میں بخت گئی۔

چائے کی ٹرالی اس نے بہت اہتمام اور محنت سے بجائی تھی۔ اس وقت بھی وہ بیجوں کے بل بیٹھی ٹرالی کے نچلے حصے میں پلیٹیں سیٹ کر رہی تھی، جب مہتاب تائی کچھ کہتی ہوئی پکن میں داخل ہوئیں۔ سدرہ ان کے پیچھے تھی۔

”سب تیار ہے؟“

”جی.....“ اس نے بیٹھے بیٹھے گردن اٹھائی۔ مہتاب تائی قدرے عجلت میں نظر آ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے سدرہ! تم یہ لے جاؤ۔ اور مٹھائی کدھر ہے؟ میرا خیال ہے، چائے کے بعد ہی بات پکی کر دیتے ہیں، مٹھائی تک سیٹ کر لینا۔“

”وہ تورستہ مانگنے آئی ہیں تائی! بات اتنی جلدی پکی کر دیں گی؟“ وہ حیران سی ہاتھ جھاڑتی کھڑی ہوئی اور تائی بھی کسی اور موڑ میں تھیں، سو بتانے لگیں۔

”ہاں، تو اب مزید کیا انتظار؟ لڑکا اتنا اچھا اور خوش شکل ہے، پھر ہمارے پاس کوئی کمی تھوڑی ہے؟ منگنی آرام سے مہینے دو مہینے تک کریں گے۔ اور شادی سال ڈیڑھ تک۔ ایسی دھوم دھام سے شادی کروں گی سدرہ کی کہ زمانہ دیکھے گا۔“ ان تکے انداز

سے سمجھ کی نو آتی تھی۔

ایک لمحے کو محمل کا دل چاہا، نفیسی وہ خاتون جو ڈرائیک روم میں بیٹھی ہیں، وہ سدرہ کو ناپسند کر کے چلی جائیں اور تائی صدے سے بیمار ہی پڑ جائیں۔ آخر خود پر غاصب لوگ کے اچھے لگتے ہیں؟ مگر شاید ادھر تو سارے پلان بن چکے تھے۔

سدرہ نازک بیل کی بیک کرتی ٹرالی و حکیمتی لے گئی اور وہ خالی پکن میں خاموشی سے کری پر بیٹھ گئی۔ مسرت بھی مہمانوں کے پاس تھیں، جانے کیسے تائی کو ان کے فرد ہونے کا خیال آیا تھا اور ان کو وہیں بٹھا لیا تھا۔

”ٹشو..... محمل! ٹشو۔“ ناعمرہ چینی نے زور کی آواز لگائی تو وہ تیزی سے اٹھی۔

”ٹشو رکھنا بھول گئی تھی؟..... اف!“ وہ ٹشو کا ذبہ اٹھا کر بھاگی۔ بس لاڈنخ میں لمحہ بھر کر کر بڑے آئینے میں خود کو دیکھا۔

اوپھی پونی ٹیل، سیاہ جیز پہ لمبا سفید گرتہ اور گرن کے گرد مخصوص انداز میں لپٹا ایک تائی اینڈ ڈائی دوپٹہ، جسے وہ بہت سے جوڑوں کے ساتھ چلاتی تھی۔ یہ غالباً پچھلی سے پچھلی بقراعید پہ بنوایا گیا جوڑا تھا، جواب تک خاصاً گھس چکا تھا۔

”خیر، کون سا میرے رشتے کے لئے آئے ہیں؟“ وہ شانے اچکا کر ڈرائیک روم کی جانب بڑھ گئی۔

نفیس اور باوقاری بیگم نعمان بڑے صوف پر تکلف سے بیٹھیں مسکراتے ہوئے تائی مہتاب کی بات سن رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر قدرے خوش دلی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”محمل بیٹا! آپ اب آئی ہو؟ کب سے پوچھ رہی تھی، تمہاری تائی سے۔“ وہ ایک دم گڑ بڑا سی گئی، لیکن سنبھل کر، آگے بڑھ کر ملی۔

”السلام علیکم!“

”علیکم السلام۔ اتنی دیر سے پوچھ رہی تھی تمہارا۔“

”وہ میں.....“

”ہاں، آئی نو بیٹا! تم اس اہتمام میں لگی ہوئی ہو گی۔ مجھے یاد ہے، جب میں کریم

بھائی کی عیادت کے لئے آئی تھی تو اس اکیلی بھی نے سارا کھانا بنایا تھا۔“ وہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر پیار سے دیکھتے، دو برس پرانی بات کر رہی تھیں۔

وہ گھبرا کر کبھی تائی کے تنے نقوش کو دیکھتی تو کبھی سدرہ کی متغیر ہوتی رنگت کو۔ وہ تو بس نشود ہے آئی تھی، پھر اتنا استقبال چہ معنی دارد۔

”آپ یہ ڈرم اسکس لیں نا بھالی! یہ.....“ تائی نے ان کی توجہ بٹانا چاہی۔

”ارے، یہ تو میری فورٹ ہے۔ محمل؟ تم نے بنائی ہیں نا؟ مجھے یاد ہے، تم نے اس دفعہ بھی کھانے میں یہ بنائی تھیں اور فری (بیٹی) آسیشلی تم سے رُپسی پوچھ کر گئی تھی۔“ اور اسے مجھے میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ بے بسی و بے چارگی سے وہ بمشکل سر ہلا پا رہی تھی۔ اوھر تائی مہتاب اب پریشان ہو رہی تھیں۔ یہی تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا تھا۔ سدرہ کے رشتے کے لئے آنے والی ہر مہماں کو وہ محمل اور سرت کی بنائی گئی چیزیں یہ میری سدرہ نے بنائی ہیں“ کہہ کر پیش کرتی تھیں، مگر جانے کب وہ خاتون ان کے گھر کی ساری سن گن لے گئی تھیں۔

”بس بھالی! بچیاں ماشاء اللہ سب ہی سکھڑ ہیں ہمارے گھر میں۔“ فصلہ چھپی نے بظاہر مسکرا کر بات سن جاتی مگر قدرے بے چین وہ بھی تھیں۔ کہیں کچھ بہت غلط تھا۔ ”جی، مگر یہ سب تو سدرہ نے بنایا ہے۔ بے چاری صبح سے گئی ہوئی تھی۔“ سرت نے جلدی سے کہا۔

”جی، جی۔“ تائی مہتاب نے فوراً نائید کی۔

”ویری گذ سدرہ؟“ بیگم نہمان اب باکس پیٹر لے رہی تھیں۔ ”یہ باکس پیٹر تو بہت اچھی بنائی ہے، سدرہ! اس کی فلنگ میں کیا کیا ڈالا ہے؟“ اور سدرہ کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ باکس پیٹر میں ڈلتا کیا کیا ہے۔ وہ ایک دم کنفیوزی ہو کر ماں کی ٹھکل دیکھنے لگی۔

”دراصل میں کوئنگ کا بہت شوق رکھتی ہوں اور میرے بچوں کا ٹھیٹ بھی بہت اعلیٰ ہے۔ نہمان صاحب خود منفرد اور اچھے کھانوں کے رسیا ہیں، اس لئے ہمیشہ کہتے ہیں کہ بہو ڈھونڈتا تو اس کے ہاتھ کا ذائقہ چکھ کر ہی رشتہ مانگنا۔ دیسے تو آپ کی ساری

بچیاں ہی ماشاء اللہ بہت خوب صورت اور سلیقہ مند ہیں، مگر محمل تو مجھے خاص طور پر عزیز ہے۔ سعیدہ آپا نے ذکر تو کیا ہو گا کہ میں کسی خاص مقصد کے لئے آ رہی ہوں تو اب لمبی چوڑی کیا تمہیر باندھوں؟ مہتاب آپا! فرقان تو آپ کا دیکھا بھالا ہے۔ اللہ کا شکر ہے، اس نے ہر طرح سے نوازا ہے ہمیں۔ بس محمل کے لئے میں آپ لوگوں کے پاس سوال کرنے آئی ہوں۔ اگر ہو سکے تو اسے میری بیٹی بنادیں۔“

اور مہتاب تائی سے مزید سننا دشوار ہو رہا تھا۔

”محمل! تم اندر جاؤ۔“ انہوں نے خود کو بمشکل نارمل رکھتے ہوئے اشارہ کیا تو وہ جو حق دقیقی سر رہی تھی، تیزی سے باہر نکل گئی۔

چیچھے کیا باتیں ہوئیں، کس نے کیا کہا، کب ان خاتون کو کھانا کھلانے بغیر رخصت کر دیا گیا اور تائی کے بند کمرے میں سارے بڑوں کی کیا گفتگو ہوئی، وہ ہرشے سے دور اپنے کمرے میں کان لپیٹنے پڑی رہی۔

اس کا دل کچھ بھی کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی، جیسے بند غار میں روشنی اور ہوا کا کوئی روزن کھل گیا ہو۔ بے کیف اور روکھی پھیکی زندگی میں ایک دم ہی بہت خوشگوار اور سربراہ موز آیا تھا۔ امیدیں پھر سے زندہ ہو گئی تھیں اور اسے لگ، رہا تھا کہ ایک تی زندگی بانیں پھیلانے اس کے استقبال میں کھڑی ہے۔

”ایروناشکل انجینئر، خوش شکل فرقان، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، اچھے کھانوں کا شوقیں۔“ اس کے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے تھے۔



”انہوں نے سدرہ کی جگہ میرا رشتہ مانگا۔ کیس نئے بلیو اٹ؟..... میں تو اتنی شاکذ ہو گئی ہوں۔ اوہ گاؤ! بٹ اتنا اچھا پروپوزل ہے، وہ آٹی لوگ اور سویٹ تھیں کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اور پتہ ہے، ان کا بیٹا ایرونا شکل انجینئر ہے اور..... تم میری بات سن رہی ہو یا نہیں؟“ اس نے فائل میں صفحہ ترتیب سے لگاتی نادیہ کا کندھا بلایا تو وہ۔

”ہاں، ہاں بتاؤ نا، پھر کیا ہوا؟“ کہہ کر پھر سے صخوں کی ترتیب صحیح کرنے لگی۔

”ہونا کیا تھا، تائی اماں کی تو شکل دیکھنے والی ہو گئی تھی۔“

”اچھا!“ نادیہ اب انگلش کی کتاب کے ورق الٹاتی کچھ تلاش کر رہی تھی۔ وہ دونوں کالج کے برآمدے کی سیر ہیوں پر بیٹھی تھیں، محمل اسے کل کی ساری رواداد سناری تھی۔

”تائی نے مجھے فوراً وہاں سے بیچ دیا۔ بے چاری ہر چیز سدرہ کی بنا کی کہہ کر پیش کر رہی تھیں مگر وہ آٹی بھی بہت تیز تھیں، ایسے پرانے اڑائے کہ تائی کئی دن تک یاد..... تم میری بات نہیں سن رہی نادیہ!“ اس نے خفاہی ہو کر منہ موڑ لیا۔

”نہیں، نہیں۔ سن رہی ہوں نا۔“ نادیہ نے بوکھلا کر فائل ایک طرف سیر ہی پر رکھی،

مگر وہ منہ موڑے بیٹھی رہی۔

”اچھا بتاؤ نا، تو وہ صاحب میکدیکل انجینئر ہیں۔“

”میں دو گھنٹے سے بک بک کر تھک گئی ہوں کہ وہ ایرونا شکل انجینئر ہے، تم اگر سن

لیتھن تو یہ سوال نہ کرتی۔ تم اپنی فائل جوڑو، میں جا رہی ہوں۔“ وہ بیگ اٹھا کر کھڑی ہوئی تو نادیہ بھی ساتھ ہی اٹھی۔

”ارے، ناراض تو نہ ہو۔“ ”نہیں یار! سیر یسلی ناراض نہیں ہوں۔ مجھے یاد آیا، مجھے ابھی میڈم مصباح سے ملنا تھا ایک کام کے لئے۔ میں ذرا تھوڑی دری تک آتی ہوں۔“ محمل نے بظاہر مسکرا کر کھا اور مڑ کر چل دی۔ جب وہ تیز تیز سر جھکائے جلتی تھی تو اوپنی پونی ٹیل ساتھ ہی ادھر ادھر جھولتی بہت اچھی لگتی تھی۔

چند قدم دور اس نے ذرا سا مڑ کر دیکھا، نادیہ بہت آرام اور انہاک سے بیٹھی اپنی فائل میں کچھ لکھ رہی تھی۔ وہ تاسف سے واپس آگے کو چلنے لگی۔ کتنی جلدی نادیہ، اُس کی سوکالڈ بیسٹ فریڈ نے، اس کی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہے گئے آخری جملے پر یقین کر لیا تھا، جیسے وہ واقعی ناراض نہیں ہے، حالانکہ وہ تھی۔ گھر میں اماں تھیں تو کالج میں نادیہ، جن سے وہ دل کی بات شیر کر لیتی تھی۔ مگر دونوں بے تو جہی سے سنتی تھیں، کبھی کام میں مصروف ”ہوں ہاں“ کہہ دیا تو کبھی تو سننا ہی نہیں۔

”اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ سامنے والے برآمدے کے ایک تنہاستون سے لیک لگا کر بیٹھ گئی اور اداسی سے سامنے لان کے بزرے کو دیکھا۔

سنہری اور چمکیلی صبح ہر سو بکھری تھی۔ گھاس پر ٹولیوں کی صورت میں سفید یونیفارم میں ملبوس لوکیاں بیٹھی تھیں۔ کوئی کھانے پینے میں تو کوئی سپ شپ میں مصروف تھی۔ سب کی اپنی اپنی دنیا تھی اور وہ ان میں مگن تھیں۔

”کیا یہی زندگی ہوتی ہے یا کیا اس کی زندگی کی سی مشکل زندگی کسی اور کی نہ تھی؟، اس نے آزروگی سے سوچا تھا۔

”کیا مجھے کبھی وہ خوشیاں نہیں ملیں گی جو میں چاہتی ہوں؟ بڑا سا گھر، بے تھاشا دولت، طاقت، اثر و رسوخ، محبت کرنے والا لاکنف پارٹنر..... کیا یہ سب میرے قدموں میں ایک ساتھ ڈھیر ہو سکتا ہے؟، اس نے ستون سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔ بند پکلوں پر سنہرے خواب اترنے لگئے تھے۔

”وہ ایر و نائیک انجینئر یا فواد..... میں ان میں سے کسی کی بھی بیوی بن جاؤں تو سب

چکھ میرا ہو سکتا ہے..... سب چکھ میرے قدموں میں ڈھیر ہو سکتا ہے۔ بلند..... ہر چیز کی بلندی.....

”جو وہ عملیات کر لیتا ہے، وہ دنیا پر راج کرتا ہے۔“

”چکھ ایسا ہو کہ تمہیں شک کرنے والے لوگ تمہارے آگے پیچھے پھر نے لگیں، مال و دولت تم پر نچادر ہو، تمہارا محبوب تمہارے قدموں میں آگئے۔“

”اور اگر میں ایسا چکھ تمہیں دے دوں تو.....؟“

اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ ایک دم سے ہی وہ ساری باتیں اور اس سیاہ فام لڑکی کی سیاہ چمکیلی آنکھیں اسے یاد آئی تھیں۔

”تم سب کو اپنی مشنی میں کر کے دنیا پر راج کرو۔ کیا تم بھی نہیں چاہتیں؟“

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ یوں لگتا تھا، وہ لڑکی اپنی بجید بھری آواز میں اس کے پاس سے ہی بول رہی ہے۔

”پتہ نہیں، کیا کروں.....؟“ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک لمحے کو اس

نے وہ کتاب اس سے مانگنے کا سوچا مگر دوسرے ہی پل خوف کا غلبہ طاری ہو گیا۔

”نہیں، نہیں..... معلوم نہیں کون سا سفلی علم ہے اس کے پاس..... میں ان کاموں میں نہیں پڑوں گی..... آغا جان کو علم ہوا تو ناٹکیں توڑوں گے میری۔“

وہ خود کو سرزنش کرتی فائل اور بیگ سنبھالے اٹھو کھڑی ہوئی۔ اسے اب اس سیاہ فام لڑکی سے کوئی بات نہیں کرنی تھی، بس! اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

البتہ دل کے کسی چھپے خانے میں اس کتاب کو حاصل کرنے کی خواہش نے بھی بہت خاموشی سے سراخانا شروع کر دیا تھا۔



ان دنوں سرست بہت خوش رہنے لگی تھیں اور وہ ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔

”پتہ ہے محمل! بہت اچھے لوگ ہیں یہ۔ نہمان بھائی بڑے بھلے ماں انسان ہیں اور ان کا پینا تو بہت ہی خوب رو ہے۔ اللہ نے ہماری سن لی ہے، وہ ضرور ہم پر رحم کرے

وہ کبھی بھی بینہ کر اس کو بتانے لگ جاتیں تو وہ خاموشی سے مکراہٹ دبائے، سر جھکائے سنتی چلی جاتی۔ اب تو گھر کے کام بھی آرام سے کر دیتی۔ کچھ دن سے تائی کو جواب دینے بھی چھوڑ دیئے تھے۔ پہلی دفعہ اس زندان سے نکلنے کی کوئی امید جو بندھی تھی۔

سدرہ البتہ اسے اٹھتے بیٹھتے بہت عجیب نظر دیں سے دیکھتی تھی۔ محمل پروانہ کرتی مگر اس روز تو حد ہی ہو گئی۔ وہ شام کی چائے کی ٹرالی دھکیلی باہر لان میں لاٹی تو سدرہ نے ایک دم اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔

”شاید ابھی تک ناراض ہیں۔“ اس نے سوچا اور پھر جیسے مداوا کرنے کے لئے سب سے پہلے سدرہ کا کپ بنایا۔

”سدرہ آپی! چائے۔“ بہت شاشکنگی سے مسکرا کر کپ بڑھایا۔

”آپی؟..... میں تمہاری آپی لگتی ہوں؟“ سدرہ نے کپ لیتے لیتے زور سے شخ دیا۔ گرم ابلتی ہوئی چائے محمل کے گھنے پر گری۔ وہ بلبلہ کر کھڑی ہوئی، کپ گھاس پر جا گرا۔

”یوں لوگوں کے سامنے آپی کہہ کر تم یہ ظاہر کرتی ہو کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں، ہاں؟“ سدرہ یک دم چلانے لگی تھی۔ ”می!..... می! اس کو دیکھیں، یہ ہمیشہ یہی کرتی ہے۔ یہ ہمیشہ لوگوں کے سامنے مجھے بے عزت کرتی ہے۔“ سدرہ نے زور زور سے روٹا شروع کر دیا۔

”اُسے ان کی تو عادت ہے، یہ ماں بیٹی تو اس گھر کی خوشی دیکھنہ میں سکتیں۔ نہ میری بیٹی! تو غم نہ کر۔ اور اب کھڑی کیا ہو؟ جاؤ اپنی نحوسٹ لے جاؤ میرے سامنے ہے۔“ مالی مہتاب نے بھی بہت دنوں کا غصہ ایک دم نکالا۔

وہ، جو شاکری تھی، بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ سرست بھی پریشان سی کچن میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے بھی سن لیا تھا۔ محمل کچھ کہے بغیر اندر کر کرے میں بند ہو گئی۔

اندازہ تو اسے تھا ہی کہ تائی کا مودا اس روز سے بیکم نعمان کی باتوں پر خراب ہے مگر وہ کچھ کہہ بھی نہ رہی تھیں، چپ ہی سادھی تھی۔ شاید اس بات پر کہ اب وہ محمل کی

ہونے والی سرال تھی، ان سے کیا پنگا لینا۔

مگر رات میں اس کی یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی، جب اس نے کچن میں تائی مہتاب کو سرت سے کھٹتے سن۔

”ہم نے تو اسی روز نعمان بھائی لوگوں کو انکار کر دیا تھا۔ محمل کی کون سا شادی کی عمر ہے، ابھی گھر کی بڑی بیٹیاں ہیں، پہلے ان کی ہو گی، پھر ہی محمل کا سوچیں گے چائے آغا صاحب کے کمرے میں پہنچا دو۔ وہ رات کا کھانا نہیں کھائیں گے۔ اور نیل لگا دو۔“ وہ حکم صادر کر کے بے نیازی سے باہر نکل گئیں۔ کچن کے دروازے پر دھواں دھواں چہرہ لئے کھڑی محمل پر بس ایک استہزا سیئے نگاہ اچھائی تھی۔ جبکہ اندر ٹھحال سی بمشکل کھڑی سرت کو دیکھنا بھی گوارانہ کیا تھا، جن کے دل پر انہوں نے اٹھی برچھی پھیر دی تھی۔

◎◎◎

اسے نہیں علم تھا کہ کیوں۔ مگر وہ رات دیر تک برآمدے کی بیڑھیوں پر بیٹھی روتی رہی تھی۔ اندر سب سورہ ہے تھے، سرت بھی سونے چلی گئی تھیں۔ وہ پڑھائی کا بہانہ کر کے باہر آئی تھی اور دیر سے ادھر بیٹھی بے آواز آنسو بہار ہی تھی۔

بھی عمر کا پہلا خواب تھا، وہ بھی ایسے کرچی کرچی ہوا تھا کہ روح بلبلہ اٹھی تھی۔ وہ اتنی ہرث ہوئی تھی کہ دل پھٹ رہا تھا۔ کوئی اتنا بھی ظالم ہو سکتا ہے، جتنی تائی تھیں۔ جتنے یہ سب لوگ تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ بے خبر سوتے ان لوگوں کے کمروں کو آگ لگادے، یا چھری سے ان کی گرد نیں کاٹ پھینکے یا زہر دے کر سب کو مار دے۔ اور آخر میں خود بھی پھاٹک لے۔ نفرت..... بہت شدید نفرت محسوس ہوتی تھی اسے اپنے ان رشتہ داروں سے۔ اس کا دل چاہتا تھا، وہ ان گھٹیا اور کمینے لوگوں سے دور چلی جائے، جہاں اسے ان کی شکل نہ دیکھنی پڑے۔ اور واقعی، اب وہ چلی بھی جائے گی۔ اس نے سوچ لیا تھا، بس ایک دفعہ اسے وہ اسکالر شپ مل جائے، جس کے لئے اس نے برش ہائی کمیشن کے اعلان کے بعد اپلائی کیا تھا کہ بھلے گھر کے جو حالات ہوں، اس نے فتحہ سے الیف ایس سی تک ہر بورڈ ایگزام میں پورے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا۔ الیف ایس سی پری انجینئرنگ میں ٹاپ کرنے کے باوجود اس کا انجینئرنگ کی طرف رجحان نہ تھا، یا رہانے

تھا۔ سوبی اس سی تھس میں ایڈیشن لے لیا تھا اور اسے امید تھی کہ اب بھی وہ ہی ناپ کرے گی۔ اور اگر اسکا لارٹ پ اسے مل جائے تو بہت آسانی سے اسے اس زندان سے چھٹکارا مل جائے گا۔

وہ آنسو ہتھیلی کی پشت سے رگڑتی اس سوچ میں غلطان تھی کہ کوئی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ جوتے دیکھ کر چونگی اور بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا۔
وسم اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔

”وسم بھائی؟“ وہ کرنٹ کھا کر اٹھی اور دو قدم پیچھے ہٹی۔

وہ تائی مہتاب کا تیرے نمبر کا بیٹھا تھا۔ فہد کا چھوٹا اور ناکارہ و آوارہ بھائی۔ اس وقت بھی وہ اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ جانے کب اچانک آ کر اوہر کھڑا ہوا تھا۔ کھلا گریبان، تنگ جیز، گردن سے لشی چیزوں، بکھرے بال اور سرخ آنکھیں۔ وہ نشہ کرتا تھا، گھر میں سب کو علم تھا۔ یہاں تک کہ فضہ چاچی اپنی بیٹیوں کو اس کے قریب بھی نہ جانے دیتی تھیں۔ خود حسن بھی احتیاط کرتا تھا۔ آرزو البتہ لاپروا اور مذر تھی۔ ویسے بھی وسم گھر میں بہت کم ہی نظر آتا تھا۔

محمل ہر ممکن احتیاط کرتی کہ اکیلے میں اس کے سامنا نہ ہو کہ اسے اس کی آنکھوں سے خوف آتا تھا۔ مگر آج جانے کیسے.....

”کیا کر رہی ہو؟“ وہ ایک قدم اور اسٹیپ پر چڑھا تو وہ بے اختیار مزید پیچھے ہٹی۔

”ک..... کچھ بھی نہیں۔ وہ آغا جان آواز دے رہے ہیں۔“ وہ ایک دم پلٹ کر اندر بھاگ گئی۔

”ہونہے!“ وسم نے تمسخرانہ سر جھٹکا، چند لمحے اوہر کھڑا سوچتا رہا، پھر باہر گیٹ کی طرف چل دیا۔



وہ بہت بوجھل سی تھی۔ وہ بس، اسٹاپ پر بیٹھ چکی۔ اکیلی بیٹھی متورم آنکھوں سے ڈور افق پر جانے کیا تلاش کر رہی تھی، جہاں نیلی صبح کے پرندے اُڑ رہے تھے، رات بھر کے

روزے کے باعث اس کے سر میں درد کی شیسیں اٹھ رہی تھیں اور اوپر سے وہ سیاہ فام لڑکی بھی نہیں آئی تھی۔

جانے آج وہ کہا رہ گئی تھی؟ ابھی تک کیوں نہ آئی تھی؟ صرف اس لئے محمل آج پندرہ منٹ پہلے ہی آگئی تھی، تاکہ دس کے بجائے پچھیس منٹ اس کے ساتھ مل جائیں، مگر یہ تو اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ آتی کب تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس کا انتظار کیوں کر رہی تھی۔ حالانکہ کوئی بات ایسی نہ تھی، جسے وہ اس کے ساتھ شیر کر سکتی۔ کسی مسئلے کا حل دریافت کر سکتی یا اس کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتی نہیں، اس کے پاس بتانے کو کچھ بھی تو نہیں تھا، پھر بھی اسے اس کا انتظار تھا۔ وہ بار بار کلائی پر بندگی رست و ارج دیکھتی۔ لمحے سر کتے جا رہے تھے، پچھیس منٹ ختم ہونے کو تھے، مگر اس سیاہ فام لڑکی کا ذور ڈور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔

بس کا ہارن بجا تو وہ شکستہ قدموں سے اٹھ کر جل دی۔ سنگی بیٹھ خالی رہ گیا۔ صبح کے پرندے اپنے سفر کو نکل گئے اور نیلا ہٹ بھرا افق سہری کرنوں سے بھگنے لگا۔ وہ بہت اُداس سی، بس میں سوار ہوئی تھی۔ سارا راستہ خاموش سی گردن موڑے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اس کی لمبی صراحی مانند سہری گردن، اوپنچی پونی ٹیل کے باعث چیپھے سے بھی جھلکتی تھی اور اسے یکسر ممتاز بنا دیتی تھی۔

بس کے رکنے سے قبل اس نے بیگ میں سے پاکٹ مرنکاں کر دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر متور مسوحی آنکھوں کو چھپانے کو گھبرا کا جل ڈال لیا تھا۔

”محمل! تم اتنا کا جل مت ڈالا کرو۔ مانڈ مت کرنا، مگر تمہاری آئیز بالکل گولڈن گلر کی ہیں اور کا جل میں بالکل لمبی کی طرح لگتی ہیں۔ یوں نو، کیٹ وومن۔“ نادیہ دیکھ کر ہنس کر بولی تھی۔ ”اور مجھے بلیاں بالکل پسند نہیں۔ کھاؤ گی؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑا چیپس کا پیکٹ بڑھایا۔

محمل نے ایک خاموش نگاہ اس پر ڈالی اور ”نو ٹھینکس“ کہہ کر سر جھکائے اپنی کتاب پر کچھ لکھنے لگی۔ سر جھکائے سے اس کی اوپنچی پونی ٹیل ہزیدہ اٹھ جاتی اور بھورے بال گردن پر گرتے دکھائی دیئے لگتے۔

”ماں پلیو را!“ نادیہ نے شانے اچکا کر پیکٹ واپس لے لیا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے کچھ دھتی رہی۔ وہ لا بیری میں نادیہ کو کل تائی ماں کے جواب والی بات بتانے آئی تھی، مگر اس کا لفڑن کر دل ایک دم ثوٹ سا گیا تھا۔ بس چنکی بجاتے اس نے محمل کی خوب صورت بادا می، سنہری آنکھوں کو بلی سے مشابہ قرار دے دیا تھا، شاید اس لئے کہ عام سی صورت کی نادیہ جب محمل کے ساتھ چل رہی ہوتی تو بہت سے سر مرکز کر ہمیشہ ستائش نگاہوں سے محمل کو ہی دیکھتے تھے۔ دراز قد، اسارت، لمبی گردان اور اوپری براون پونی ٹیل والی لڑکی، جس کی سنہری آنکھیں دھوپ میں اور بھی زیادہ چمکتی تھیں، پورے کالج میں پاپولر تھی۔ ایسے میں جب وہ کا جل ڈال کر مزید خوب صورت دیکھتی تو نادیہ سے کبھی کبھار برداشت نہ ہوتا اور وہ کچھ ایسا ضرور کہہ دیتی، جو محمل کا دل توڑ دیتا تھا۔

اب بھی وہ نادیہ، اپنی بیٹ فرینڈ کے پاس رونے آئی تھی مگر..... نادیہ کے پاس اس کے دکھ سننے کی فرصت نہ تھی۔ وہ مسلسل اپنے نوش میں مگن تھی اور جب ذرا دیر کو فارغ ہوئی تو اس کا دل کچھ ایسے توڑا کہ وہ پھر کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

”ہاں، تم کچھ بتا رہی تھیں۔“ وہ چیس کا پیکٹ کتاب کی اوٹ میں کے مسلسل چیس نکال کر کتر رہی تھی۔ ”تائی ماں کی بات تھی شاید.....“
”نہیں۔ کوئی بات نہیں تھی۔“

”اچھا۔ مجھے لگا.....“

”تمہیں غلط لگا۔ میں چلتی ہوں۔ زارا سے کچھ کام ہے۔“ وہ مصروف سی کتابیں اٹھائے باہر نکل آئی۔

انگلے دوروز یونگی مضھل سے گزرے۔ پریشانی، مایوسی، نا امیدی اور دکھ، وہ ہر طرح کے منی خیالات میں گھری ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے دنیا سے رنگ ہی ختم ہو گئے ہوں۔ سب کچھ پھیکا پھیکا ساتھا اور دل کا باغ دیران، اجڑا ہوا۔
اور پھر اچانک تیرے دن وہ سیاہ فام لڑکی آگئی۔

اس نے دوسرے اسے بیٹھ پہنچنے دیکھا تو یکدم غصے کی ایک لہر اس کے اندر آئی۔

وہ تیز تیز چلتی اس کے قریب آئی۔

”تم دو دن سے کہاں تھیں؟“ سیاہ قام لڑکی نے سراخھایا۔

وہ بہت غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرا کچھ کام تھا، میں.....“

”تمہیں مزا آتا ہے، دوسروں کو اپنا انتظار کرو کے؟ تمہیں لگتا ہے، میں تمہاری مدد کے بغیر مرجاوں گی؟ ہاں، حالانکہ ایسا نہیں ہو گا۔ تم توجہ لینے کے لئے وہ باتیں کرتی ہو، جس سے دوسرا تمہاری طرف کھنچا چلا آئے۔ مگر مجھے تمہاری بالکل ضرورت نہیں ہے اور مجھے تمہاری پرواہ ہے اور..... اور مجھے تمہاری کتاب کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نہیں مری تمہاری مدد کے بغیر۔ دیکھو، دیکھو! میں زندہ ہوں۔“ تیز تیز بولتے وہ ہاپنے لگی تھیں۔
سیاہ قام لڑکی ذرا سا مسکرائی۔

”تو تم میرا انتظار کر رہی تھیں؟“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ ”مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”تم شاید بلند آواز میں اپنے دل کی آواز کو جھیلراہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ مت کرو۔ اپنے دل کی سنو۔ وہ تمہیں کچھ کہہ رہا ہے۔“

”مجھے ڈکٹیٹ مت کرو۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تم میرے ساتھ امید افزاباتیں کر کے اپنی کتاب مجھے پہنچا چاہتی ہو، میں خود سمجھتی ہوں تمہارا مقصد۔ مگر یاد رکھنا، میں تم سے یہ کتاب ہرگز نہیں خریدوں گی۔“

”نہ ہی میں تمہیں یہ شج رہی ہوں۔ لیکن ایک دن ایسا آئے گا، جب تم خود مجھ سے یہ کتاب مانگنے آؤ گی اور تب میں تمہیں فوراً یہ تھما دوں گی۔ ابھی تم سفر کے آغاز میں ہو۔ اور جب تھکو گی تو اس کتاب کے پیچھے آؤ گی۔ مجھے تمہاری کسی بات کا برا نہیں لگا۔ مجھے بس تمہارے چھکنے کا انتظار ہے۔ تمہاری بس آگئی ہے۔“

اس وقت تو وہ غصے میں پلٹ گئی، مگر پھر سارا دن بھی سوچتی رہی کہ اس کو اس سیاہ قام لڑکی کو دیکھ کر ہو کیا گیا تھا۔ کیوں اس نے اس پر اتنا غصہ کیا؟ وہ کیا لگتی تھی اس کی؟ اس نے کیا بگاڑا تھا اس کا؟ اور اسے غصہ کس بات کا تھا؟ یوں انجانے لوگوں کے ساتھ

اس طرح کا سلوک تو محمل ابراہیم بھی نہ کرتی تھی، پھر اب کیوں؟
ندامت اور شرمندگی کے احساس نے اسے پورا دن جکڑے رکھا۔ وہ کچن کے تمام
کام بے توجی سے نمٹاتی رہی۔ پڑھائی بھی نہیں سے نہ کر سکی۔ پیپر زہر ہے تھے، اب
بھی اس کے پاس پڑھنے کو بہت کچھ تھا، مگر سارا دن احساسِ جرم اسے اندر رہی اندر
کچوک کے لگاتا رہا اور جب رات کو اچانک رضیہ پھپھو کی آمد کا شور اٹھا تو وہ بہت بے دلی
سے لاونچ میں آئی تھی۔

”فالقة آج کل سارا وقت میرے ساتھ پچن میں لگتی رہتی ہے، میں تو منع کرتی ہوں
مگر مجال ہے جو یہ مجھے کسی کام کو ہاتھ لگانے دے۔ آج بھی پڈنگ بنائی تھی، کہہ رہی تھی
سارے ماںوں شوق سے کھاتے ہیں، انہیں دے آؤ۔ میں نے خود کہا، خود رہی دے
آؤ۔ ماںوں میں تو جان ہے میری بچی کی۔ اور سب نہیں ہے گھر میں؟ فواد کہاں ہے؟
نظر نہیں آرہا۔“ مہتاب تالی کے ہمراہ اندر داخل ہوتی رضیہ پھپھونے بات کے اختتام پر
ادھر ادھر دیکھ کر بظاہر سرسری سا پوچھا تھا۔ فواد تو نہ نظر آیا، مگر محمل پہ نگاہ پڑی تو چیرے پر
تارکواری بکھر گئی۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کی آخری بات پر وہ ذرا سا استہزا یہ مسکرانی
تھی۔

”لڑکی! کوئی کام کا ج بھی ہے تمہیں؟ جب دیکھو، لوٹھا کی لوٹھا، ادھر ادھر بھاگتی پھر
رہی ہوتی ہو۔ میری بھائی کا جگرا ہے، جو مفت خوروں کو گھر میں نکار کھا ہے۔ ورنہ میں
ہوتی تو..... ہونہہ!“ انہیں اس کی مسکراہٹ تپا گئی تھی، جیسے چوری پکڑی گئی ہو، سو بگز کر
کہتی بڑے صوفی پہنچیں۔

فالقة بھی دونوں ہاتھوں میں ٹرے پکڑے جس پر دو ڈونگے رکھے تھے، چلی آرہی
تھی۔ فیشن کے مطابق شارت شرٹ کے نیچے ٹراوڈر اور لمبے لمبے بال کھلے تھے، جن
میں چوٹی کے مل صاف نظر آتے تھے۔ وہ سدرہ کی طرح خوب میک اپ کرتی تھی اور
اس طرح شاید ذرا قبول صورت لگ جاتی، اگر وہ گہرے مسکارے اور آئی میک اپ کے
اوپر وہ بڑا سا سیاہ فریم کا چشمہ نہ لگایا کرتی۔

”یہ کدھر رکھوں مماثی جان؟“ وہ رک کر مدھم آواز میں پوچھ رہی تھی، ورنہ یہی

فالقة تھی جو کچھ عرصہ قبل بے ہنگم شور کیا کرتی تھی۔

”پھن میں رکھ دو۔ بلکہ محمل! تم لے جاؤ۔“

”لائیے؟“ محمل آگے بڑھی تو فالقة نے قدرے تذبذب سے مان کو دیکھا۔

”وے دیں فالقة بامی! فواد بھائی تو دیے بھی ابھی آفس سے نہیں آئے۔ پھپھو پوچھ رہی تھیں، ابھی ان کا.....“ وہ بے نیازی سے کہہ کر پڑے لئے پھن میں رکھ آئی۔

”فواد ابھی تک نہیں آیا؟“ پھپھونے بے چینی سے گھڑی دیکھی، پھر فالقة کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً مہتاب تائی کے بالکل مقابل صوفے پر موڈب کی بیٹھ گئی۔

”ہاں، کچھ کام تھا شاید۔ اور تم نھیک ہو؟“ تائی ریبوت انھا کر چینل بدل رہی تھیں، انداز میں عجب شان بے نیازی تھی۔ جن کے فواد جیسے بیٹھے ہوں، ان پہ بیٹھوں کی مائیں یونہی مکھیوں کی طرح بھجنھاتی ہیں، وہ رضیہ پھپھو کے اطوار خوب بھجھتی تھیں۔

”یہ پڈنگ فالقة بامی نے بنائی ہے پھپھو؟“ وہ واپس آ کر ان کے سامنے صوفے پہ ناگ پہ ناگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہی جینز، گرتہ، گردن میں مفلکی طرح لپٹا دو پشہ اور اوپنجی پونی ٹیل۔ یہ اس کا مخصوص حلیہ تھا۔

”ہاں تو اور نہیں تو کیا؟“

”اچھا، آپ تو اس روز اپنی مائی سلیمہ سے پڈنگ بنوارہی تھیں، وہ جب میں آپ کے گھر گئی تھی، آپ تو کہہ رہی تھیں کہ نہ آپ کو، نہ ہی فالقة بامی کو پڈنگ بنائی آتی ہے۔ فالقة بامی!“ اس نے چہرہ فالقة کی طرف موڑا۔ ”ابھی ریسنٹلی سمجھی ہے آپ نے؟“

”ہاں، ہاں۔ میرے ساتھ آج کل سب کچھ سیکھ رہی ہے۔ بیٹھ کر مفت کی روٹیاں تو نہیں توڑتی۔“ پھپھو چمک کر بولیں۔ تائی مہتاب ریبوت پکڑے چینل بدل رہی تھیں۔ چہرے پہ البتہ واضح بے زاری چھائی تھی۔

”اور آپ نے کس سے سمجھی؟..... اپنی ماں سے؟“

”زیادہ زبان نہیں چلنے لگی تمہاری محمل! یہ تو میری بھائی کا حوصلہ ہے کہ تمہیں برداشت کرتی ہیں، ان کی جگہ میں ہوتی تو دو دن میں گھر سے نکال دیتی۔“

”ان کی جگہ آپ کیسی ہو سکتی تھیں پچھو! دوسروں کے پیسے پیش کرنا ایک آرٹ ہے، اور یہ ہر کسی کو تو نہیں آتا نا۔“

”شش آپ محمل!“ تائی نے غصے سے ریبوٹ رکھا۔ ”زیادہ بک بک کی تو ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گی۔ اور یہ ہم نہ رکھتیں تو کہاں جاتی تم، ہاں؟“

”انگلینڈ۔“ وہ آرام سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے پاؤں جھلارہی تھی۔

”کیا مطلب؟“ وہ سب چونکے۔

”میں نے اسکالر شپ کے لئے اپلاٹی کر دیا ہے اور بہت جلد میں تو اماں کو لے کر انگلینڈ پلی جاؤں گی، سو آپ بھی سے ملازم ڈھونڈنا شروع کر دیں۔ آپ بیٹھیں، میں ذرا پچن دیکھ لوں.....“ وہ اٹھ کر پچن کی طرف پلی آئی، جانتی تھی کہ ان کے سروں پہ بہم پھوڑ کر آئی ہے۔ مگر اس وقت ان سب کو ستانے کا دل کر رہا تھا۔

کھانے پہ ہی اس کی پیشی ہو گئی۔

”تم نے کون سی اسکالر شپ کے لئے اپلاٹی کیا ہے؟ مہتاب بتا رہی تھی، کیا بات ہے؟“ آغا جان نے جیسے ایک دم یاد آنے پہ کھانے سے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”اسکالر شپ؟“ آرزو نے ابر واٹھائی۔ ندا اور سامیہ باقی کرتی ٹھنک گئیں۔ فضہ پنجا نے حیرت سے گلاس رکھا اور فواد لقہہ منہ میں ڈالتے ہوئے بری طرح چونکا تھا۔

باقی سب بھی ایک دم ڈک کر اسے دیکھنے لگے، جو بہت اطمینان سے بازو بڑھا کر راستے کا ڈونگا اٹھا رہی تھی۔

”جی آغا جان! برٹش ہائی کمیشن کی طرف سے کچھ اسکالر شپس اناؤنس ہوئی تھیں، ماشرز کے لئے۔ میں نے اپلاٹی کر دیا۔“ اب وہ بڑا چچپہ بھر کر راستہ، چاولوں پر ڈال رہی تھی۔ ”امید ہے جلد ہی مل جائے گی۔“ پھر میں انگلینڈ پلی جاؤں گی۔ سوچ رہی ہوں، دیں ساتھ ساتھ جا ب وغیرہ بھی کر لوں۔ آخر خرچ پہ بھی تو پورے کرنے ہوتے ہیں نا؟“

چچپہ چاولوں میں ہلا کر راستہ مکس کرتے اس نے لاپرواٹی سے اطلاع دی اور اسے لگا تھا کہ ابھی بھر میں طوفان کھڑا ہو جائے گا، مگر.....

”ہوں، ویری گذ۔ ضرور اپلاٹی کرو۔“ آغا جان پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہو

چکے تھے۔ اب کہ حیران ہونے کی باری محمل کی تھی۔ اس نے لمحے بھر کو ٹھنک کر انہیں دیکھا اور پھر سنپھل کر بولی۔

”تھینک بُو آغا جان!“

اس کے الفاظ پر جہاں مرت اطمینان سے کھانے لگیں، وہاں نیل پہ بہت سے لوگوں کی خاموش معنی خیز نگاہوں کے تبادلے ہوئے تھے۔

وہ سر جھکائے چاول کھاتی رہی۔ امید تو نہ تھی کہ وہ کوئی ڈراما کھڑا نہ کریں گے مگر وجہ بھی فوراً سمجھے میں آگئی۔ وہ باہر چلی جائے تو ان سے جائیداد میں سے حصہ کون مانگنے کھڑا ہوگا؟ ان کے لئے تو اچھا ہی تھا کہ وہ چلی جائے۔

ایسے تو نہیں چھوڑ دیں گی تم لوگوں کو میں۔ چلی بھی گئی تو ایک دن ضرور واپس آؤں گی، اور اپنا حصہ طلب کروں گی۔ اور تم سب کو ہر اس عدالت میں گھیشوں گی، جہاں جانے سے تم خوف کھاتے ہو۔ اس نے دل میں تہییر کیا تھا اور پھر جب پانی کا جگ انٹھانے کو سراہیا تو یکدم چونگی۔

بے تو بھی سے کھانا کھاتا فواد اسے ہی دیکھ رہا تھا، اسے سراہیا پا کر فوراً اپنی پلیٹ پر جھک گیا اور بعد میں پھپھو نے کتنا ہی ”میری فائقة نے آج پڑنگ بنائی ہے“ کہہ کر اسے روکنا چاہا، وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے کام ہے، میں چلتا ہوں۔“

”ہاں بیٹا! تم کام کرو۔“ مہتاب نے بھی فوراً اس کی تائید کی تھی۔ ادھر پھپھو ہائیس ہائیس کرتی رہ گئیں اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ محمل کا دل یکدم اُداس سا ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔



دُور بیچ پہنچی سیاہ فام لڑکی کو دیکھ کر، اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ وہ سبک رفتاری سے چلتی بیچ کے قریب آئی۔

”گڈ مارنگ؟“

سیاہ فام لڑکی نے چونک کر راحٹھایا اور پھر ذرا سامسکرائی۔

”گڈ مارنگ ٹو ٹو ٹو۔“ وہ اسی طرح کتاب کے کناروں پر مقبوٹی سے ہاتھ جانے پہنچی تھی۔

”میں دراصل.....“ محمل متذبذب سی اس کے ساتھ پہنچی۔ ”مجھے..... مجھے کل کے روئیے پہ بہت شرمندگی ہے۔ میں کبھی بھی اتنی رُوذ نہیں ہوتی اور.....“
”جانے دو۔ مجھے بر انہیں لگا۔“

”نہیں..... آئی ایم سوری..... ریسلی سوری..... میں کچھ پریشان تھی۔“

”میں نے تو تمہیں تھہاری ہر پریشانی کا حل بتایا تھا۔ تم خود ہی اس طرف نہیں آنا چاہتی۔“

”نہیں، وہ.....“ اس نے بے ساختہ لگاہیں چاہیں۔ ”مجھے اس کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”مگر اس کتاب کو تم سے ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اسے تھہارے حوالے کر دوں۔“

وہ بڑی طرح چونکی بھی۔ پہلی گفتگو میں بھی اس نے اسے کوئی ایسی ہی بات بتائی

تھی۔

”یہ..... یہ کتاب مجھے جانتی ہے؟“

”سو فیصد جانتی ہے۔ تمہاری زندگی کی ساری کہانی اس میں لکھی ہے۔ گزرے واقعات اور آنے والے حالات۔“

”واقعی؟“ وہ ششدہ ری اسے دیکھ رہی تھی۔ عجب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”ہاں، اس میں سب لکھا ہے۔“

”تم نے..... تم نے میری زندگی کی کہانی پڑھی ہے؟“

”نہیں، میں وہ نہیں پڑھ سکتی۔“

”کیوں؟..... کیا تم نے یہ کتاب پوری نہیں پڑھی؟“

”میں نے پوری پڑھ رکھی ہے۔ مگر مجھ پر صرف میری زندگی کی کہانی کھلی ہے۔

تمہاری زندگی کی کہانی صرف تم پر ہی کھلتے گی۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو، میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اب کے وہ واقعی پریشان ہو گئی۔

تھی۔

”آجائے گی..... ہر بات سمجھ میں آجائے گی۔ بس تھوڑا وقت لگے گا۔“ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ لڑکی کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور یہ کتاب کس نے اس کے لئے صدیوں قبل لکھوا کر چھوڑی تھی، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

بس کا ہارن بجا تو وہ چونگی اور پھر بغیر کچھ کہے تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سیاہ فام لڑکی مسکراتے ہوئے اسے بس میں سوار ہوتے دیکھ رہی تھی۔



”فواد کو چائے کرے میں دے آؤ۔ اور محمل! تم ٹرالی باہر لے آؤ۔“ تائی مہتاب اپنی ازلی بے نیازی سے حکم صادر کر کے پلٹ گئیں تو ٹرالی سیٹ کرتی محمل کسی خیال سے چونگی۔

”فواد کی ٹرے الگ سیٹ کر دو محمل! میں دے آؤں گی، تم ٹرالی باہر لے جاؤ۔“

”میں نہیں لے کر جا رہی ٹرالی۔ عک آگئی ہوں میں ان ذیل لوگوں کے سامنے۔“

”اچھا، اچھا۔ چپ کرو۔“ سرت بوکھلا کر آگے بڑھیں اور ٹرالی کا کنارہ تھام لیا۔
”میں لے جاتی ہوں، تم فواد کو چائے دے آؤ۔“

اور یہی تو وہ چاہتی تھی، سو شانے اچکا کر بظاہر لاپرواں سے فواد کی ٹرے سیٹ کی اور پھر اسے اٹھا کر دھپ دھپ سیرھیاں چڑھتی گئی۔

”فواد بھائی!“ دروازے پر ہلکا ساناک کیا۔

”ہوں، آ جاؤ۔“

اس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

فواد باز دائنگھوں پر رکھے بیڈ پر نشم دراز تھا۔

”فواد بھائی! آپ کی چائے۔“

”ہاں رکھ دو۔“ وہ کسل مندی سے اٹھا۔ انداز سے تھکا تھکا لگ رہا تھا۔

”کیا بات ہے فواد بھائی! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور کپ اٹھا کر اس کے قریب آئی۔

”ہاں، کچھ نہیں۔ آفس کا مسئلہ ہے۔“ اس نے چائے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اسے کپ پکڑاتے محمل کی انھیاں اس کے ہاتھ سے ذرا سی مس ہوئیں۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا، پھر چائے کا گھونٹ بھرا۔

”ہوں، چائے تو تم اچھی بناتی ہو۔“

”ماں نے بنائی ہے۔“ وہ جز بزری اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اوپری بھوری پونی ٹیل والی دراز قدسی محمل۔

”لائی تو تم ہو۔ ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرا دی۔

”اویسیں انگلینڈ جانے کا کیا سین ہے؟“

”وہ میں.... میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔“ وہ سرجھکائے کھڑی انھیاں مردُرہی تھی۔

”مگر تم جاپ کرنے کا کہہ رہی تھیں، مجھے یہ پات اچھی نہیں گئی تھی۔“ وہ چائے کا

کپ سائیڈ پر کھے بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں صرف اپنے خرچوں کے لئے جاب کرنا چاہتی ہوں۔“

”اور یہ اتنی بزنس ایسا پار..... یہ کون سن جائے گا؟“

محمیل نے جھٹکے سے گردن اٹھائی۔ اسے لگا، اس نے غلط سنایا۔

”بزنس ایسا پار؟“

”ہاں۔ تم اس کے اوفر میں سے ہو۔ کیا تمہارا فرض نہیں ہے کہ تم اپنے ابا کے بزنس پر بھی توجہ دو۔ آخر کبھی نہ کبھی تو تمہیں یہ سب سن جانا ہے۔“

”جی؟“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اتی حیران کیوں ہو محیل؟“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ محیل نے دیکھا، وہ اس سے خاصا مبارکہ۔

”میں..... میں پڑتے نہیں۔“

”کیا تم یہ سب نہیں سن جانا چاہتیں؟“

”میں سن جانا چاہتی ہوں۔ مگر کیسے؟“

”تم واقعی سن جانا چاہتی ہو؟“ فواد کے چہرے پر خوشگوار حیرت اُتری۔ ”یعنی اگر میں تمہیں اپنے ساتھ آفس میں لگانا چاہوں تو تم میرے ساتھ کام کرو گی؟“

”جی، جی..... بالکل۔“ اس کا دل ایک دم کسی اور لے پہنچنے لگا تھا، ہاتھ لرزنے لگے تھے۔

”ٹھیک ہے، پھر میں شام میں آغا جان سے بات کر لیتا ہوں۔“

”وہ..... وہ اجازت دے دیں گے؟“ اس کے اندر وسوسوں نے سراٹھایا تھا۔

”شیور..... کیوں نہیں دیں گے؟“ وہ سکرا کر اسے تسلیا دے رہا تھا اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی خوشی کا انظہار کیسے کرے۔ ایک دم ہی سب کچھ اسے اپنی مشنی میں آتا دکھائی دینے لگا تھا۔

دولت نچھا در..... محبوب قدموں میں.....

اب اسے اس سیاہ قام لڑکی کی کتاب کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔

وہ ہوادل میں اڑتی واپس اپنے کمرے میں آئی تھی۔
اور پھر رات میں جب فواد نے اسے اپنے ساتھ بزنس میں ہاتھ بٹانے کی تجویز آغا
جان کو دی تو سب سے پہلے حسن نے بے چینی سے پبلو بدلا تھا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے فواد! محمل کو ابھی اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہئے۔“ وہ
ناگواری سے بولا تو محمل کو واضح برالگا۔ شکر تھا، خاندان کی عورتیں وہاں نہ تھیں، ورنہ تو
طوفان ہی آ جاتا۔

”تم شیخ میں مت بولو حسن! میں آغا جان سے بات کر رہا ہوں۔“
”اور میں تمہاری باتوں کے مطلب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ حسن نے ایک کثیلی
نگاہ محمل پر ڈالی۔ ”مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ یہاں کیا چکر چل رہا ہے۔“
”شٹ اپ!“ فواد بھڑک اٹھا تو آغا جان نے دونوں کوہی جھڑک دیا۔
”شٹ اپ نہ بو تھے۔ حسن! تم جاؤ اپنے کمرے میں۔“ اور وہ فوراً اٹھ کر تیز تیز چلتے
دہاں سے نکل گیا۔

”اور قادری! حسن ٹھیک کہہ رہا ہے۔ محمل کا آفس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی وہ
بھی آفس جائے گی۔“
”مگر آغا جان!“

”آغا بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ محمل کا آفس میں کیا کام؟“
”بالکل۔ لڑکیوں کو ادھر دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے؟“ غفران پچا اور اسد پچا
نے بھی فوراً آغا جان کی تائید کر دی تو محمل نے بے بسی سے مدد طلب نگاہ سے فواد کو
دیکھا۔

”اوے کے، جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ شانے اچکا کر اب جھک کر اپنے بوٹ کے قریب
بند کر رہا تھا۔

اس کا دل جیسے کسی گھری کھائی میں جا گرا۔ وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی پکن میں آئی
اور سنک پر جھک کر بخوبث بخوبث کروٹے گئی۔ اس کے آنسوؤں کے ساتھ سارے
خواب گرتے، بہتھے چلے جا رہے تھے۔ وہ اتنا روئی کہ پھرکی بند ہونے لگی تو بالآخر عل کھول

کر منہ پہ پانی ڈالنے لگی۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ آج وہ آخری دفعہ رورہی ہے۔ وہ آج کے بعد ہرگز نہیں روئے گی۔ اس نے تو سیدھے طریقے سے سب پچھہ واپس حاصل کرنے کا سوچا تھا، لیکن ان لوگوں کو سیدھا طریقہ راس نہیں آیا تھا۔ صحیح ہے، اب اگر اسے ان سے انتقام لینے کو جاوہ یا سفلی علم کا سہارا بھی لیتا پڑا تو وہ ضرور لے گی۔

اسے اب صحیح کا انتظار تھا۔ صحیح اسے بس اشآپ پر جا کر اس سیاہ قام لڑکی سے کتاب لینی تھی۔

ویسے نہیں تو ایسے کسی!

چہرے پہ ٹھنڈا پانی ڈالتے ہوئے اس نے نفرت سے سوچا تھا۔



صحیح اسے کانج نہیں جانا تھا۔ ایگزا مرختم ہو چکے تھے، مگر وہ پھر بھی بہانہ کر کے مخصوص وقت سے آدھہ گھنٹہ پہلے ہی اشآپ پر چلی آئی تھی اور اب مسلسل بیٹھ کے آس پاس ٹھیل رہی تھی۔

سیاہ قام لڑکی ابھی تک نہیں آئی تھی، محمل بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی، پھر بے چین نگاہوں سے گردن ادھر ادھر گھمائی۔ بھوری اوپنجی پولی بھی ساتھ ہی جھولتی۔ اسے شدت سے اس لڑکی کا انتظار تھا اور آج تو لگتا تھا، جیسے وقت بہت دیر سے گزر رہا ہے۔ بالآخر وہ تھنک کر بیٹھ پہنچی اور سر دنوں ہاتھوں میں تمام لیا۔

”کیا میرا انتظار کر رہی تھیں؟“ کسی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ کرنٹ کھا کر اٹھی۔

وہ سیاہ قام لڑکی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”میں تمہارا ہی ویٹ کر رہی تھی۔“

”اور میں جانتی ہوں کہ کیوں؟“ وہ آرام سے بیٹھ پہنچی، بیک کا اسٹریپ کندھے سے اٹا کر ایک طرف رکھا اور کتاب احتیاط سے گود میں رکھی۔ پھر جیسے فارغ ہو کر محمل کا چہرہ دیکھا۔

”تم تھنک گئی ہو؟“

”ہاں، میں تھک گئی ہوں۔ میں نجک آگئی ہوں۔ اس دنیا میں میرے لئے کچھ نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔“

”اوہ ہوں..... ایسے نہیں کہتے۔ ابھی تو تمہیں وہ کچھ لینا ہے، جس کی چک سے تمہاری آنکھیں چکا چوند رہ جائیں گی۔ ابھی تو تم صحیح راستے پر آئی ہو۔“

”مجھے صحیح اور غلط کا نہیں پتا۔ نہ ہی میں صحیح اور غلط کی تفریق میں پڑنا چاہتی ہوں۔“

ال نے بے اختیار نگاہیں چڑائی تھیں۔ اپنے دل سے، اپنے اندر بیٹھتے گفت کے احساس سے۔

”کوئی بات نہیں۔ شروع شروع میں یہ کتاب مشکل لگے گی، جیسے کوئی عذاب ہو، قید ہو، مگر پھر تم عادی ہو جاؤ گی۔“ وہ دیسے ہی مسکرا رہی تھی۔

”یہ کتاب مجھ سے کیسے بات کرے گی؟“ محل سحر زدہ سی اس کی گود میں رکھی کتاب کو دیکھ رہی تھی۔

”روز اس کا ایک صفحہ پڑھنا۔ اگر مشکل لگے تو میں تمہیں کچھ ایسے لوگوں کا بتاؤں گی، جو اس کتاب کا علم سکھاتے ہیں۔ بالکل خاموشی سے، چپ چاپ اپنا کام کرتے ہیں۔ میں تمہیں ادھر لے جاؤں گی، وہ تمہیں اس زبان کا علم سکھائیں گے جس میں یہ کتاب لکھی ہوئی ہے۔ پھر جب تم روز اس کا ایک ایک صفحہ پڑھنے کے قابل ہو جاؤ گی تو تم ہانوگی کہ ہر صفحہ تمہارے لئے yesterday کی رواداد ہے اور تمہیں tomorrow کی تراپیکر بتا رہا ہے۔“

”اور اگر میں ایڈوانس میں ایک صفحہ آگے پڑھ لوں تو مجھے اپنے آنے والے کل کا اللہ ہو جائے گا۔ ہے نا؟“

”نہیں، تم ایک دن میں پوری کتاب بھی پڑھ لو تو بھی وہ تمہارا yesterday کی رواداد ہی رہے گا۔ لیکن اگر وہی صفحے تم اگلے دن پڑھو تو وہ اس دن کے حساب سے تمہاری گزشتہ دنوں کی رواداد بن جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ الجھی گئی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی صفحے کا ایک دن میں لہا مطلب بدل جائے؟“

”اگر یہ نہ ہوتا تو کیا تم آج اس کتاب کی طرف یوں پھنسی چلی آتیں؟“

”تم واقعی بحث کہہ رہی ہو؟“ وہ اندر ہی اندر خوف زدہ بھی تھی۔

”تمہیں شک ہے کیا؟“

”نہیں، مگر تم مجھے یہ کیوں دے رہی ہو؟ تمہارا اس میں کیا فائدہ؟“ اپنی دانست میں محمل نے خاصا عقل مندانہ سوال کیا تھا۔

”میرا ہی تو اصل فائدہ ہے۔“ وہ پھر اسی پراسرار طریقے سے مسکرائی۔ ”جو کچھ تمہیں حاصل ہو گا، اس کا ایک شیئر تو مجھے ہی جائے گا۔“

”شیئر؟“ وہ دنگ رہ گئی۔ ”کیا مطلب؟ کتنا شیئر؟ کتنے پر سنت؟“

”شاید آدھا..... شاید اس سے کچھ کم۔ معلوم نہیں، مگر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے، میرا حصہ مجھے تک پہنچ جائے گا۔ یہ کتاب خود میرے پاس آ کر مجھے میرا حصہ دلوائے گی۔“

”اچھا۔“ وہ متغیری تھی۔ ”پھر میں یہ لے لوں؟“

”پہلے خوب اچھی طرح سوچ لو۔“

”سب سوچ لیا ہے۔“ وہ تیزی سے بولی اور کتاب پر ہاتھ رکھا، مبادا اسے واپس نہ لے جائے۔

”پھر لے جاؤ۔ مگر یاد رکھنا، یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہے جو میں تمہیں دے رہی ہوں۔ اگر تم نے وہ، جنہیں تم عملیات کہتی ہو، کر لئے اور ویسے ہی کیا جیسے یہ کتاب تمہیں کہے تو پھر سب کچھ بدلتے گا۔ تم اس کتاب میں رہنے لگو گی، اسی سے بات کرنے لگو گی۔ اس کے علاوہ تمہیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔ دیوانی ہو جاؤ گی، سحر زدہ، مجنون..... اور پھر اگر تم نے اس کو چھوڑنا چاہا تو تباہ ہو جاؤ گی۔ جو ملا تھا، وہ بھی جائے گا اور جو پہلے سے تھا، وہ بھی عذاب بن جائے گا۔ جاؤ، اسے لے جاؤ۔“

اس نے سیاہ جلد والی بھاری کتاب اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی اور جب محمل ایرائیم نے اسے تھامنا چاہا تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

”تجھیک نہ! کیا یہ مجھے تمہیں واپس کرنی ہو گی؟“

”نہیں۔“

”اور جب میں پوری پڑھلوں، ختم کرلوں، تب؟“

”تب پھر سے شروع کر دینا۔ یہ کتاب کبھی پرانی نہیں ہوگی۔“

”تجھنک یو۔“ وہ کپکپائی انگلیوں سے کتاب پکڑے تیز تیز چلتی گھر کی سمت بڑھ گئی۔ کتاب کی سیاہ جلد سرد تھی۔ بے حد تخف، سرد۔ کوئی اسرار تھا اس میں، کوئی قدیم راز، جسے وہ آج بے نقاب کرنے جا رہی تھی۔

جب اس نے گیٹ کھولا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی نانگیں کانپ رہی تھیں اور دل... دل تو ایسے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر آگئے گا۔ بوجھ بہت بھاری بوجھ تھا، جو اس تھکی ہوئی لڑکی نے لیا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا دل ڈر رہا تھا، کہیں وہ بتا رہی کے کسی راستے کی طرف تو نہیں جا رہی؟ یہ سیاہ علم، سفلی عملیات، یہ اچھی چیزیں تو نہ تھیں۔ پھر وہ کیوں اسے اٹھا لائی تھی؟

اس نے زک کر سوچنا چاہا، مگر اب واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔

”دولت نچادر..... محبوب قدموں میں..... دنیا پر راج۔“

اسے بہت سی چیزیں اکٹھی کرنی تھیں اور وہ کتاب اس کے ہر مسئلے کا حل تھی۔ اسے بیگم نعمان کے بیٹے کا ٹھکرا یا گیارشہ یاد آیا، اسے رات فواد کی بات پر سب کا رد عمل یاد آیا، اسے اپنی بے پناہ دولت بھی یاد آئی تھی، جس پر عیش کوئی اور کر رہا تھا۔ پھر وہ کیسے اس لڑکی کو وہ کتاب، سب خزانوں کی کنجی واپس کر آتی؟ پھر وہ نہیں رکی اور کتاب سینے سے لگائے، سر جھکائے تیز قدموں سے چلتی لاڈنخ میں داخل ہوئی۔

”کہاں سے آ رہی ہو؟“

وہ جو اپنے خیالوں میں گم تھی، آواز پر گھبرا کر دو قدم پچھے ہٹی۔

سامنے تائی مہتاب قدرے مشکوک نظر دیں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”وہ..... وہ تائی! وہ.....“ اس نے بے اختیار خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ”وہ

نادیہ سے کچھ نوٹس لینے تھے، ذرا اسٹاپ تک گئی تھی۔ ماں کو بتا کر گئی تھی۔“

”ہاں..... تمہاری ماں تو کہیں کی لینڈ لیڈی ہے، جس کی اجازت کافی تھی۔“

”وہ..... وہ تائی! پچا..... اسد پچا کو بھی..... بتایا تھا۔“ پہلی دفعہ وہ تائی کے

سامنے یوں ہکلارہی تھی۔

”اچھا جاؤ، سرنہ کھاؤ۔“ تائی بے زاری سے ہاتھ جھلا کر آگے بڑھ گئی۔

وہ کمرے کی طرف لپکی اور جلدی سے الماری کھول کر ایک خانے میں سارے کپڑوں کے نیچے وہ دیزرسیاہ کتاب چھپا دی۔ پھر الماری احتیاط سے بند کی، ادھر ادھر دیکھا۔ صد شتر کہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

”محمل!“ باہرام نے پکارا تو وہ جلدی سے چہرے پر آیا پسند پوچھتی باہر آئی۔

”جی؟“

سرت جو کجن میں سارے گھر کے ناشتے بنانے میں معروف تھیں۔ پین میں انہا پلٹتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

”تم تو کانج گئی تھیں، اتنی جلدی آگئی؟“

”جی بس۔“

”خبریت؟“

”اوہو! آج سب کو میری کیوں فکر پڑ گئی ہے؟ نادیہ سے نوش لینے تھے، مل گئے تو آگئی۔“ وہ خوانخواہ تھی چڑ گئی۔ پھر ادھر ادھر برتوں میں ہاتھ مارتی بظاہر کچھ تلاش کرنے لگی۔

”میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ اچھا ناشتہ تو کرو،“

”نہیں۔ بھوک نہیں ہے۔“ وہ بس منظر سے ہٹنا چاہتی تھی، سواتنا کہہ کر باہر لاو نگاہ میں آگئی۔ ذہن ابھی تک الماری میں کپڑوں کے پیچھے چھپی کتاب میں اٹکا ہوا تھا۔

پھر گھر کے کام کا ج، صفائی اور اس کے بعد سرت کے ساتھ مشین لگائے وہ میکا گئی انداز میں خاموشی سے کام کرتی رہی، مسلسل اس کا دل پلٹ پلٹ کر اس کتاب کی طرف جاتا تھا۔ وہ چند بار اندر آئی اور الماری کھول کر کپڑوں کے پیچھے ہاتھ چھپتھا کر دیکھا۔ وہ سیاہ کتاب دیں رکھی تھی۔

پھر سارا دن وہ موقع ڈھونڈتی رہی کہ اسے جا کر پڑھے، کچھ تو پڑھے چلے۔ کوئی راہ تو نہیں، مگر کاموں کا بوجھ اور کچھ فطری ساخوف تھا کہ وہ اس کتاب کو نکالنے کی ہمت

نہ کر سکی۔

رات کھانے کے بعد اس نے جب سب کو ڈائنس ہال میں سویٹ ڈش میں مصروف پایا، تو بالآخر الماری سے وہ بھاری کتاب نکالی اور اسے سینے سے لگائے دبے پاؤں سڑھیاں اور پرچھتی گئی۔

ڈائنس ہال سے براستہ لاونچ پکن کی طرف جاتی مہتاب تائی نے چونک کرائے آخری سیر ہمی پھلانگتے دیکھا۔

”یہ محمل کیا کرتی پھر رہی ہے آج؟“ انہوں نے پیچھے سے آتی نامہ پچھی کو روک کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”ابھی کوئی کتاب پکڑے اور پر گئی ہے۔“

”اچھا؟“ وہ متجمس سی تائی کے قریب آئیں۔ ”پڑھائی وڑھائی تو اب ختم ہے اور چھٹ پہ تو کبھی نہیں گئی پڑھنے۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔“

اور ان کی سرگوشیوں سے بے خبر، وہ باہر ٹیکس پہ نکل آئی۔ آہستہ سے دروازہ بند کیا اور ریلنگ کے ساتھ نیچے زمین پہ بیٹھ گئی۔ کتاب گھٹنوں پر رکھے وہ کتنی ہی دریا سے دیکھتی رہی۔

محرومیوں، نارسا یوں اور دکھوں کے اس کئی برس پرانے کرب کی اب جیسے انتہا ہو چکی تھی۔ اس سے اب غریب برداشت نہ ہوتا تھا۔ غلط ہو یا صحیح، وہ زندگی سے اپنا حصہ ضرور وصول کرے گی۔

ایک نہوں اور قطعی فیصلہ کر کے محمل ابراہیم نے کتاب کی سیاہ جلد پہ ہاتھ رکھا۔ وہ بے حد سر و تھی۔ سخنڈی اور پُر سکون۔ وہ جلد پلٹنے ہی گئی تھی کہ ایک دم ٹیکس کا دروازہ دھاڑ سے کھلا۔

اس نے گہرا کسر اٹھایا اور ایک لمحے کو تو زمین آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھونٹنے لگے۔

آغا جان، دونوں پچپا، تائی مہتاب، نامہ پچھی اور لڑکیاں اور سرت بھی..... سب ایک ساتھ باہر آئے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے یہاں...؟“ آغا جان غصے سے غرائے تھے۔ ”محمل اکیا کر رہی

ہوا دھر؟“ وہ ہکا بکامنہ کھولے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”ادھر کیا بیٹھی ہو؟ سامنے آؤ!“ تائی مہتاب چک کر بولیں، اور اس کی توجیہے نانگوں میں جان نہ رہی تھی۔ بمشکل اٹھی اور دو قدم آگے بڑھی۔ کتاب اسی طرح دونوں ہاتھوں میں پکڑی تھی اور پورا جسم لرز رہا تھا۔

”وہ..... آغا جان!..... میں.....“

”میں پوچھ رہا ہوں، اتنی رات کو ادھر کیا کر رہی ہو؟“

”مم..... میں پڑھ..... پڑھ رہی.....“ لفظ لبوں پہ ہی دم توڑ گئے۔ اس کی ٹانگیں کاپنے لگی تھیں۔

”کیا پڑھ رہی ہو؟ ادھر دکھاؤ۔“ آغا جان کے لجھ کی سختی کم نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے ستاب بینے کو ہاتھ بڑھایا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

”لک..... لک..... پچھے نہیں..... پچھے نہیں۔“ اس نے کتاب پیچھے کرنی چاہی اور پھر اس نے دیکھا، آغا جان کے پیچھے کھڑی سرت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور تائی فاتحانہ مسکراتی تھیں۔

”ارے ہم بھی تو دیکھیں، بھری رات میں ادھر کون سی کتابوں میں چھپا کر خط کتابت ہو رہی ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی، یہ لڑکی کوئی چاند ضرور چڑھائے گی۔“ اس کے ارد گرد بینے دھماکے ہو رہے تھے۔

”نہیں..... تائی! نہیں.....“ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی نظر میں سر ہلا رہی تھی۔ ”میں نے پچھے نہیں کہا۔ میں تو پڑھ.....“

آغا جان نے زور سے اس کے ہاتھوں سے کتاب چھینی۔ ”پڑھ رہی تھیں تو دکھاتی کیوں نہیں ہو؟“ ایک غصیل نظر اس پڑال کر انہوں نے کتاب اپنے سامنے کی۔

”میں بھی کہوں، کیوں راتوں کو چھٹت پہ آ جاتی ہے، کس کے ساتھ منہ کالا کرتی ہے، یہ زبان جو اتی لبی ہو رہی ہے۔ ارے، میں بھی کہوں، کوئی تو ہے اس کے پیچھے آغا صاحب! اس سے کہئے کہ جس مردود کے لئے چھٹیاں ڈالنے ادھر آتی ہے، اسے کہے کہ ابھی آئے اور دو بول پڑھا کر اسے لے جائے۔ خاندان بھر میں بدنام کرے گی ہمیں

کیا؟“

اور اسے لگا، آج وہ واقعیت ہار گئی ہے۔ آغا جان کتاب کے صفحے پلٹ رہے تھے۔ ہر پلٹتے صفحے کے ساتھ اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر آنکھیں سختی سے بچ لیں۔ آج وہ اسے یقیناً قتل کر ڈالیں گے۔ وہ سفلی عملیات میں پڑ گئی ہے۔ کبھی نہیں بخشنوش گے۔

”شرم نہیں آتی تمہیں، گھٹیا عورت!“ آغا جان ایک دم دھاڑے تو اس کی رہی سی جان بھی نکل گئی۔ اسے لگا، وہ لہرا کر گرنے کو ہے جب.....
”میں..... میں نے کیا کیا ہے؟“ تائی کی ہنگلاتی آواز نکلی۔

محمل نے جیسے کسی خواب سے جاگ کر سر اندازیا۔

وہ کھلی کتاب ہاتھ میں پکڑے محمل سے نہیں، تائی سے مخاطب تھے۔

”تمہیں شرم نہیں آتی، اس یتیم بھی پر الزام لگا کر ہم سب کو اکٹھا کر کے؟ ڈوب مرد تم ایسے الفاظ کہنے سے پہلے۔ وہ اب چھت پہ پڑھ بھی نہیں سکتی؟“
محمل نے پلکیں زور سے جھپکائیں۔ یہ آغا جان کیا کہہ رہے تھے۔

”مگر آغا صاحب! وہ اس کتاب میں.....“

”ڈوب مرد تم بے دین عورت! وہ قرآن پڑھ رہی تھی۔ تم قرآن کی حرمت کا تو پاس رکھ لیتیں۔“ انہوں نے سیاہ کتاب بند کی، اسے چو ما، آنکھوں سے لگایا اور محمل کی طرف بڑھا دیا۔

”بیٹا! نیچے پڑھ لیتیں تو سب پریشان نہ ہوتے۔ یہ لو۔“ وہ اسے کتاب تھما کر، ایک کٹلی نگاہ ان عورتوں پر ڈال کر واپس ہو لئے۔

”نتواب چوروں کی طرح پڑھے گی تو بندہ شک تو کرے گا ہی۔ ورنہ میرا کیا دماغ خراب ہے کہ یوں کہتی؟“ تائی شرمندہ سی پلٹیں۔

آغا جان کبھی کبھار انہیں یونہی سب کے سامنے جھڑک دیا کرتے تھے، خصوصاً جب وہ اپنے رشتے داروں پہ بے در لفظ پیے لٹا تی تھیں۔

”اور نہیں تو کیا.....“ آہستہ آہستہ سب نادم سے پلٹ گئے۔

وہ اسی طرح ساکت سی، کتاب ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ ٹیرس خالی ہو چکا تھا، سب جا پکے تھے۔ پُر سکون اور سرخرو، صرفت بھی۔ اور وہ اسی طرح پھر کا بُت بنی دہاں کھڑی تھی۔

”اس کتاب کا ہر صفحہ تمہارے گزرے دن کی رُوداد ہے۔“

”یہ کتاب کبھی پرانی نہیں ہوگی۔“

”تم سب کو اپنی مشہی میں کر کے دنیا پر راج کروگی۔“

اس سیاہ فامِ لڑکی کا ایک ایک فقرہ ٹھانپے کی طرح اس کے منہ پر برک رہا تھا۔
ترداخ..... ترداخ..... ترداخ.....

اسے لگا، وہ کبھی اپنی جگہ سے مل نہیں سکے گی۔ یونہی صدیوں اس اندر ہرے ٹیرس پر کھڑی رہے گی۔

دھوکا..... مذاق..... فریب..... شخخ..... قرآن کی بے حرمتی..... اس سیاہ فام لڑکی نے کیا نہیں کیا تھا۔ اتنا بڑا مذاق؟ ایک پریشان حال لڑکی کو سبز خواب دکھا کر، اسی کی مقدس کتاب پکڑا دی؟ یہ ہوا کیا تھا اس کے ساتھ؟

اس کے ہاتھ ابھی تک لرز رہے تھے۔ نہایت بے یقینی کے عالم میں اس نے سیاہ جلد والی کتاب کو چھپے کے سامنے کیا۔

سیاہ جلد صاف تھی۔ بے داغ، بے لفظ۔

اس نے درمیان سے کتاب کھوی۔

اوپر عربی کی عبارتیں تھیں اور نیچے انگریزی کی۔ سب سے اوپر لکھا تھا۔

- The cave

اس نے چند صفحے آگے کھولے۔

- The spider

اس نے شروع سے دیکھا۔

- The Table spread

محل نے کتاب بند کر دی۔

آغا جان نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ قرآن تھا۔ ان کی دینی کتاب، مقدس کتاب۔ اور اس فرنگن نے کیسے کیسے قصے گھڑ دیئے تھے اس کے ساتھ۔

”ذلیل عورت!“ وہ شاک سے نکلی تو بے پناہ غصہ آیا۔ وہ لڑکی تو اپنے گھر بیٹھی اس پر ہنس رہی ہو گی، اس کا تمثیر اڑا رہی ہو گی۔ وہ بھی کتنی جلدی بے دوقوف بن گئی۔ اف! وہ تیز تیز قدموں سے بیٹھیوں کی طرف لپکی۔

”نه سر پہ دو پشہ، نہ دضو نماز اور چلے ہیں قرآن پڑھنے۔ ہونہہ!“ لا دُنخ کے بڑے صوفے پر بیٹھی تائی اسے زینہ اترتے دیکھ کر اوپنچا بڑا بڑا تھیں۔ بڑے عرصے بعد آغا جان نے انہیں سب کے سامنے..... بے عزت کیا تھا اور وہ بھی صرف اور صرف محمل کی وجہ سے۔ کوئی بھی جواب دیئے بغیر، سر جھکائے تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



صحح وہ پھر جلدی آگئی تھی۔

سیاہ قام لڑکی آج بہت پہلے سے اس بیچ پر بیٹھی تھی، اسے دیکھ کر محمل کے قدم تیز ہو گئے۔

قدموں کی چاپ پر ہی اس نے سراٹھایا۔ محمل نے دیکھا، اسے دیکھ کر اس کی سیاہ آنکھوں میں امید کے دیے جل اٹھے تھے۔

سردک خالی تھی۔ دُور نارنجی سورج طلوع ہو رہا تھا۔ محمل اس کے بالکل سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سورج کی نارنجی شعاعیں اس کے پیچھے چھپ گئیں۔

”تمہیں شرم تو نہیں آئی ہو گی میرے ساتھ ایسا بے ہودہ مذاق کرتے ہوئے؟“ سیاہ قام لڑکی کی نگاہیں اس کے ہاتھوں میں پکڑی کتابوں پر جھکیں۔ ایک دم ہی اس کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔

”مصحف واپس کرنے آئی ہو؟“

”مصحف؟“ اُکھڑی اُکھڑی سی محمل نے ابرداشتا۔

”ہم ایک دو لذ (عرب دنیا) میں قرآن کو مصحف کہتے ہیں۔“

”تم نے مجھے کیا قصے کہانیاں سنائے تھا دیا؟ یہ کوئی مذاق کرنے کی کتاب تو نہ تھی۔ یہ تو قرآن تھا۔“

”قرآن تھا نہیں، قرآن ہوتا ہے۔“ وہ ادایی سے مسکراتی تو محمل نے شانے اچکائے۔

”بہر حال! تمہیں یہ پریکٹیکل جوک کر کے مجھے شرمندہ کرنے پر شرم آئی چاہئے۔ میں تو کیا سوچ رہی تھی اور تم نے مجھے ایک مقدس کتاب تھا دی؟“

”تو تم کسی غیر مقدس چیز کی توقع کر رہی تھیں کیا؟“

”جی نہیں۔“ وہ تملکتی، پھر قرآن اس کی گود میں رکھا۔ ”یہ میرے پاس پہلے سے ہے، مجھے ضرورت نہیں ہے۔“

”بینہ کر بات کرلو۔“

”میں صحیح ہوں۔“ وہ اسی طرح سینے پہ ہاتھ پاندھے اکھڑی اکھڑی سی کھڑی رہی۔

”اچھا۔“ اس نے نزی سے مصحف کی سیاہ جلد پہ ہاتھ پھیرا۔ ”تو تم نے یہ پڑھ رکھا ہے؟“ اس کی آواز میں صبح کی ساری ادایی سوگنی تھی۔

”ہاں اور بچپن میں ہی پڑھ لیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم شروع سے ہی مسلمان ہیں۔“ وہ عادتاً جتنا کر بولی۔ ”اور تمہیں ہماری مقدس کتاب کے بارے میں غلط فہمیاں ہیں، یہ کوئی فال نکالنے والی کتاب نہیں ہے، نہ ہی اس میں میری یا تمہاری اسٹوری ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔“

”اچھا.....“ وہ ذرا سا مسکراتی۔ ”چلو پھر بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ اس میں کیا ہے۔“

”اس میں احکامات ہیں، نماز، روزے، حج، زکوٰۃ کے۔“ وہ اس کے ساتھ بیٹھ پہنچ کر اسے بہت سمجھ داری سے بتانے لگی۔ ”اس میں پرانی قوموں کے قصے ہیں۔ قوم عاد، ثمود اور..... اور بنی اسرائیل۔“

”یہ بنی اسرائیل کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“

”مطلب؟“ وہ ہلکا سا گزبروں۔ ”بنی اسرائیل کا مطلب ہوا، اسرائیل کے بیٹے؟“

وہ پوچھو رہی تھی یا بتارہی تھی، خود بھی نہ سمجھ سکی۔

”اسرائیل کا مطلب عبد اللہ ہوتا ہے۔ ایں اللہ کو کہتے ہیں۔ یہ یعقوب کا نام تھا۔“

”آں، ہاں۔ حضرت یعقوب کا قصہ، حضرت یوسف کا قصہ، سب پڑھ رکھا ہے میں نے۔ سب پڑھے ہے مجھے۔ میں تو کورس میں پڑھایا گیا تھا، یوسف اور زلینخا والا قصہ۔“

”یوسف اور کس والا قصہ؟“ سیاہ فام لڑکی کی آنکھوں میں حیرت اُبھری۔

”یوسف اور زلینخا والا قصہ۔“

”عزیز مصر کی بیوی کا نام زلینخا تھا؟“

”کیا نہیں تھا؟“ وہ کنفیوزڈی ہو گئی۔

”کوئی دلیل ہے تمہارے پاس؟ کوئی ججت؟“

”دلیل؟..... ججت؟“ وہ نکل شکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”ہمارے کورس کی گائیڈ بک میں لکھا تھا۔“

”کورس کی گائیڈ بک انسان کی بات ہے۔ اور انسان کی بات میں دلیل نہیں ہوتی۔ دلیل صرف قرآن یا حدیث سے پیش کی جاتی ہے، کیونکہ دونوں نازل خداوندی ہوتے ہیں، قرآن اور حدیث میں کہیں بھی نہیں بتایا گیا کہ اس عورت کا نام زلینخا تھا۔“ اس کا لہجہ زم تھا۔ ”مصر کی اس عورت سے ایک غلطی ہوئی تھی، ایک جرم سرزد ہوا تھا، مگر اللہ نے اس کا پردہ رکھ لیا۔ اس کا فعل تو بتایا مگر نام نہیں۔ اور جس چیز کا پردہ اللہ رکھے، وہ کھل نہیں سکتا، مگر ہم نے ”یوسف وزلینخا“ کے قسم ہر مسجد و منبر پر جا کر منانے۔ ہم کیسے لوگ ہیں؟“

”ہیں؟..... تو اس کا نام زلینخا نہیں تھا؟“ وہ ساری خفگی بھلا کر حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”اس عورت کا نام راز ہے۔ اور میرا اور تمہارا رب وہ راز نہیں کھولنا چاہتا، سو یہ ہمیشہ راز ہی رہے گا۔“

”اچھا۔“ اس نے شانے اچکائے۔ پہلی دفعہ اسے اپنی علمی کمتری کا خفیف سا احساس ہوا تھا۔ مگر یہ ماننا اس کی اتنا کی تکست تھی، سولاپرواہی سے ادھر اُدھر دیکھتے

ہوئے بولی۔

”بہر حال، مجھے افسوس ہے کہ تمہارے کانسپٹ قرآن کے بارے میں غلط ہیں۔ یہ کتاب وہ نہیں ہے جو تم اسے سمجھتی ہو۔“

”اور اگر یہ وہ نہ ہوئی جو تم اسے سمجھتی ہو، تو؟“

”میں صحیح ہوں، مجھے سب پتہ ہے۔“

”تمہیں جو کوئی اس نور کی طرف بلائے گا، تم اسے بھی کہو گی؟“

”مگر تم نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ یہ قرآن ہے۔ تم نے تو کچھ اور قصہ سنائے تھے۔ آخر کیوں؟“

”اگر میں تمہیں تبلیغ کرتی تو تم اکتا کر مجھ سے دور بھاگ جاتیں۔“

”اب بھی تو بھی ہو گا۔“ وہ جتنا کر بولی تو سیاہ قام لڑکی نے مسکرا کر سر جھکا۔

”لیکن اب تمہاری ججت تمام ہو چکی ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔“

ایک سیاہ مریضہ زدن سے ان کے سامنے سے گزری تھوڑی دور جا کر اس کے ناز
چڑاتے ہوئے رکے اور وہ تیزی سے رووس ہوئی۔ محمل نے چونک کر دیکھا۔

ڈرائیور گیٹ سیٹ پر فواد تھا۔

وہ حیران سی کھڑی ہوئی۔ وہ اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ مکھولا۔

وہ جیسے کھل کر مسکرائی اور شیخ پر رکھا بیگ کندھے پر ڈالا۔ سیاہ قام لڑکی نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور پھر محمل کی مسکراہٹ کو۔

”تمہارے پاس دورستوں کا انتخاب تھا۔ مصحف یادل..... تم نے اپنا انتخاب کر لیا، مگر مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا کہ میں تمہیں مصحف کی طرف نہ لاسکی۔ اب تمہیں جو بھی لے آئے، میرا اس میں حصہ نہ ہو گا۔ لیکن میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گی۔“

سیاہ جلد دالے مصحف کو سینے سے لگائے، اپنا بیگ کامدھے پر ڈال کر وہ اُداس سیاہ قام لڑکی اُٹھی اور خالی سڑک پر ایک طرف کو چل دی۔ محمل نے دیکھا، وہ لٹکڑا رہی تھی۔

وہ سر جھٹک کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

”جی فواد بھائی؟“ اس نے فرنٹ سیٹ کے کھلائشے پر جھک کر پوچھا۔

”آؤ بیٹھو۔“

”مگر.....“ وہ متذبذب ہوئی۔ ”مگر تو کانج کا کہہ کر آئی تھی۔“

”کانج کیوں جانا ہے؟“

”ایسے ہی، فرینڈز گیٹ نو گیدر کر رہی ہیں۔“

”پھر کبھی چلی جانا۔ ابھی بیٹھو۔“ وہ حکم دے کر جیسے کچھ اور سننے کے موڑ میں نہ تھا۔
وہ مسکراہٹ دبائے اندر بیٹھی اور دروازہ بند کر دیا۔

وٹھا سکریں کے اس پار وہ لنگڑاتی، سیاہ قام لڑکی دور ہوتی جا رہی تھی۔ محمل کو نہیں علم تھا کہ وہ اسے اس ادا سُچ میں آخری بار دیکھ رہی ہے۔ اس کا نام کیا تھا، وہ کدھر سے آئی تھی، وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ مگر اس لمحے اسے جاتے دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ لڑکی بس اشاپ پر بس پکڑنے نہیں آتی تھی، بلکہ وہ تو شاید اس کے لئے آتی تھی اور شاید اس کے بس پکڑ لینے کے بعد یونہی چلی جاتی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں فواد بھائی؟“ فواد نے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ پوچھ بیٹھی۔

”تم مجھے بھائی کہتا چھوڑ نہیں سکتی؟“

”وہ کیوں؟“ دھڑکن بے ترتیب ہوئی مگر بظاہر وہ سادگی سے بو لی تھی۔

”ایسے ہی.....“

”پہم جا کہاں رہے ہیں؟“

”آفس۔ بتایا تو تھا۔“ اسٹرینگ پر ہاتھ رکھے ذرا سا چہرہ اس کی طرف موڑا اور مسکرا یا۔

”آفس؟“ اب کے وہ واقعی حیران رہ گئی۔ ”مگر آغا جان نے تو منع کر دیا تھا۔“

”ان سے تو میں نے رسما پوچھا تھا۔“ وہ لاپروا تھا۔

”اور حسن بھائی نے بھی.....“

”جہنم میں گیا حسن۔ تم آفس جانا چاہتی ہو یا نہیں؟“

”جانا چاہتی ہوں۔“ اس کے بگڑنے پر وہ جلدی سے بولی۔
وہ کھل کر مسکرا دیا۔

”ایے ہی اعتماد سے زندگی گزاروگی تو خوش رہوگی، ورنہ لوگ تمہیں ہضم کر جائیں گے۔
زندگی سے اپنا حصہ وصول کرنا سیکھو، لڑکی!“ وہ بہت موڑ میں ڈرائیور رہا تھا، اور وہ یک
ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے تو کچھ بھی نہ کرتا پڑا تھا، اور قسمت اس پر مہربان ہو گئی
تھی۔

”اور یہ جوڑا جو تم نے پہن رکھا ہے، غالباً میں چھپلے دو سال سے دیکھ رہا ہوں۔“
”تین سال سے۔“ اس نے فتح کی۔

”ایمیز نگ! یہ تمہاری کرزز تو تین بار سے زیادہ ایک جوڑا نہیں چلا تھیں اور تم!“
”یہ تین سال پہلے عید پر بنوایا تھا۔“ محمل نے گرتے کے دامن پر ہاتھ پھیر کر بغور
اسے دیکھا۔ ”میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ نئے جوڑے بنو سکوں۔ آغا جان تو
بس عید کے عید کپڑوں کے پیسے دیتے ہیں۔“ اس کا جانے کیوں دل بھر آیا تھا۔ آنکھوں
سے دموجی مولیٰ آنسو چھپلے تھے۔

”ارے نہیں محمل! ایسے نہیں روتے۔“ اس کے رو نے پر وہ پریشان سا ہو گیا اور
گاڑی سائیڈ پر رک لی۔ ”میرا مقصد تمہیں ہرث کرتا نہیں تھا۔ اور جب تک میں ہوں،
تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔“

اس نے سراٹھا یا۔ کانچ سی بھوری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

”اور ابھی آفس نہیں جاتے، جناح پر چلتے ہیں، وہاں سے تمہارے لئے ڈینر اسٹر
دیز لیں گے۔ تم بہت خوب صورت ہو محمل! تمہیں خوب صورت چیزیں ہی پہننا چاہئیں۔“
وہ اس کے بہت قریب تھیں۔ ما کپڑہ رہا تھا، پھر چونکا اور، اسی درست ہو کر انگلیشن میں چاہی
گھمائی۔

وہ سر جھکائے، ہتھی کی پشت سے بھیکے رخسار گز نے لگی۔ ایک دلفریب مسکراہٹ
اس کے لبوں پر بکھر گئی تھی۔ اگر جوتائی اماں کو پڑے چلتے کہ ان کا یہ دلی عبد میرے
آنسوؤں کی اتنی پروا کرتا ہے تو کتنا مزا آئے۔

فواد ترپ کا وہ پتا تھا، جس کے ذریعے اسے ان سب ظالم لوگوں سے انتقام لیتا تھا۔ وہ اسے ڈینز ائر آؤٹ لس پر لے گیا۔ محمل ایک دو دفعہ ہی ندا، سامیہ وغیرہ کے ساتھ ادھر گئی تھی۔ رنگوں، خوبصورات اور خوابوں کی سرز میں، چکتے سنگ مرمر کے فرش اور قیمتی ملبوسات... اسے لگا، وہ کسی خواب میں چل رہی ہے، سب کچھ بچے واقعی اس کے قدموں میں ڈھیر ہو چکا تھا۔

”آج کل ایسی شارت شرٹ کا فیشن ہے اور تم اتنی لمبی کرتیاں پہنچی ہو۔“ ایک تنقیدی نگاہ اس پر ڈال کر اس نے ایک جدید تر اش خراش کے باس کا ہینگر اٹارا اور اس کے کندھے کے ساتھ لگایا۔ ”ہوں، یہ ٹھیک ہے۔ تمہیں کیسا لگا؟“

”اچھا ہے۔“ وہ تو جیسے بول ہی نہ پا رہی تھی۔

”یہ پیک کر دیں۔“ اس نے ہینگر بے نیازی سے سیلز گرل کی طرف بڑھایا اور دوسرے ریک کی طرف بڑھ گیا۔

”سدرہ کی منگنی کے لئے بھی کوئی اچھا جوڑا تو لینا ہو گا، ہے ہا!“

”سدرہ بائی کی منگنی؟“ وہ چونکی۔

”ہاں، اس کا رشتہ طے ہو گیا ہے اور نیکست سڑے اس کی منگنی ہے۔ تمہیں نہیں پہنچتا؟“ وہ فارٹر کے ریک سے کپڑے الٹ پلت کر دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ وہ گھر میں غائب دماغ رہتی تھی، یا تائی اماں لوگوں نے خبر چھپا رکھی تھی؟ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

”یہ منگنی کے فنکشن کے لئے لے لو۔ اچھا ہے ہا!“ اس نے ایک نارمل سا جوڑا انکال کر اسے دکھایا۔ محمل اس کے قریب چلی آئی۔

لی کاک گرین رنگ کی لمبی سی سیدھی قمیض، آدمی آستینیں، ساتھ سلور چوڑی دار پائچا مامہ۔ گہری بزرگ قمیض پر بھی گلے اور دامن پر سلور موتویوں کا نازک کام تھا۔

”ٹپیکل نہیں ہے، مگر بہت کلاسک سا ہے۔ یہ بھی پیک کر دیں۔“ اس کے چہرے پر پسندیدگی دیکھ کر اس نے وہ بھی سیلز گرل کو تھما دیا۔

”بس بہت ہیں فواد بھائی! میں اتنا سب گھر میں کیسے لے کر جاؤں گی؟“ جب وہ

اگلے بوتیک کی طرف بڑھا تو اس نے گھبرا کر روک دیا۔

”واقعی، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ چلو پھر کچھ چھوٹی موٹی چیزیں لے لیتے ہیں۔“
جوتے، پرفومز، کامپیکس، جیولری اور سلوو جوڑے کے ساتھ میچنگ کانچ کی
چوڑیاں دلو اکراں کے بھرداصرار بالآخر فواد نے بس کر دی۔

”میرا دل کرتا ہے محمل! میں تمہیں پوری دنیا خرید کر دے دوں۔ پتہ نہیں کیوں۔“
وہ فرنٹ سیٹ کالاک کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا، اور وہ وہیں دروازے کے پینڈل پر ہاتھ
رسکھے گم صہمی اسے دیکھئے گئی۔ ہمیں سب تو چاہا تھا اس نے، مگر کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ یہ اتنی
آسانی سے ہو جائے گا۔

پھر وہ اسے فیکٹری لے آیا۔

”ہیڈ آفس میں پاپا اور حسن ہوتے ہیں۔ اسد پچھا اور غفران پچھا پنڈی والی برائخ
میں ہوتے ہیں، جبکہ میں فیکٹری سائیڈ پر۔ تم آج سے روزانہ ادھر میرے ساتھ کام کرو
گی۔ میں تمہیں آہستہ آہستہ سب کام سکھا دوں گا۔ ٹھیک؟“

”ٹھیک ہے، مگر میں مگر میں کیا کہوں گی؟“

”تم شوشن پڑھانے جاتی ہوئیا، تو بس تمہیں ایک شوشن اور مل گئی ہے۔ سرت چھپی کو
شاپنگ کے بارے میں بھی کہہ دینا۔ اور باقیوں کو کچھ دکھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔
راشت؟ اب چائے لوگی یا کافی؟“ وہ اپنی سیٹ سنجاتے بے نیازی سے ہدایات دے
کر فون کی طرف بڑھا تو وہ طمانیت سے مسکرا دی۔

”کافی۔“ اور اس کے مقابل کری کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”گذ۔“ وہ بھی مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے وہ بہت اچھا لگتا تھا۔

اُس روز فواد نے اسے کوئی کام نہ کرنے دیا۔ ”بس ادھر بیٹھ کر مجھے آبزرو کرو اور
سیکھو۔“ کہہ کر اسے اپنے سامنے بٹھا دیا۔ کام کرتے وہ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر اسے
مسکرا کر دیکھتا تو وہ نفس پڑتی۔

وہ دن اسے اپنی زندگی کا بہترین دن لگا تھا۔

”ایا! مجھے دوسری شوشن بھی مل گئی ہے، سو آئندہ مجھ جایا کروں گی۔“

سرت اپنے کاموں میں انجھی تھیں، سو دھیان نہ دیا اور اس نے خاموشی سے سارے کپڑے اور چیزیں الماری میں رکھ دیں۔

پھر روز کا یہی معمول بن گیا۔ نادیہ کے والد کی اکیڈمی سے اس نے مہینے بھر کی چھٹی لے لی اور صبح سے شام ڈھلنے فواد کے ساتھ فیکٹری چلی جاتی۔ اس نے آغا جان سے پیسے مانگنے چھوڑ دیئے تھے اور جب سدرہ کی مشکلی کے لئے آغا جان نے اسے کپڑے بنانے کے لئے چند سو دینے چاہے تو اس نے بے نیازی سے انکار کر دیا۔

”تحینک نو آغا جان! مگر میرے پاس پہلے ہی بہت ہیں۔ تین تین شوشنر پڑھاتی ہوں، میرے خرچے پورے ہو ہی رہے ہیں۔ پھر بھی اگر چاہئے ہوں گے تو آپ سے مانگ لوں گی۔“

آغا جان اور تائی مہتاب نے پھر کبھی اس کے شام کو گھر آنے پر اعتراض نہ کیا۔ محمل ان سے پیسوں کا مطالبہ نہیں کرتی، انہیں اور کیا چاہئے تھا۔



سیڑھیوں کے ساتھ لگے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی وہ کان میں جھکا پکن رہی تھی۔ جھکا چاندی کا تھا، اس کے سلور چوڑی دار پائچاۓ جیسا اور بزرگی پر بھی ایسا سلور کام تھا اور دوپٹہ تو یوں تھا، جیسے بزر آسمان پر نارے بکھرے ہوں۔ چھوٹی آستینوں سے اس کے گورے گداز پازو نمایاں تھے اور نازک کلاسیوں میں بھر بھر کے سلور اور بزر چوڑیاں۔ ہلکا سامیک اپ اور سنہرے بھورے بال سیدھے شانوں پر بکھرے تھے۔

جھکا کان میں جا کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پوڑیوں بھرے دونوں ہاتھوں سے جھمکے کو کان کے سوراخ میں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سب باہر لان میں جمع تھے، منگنا کا فنکشن شروع تھا اور ایک اس کی تیاری رہتی تھی۔

”آف او.....“ اس نے جھنجلا کر جھکا کان سے ہٹایا۔ کان کی لوسرخ پڑ چکی تھی۔

”اب کیا کرو؟“

اسی بدل آئینے میں اس کے پیچے فواد کا چہرہ اُبھرا۔

”فواد بھائی؟“ وہ حیران سی پڑی۔ ”آپ اوھر؟ سب تو باہر ہیں۔“

”تم بھی تو اوھر ہو۔“ وہ اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ بلیک سوت میں وہ اس کا سارٹ بندہ ہنا پلک جھکے جیسے مہوت سماں سے دیکھے چاہ رہا تھا۔ اس کی نظریں یلا ارادہ ہی جھک گئیں۔

”نم کتنی خوب صورت ہو محمل!“

محمل کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے بمشکل پلکیں اٹھائیں۔ وہ ان ہی مخور لگا ہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کی حدت سے اس کے رخسار سرخ پڑنے لگے۔

”وہ..... وہ جھکا..... پہنائیں جا رہا۔“ وہ کھرا کر جیسے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
”ادھر دکھاؤ۔“ فواد نے اس کے ہاتھ سے جھکا لیا، ذرا سا جھکا اور ایک ہاتھ سے
اس کا کان پکڑا، دوسرا سے جھکا ڈال دیا۔

”لو..... اتنی سی بات تھی اور تم نے پورا کان سرخ کر ڈالا۔“ اس نے فرم لجھ میں
کھتے، ہولے سے اس کے بھورے بالوں کو چھوا اور پھر پیچے ہٹ گیا۔ وہ بھی سنپھل کر
جھمکے کا سہارا لگانے لگی۔

ایک دم ہی فواد کچھ کہے، نباہر نکل گیا، اور وہ جو پچھلے لمبے کے فسروں میں کھوئی تھی،
چونک کر پڑی۔ وہ دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔

”یہ کیا؟“ وہ الجھ کر آئینے کی طرف پڑی تو نہ کٹ گئی۔ حسن سیر ہیوں کے اوپر کھڑا تھی
نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ گز بڑا کر جلدی جلدی بالوں میں برش پھیر کر جانے لگی، مگر حسن سیر ہیاں تیز تیز
چلانگتا نیچے آیا اور.....

”اگر آج کے بعد میں نے تمہیں فواد کے دس فٹ کے قریب بھی دیکھا تو ناگلیں توڑ
کر گھر بٹھا دوں گا، سمجھیں؟“ غصے سے اس کی کلائی پکڑ کر اس نے اتنی زور کا جھکا دیا کہ
وہ جیخ پڑی۔

”حسن بھائی.....!“

”آئی سمجھ، یا نہیں؟“ اس نے دوبارہ جھکا دے کر اس کی کلائی چھوڑی اور ایک
غصیلی نگاہ ڈال کر لبے لبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

وہ ساکتی کی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ اس نے بزر چوڑیوں والی کلائی تھامی تھی اور
آدمی سے زیادہ چوڑیاں تر تر نٹ کر گرنے لگی تھیں۔ بہت سا کافی اسے چھوڑ گیا تھا اور
جگہ جگہ سے خون کے قطرے بر سے لگے تھے۔

”یہ..... حسن بھائی..... انبیس کیا ہوا؟“ وہ دکھ سے اپنی زخمی کلائی دیکھتی رہ گئی۔
بزر کافی کے فرش پر بکھرے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

تیم ہونے کا یہ مطلب تھا کہ جس کا دل چاہے، اس پر ہاتھ اٹھائے؟..... وہ آنسو

پتی اندر لگے ذخیر کو بمشکل برداشت کا مرہم لگاتی جھک کر کانچ چننے لگی۔ دل چاہ رہا تھا کہ خوب روئے۔ مگر خود کو سنبھالے وہ دوسری چوڑیاں پہن کر باہر آگئی۔

سدرہ بڑے صوفے پر دہن کی طرح بھی سوری بیٹھی تھی۔ عام سی شکل کی سدرہ بہت میک اپ کے باوجود بھی عام لگ رہی تھی۔ اس کا منگیت قدرے موٹا تھا، اور خاصاً شرمیا ہوا بھی۔ اس میں کچھ ایسا نہ تھا کہ کوئی متاثر ہوتا۔ اور عدا اور سامیہ تو مسکرا کر دل جلنے تکرے بھی کر رہی تھیں۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ مہتاب تائی کی کسی سینڈ کزن کا بیٹا تھا۔ یہیں اسلام آباد میں ایک اچھی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ جانے کب رشتہ آیا اور ہاں ہوئی، اسے اور سرت کو تو غیر دل کی طرح خبر دی گئی تھی۔

لان میں قمقوں اور روشنیوں کی بہار تھی۔ وہ جس وقت باہر آئی تو رسم ہو رہی تھی اور سہ ہنس ایک دوسرے کو مشھائی کھلا رہی تھیں۔ سب ہنس بول رہے تھے۔

وہ خاموشی سے گھاس پر چلتی ہوئی ایک کری پہ آبیٹھی۔ اس کا دل اُداس اور آنکھیں غمگین تھیں۔

فواد بھی وہیں اشیج پر کسی کی بات پر ہستا ہوا اپنے بہنوئی کو مشھائی کھلا رہا تھا۔ محل نے ارگرد مٹلاشی نگاہوں سے دیکھا۔ اشیج کے سامنے، گھاس پر سازھی میں لمبی فضہ اپنی کسی جانے والی خاتون سے حسن کا تعارف کر رہی تھیں۔ حسن کے بازو دکو تھا میں وہ بہت خیر سے اس کے متعلق بتا رہی تھیں اور وہ مسکراتے ہوئے ان خاتون سے بات کر رہا تھا۔ اس نے بھی بلیک ڈر سوٹ پہن رکھا تھا اور بیلا شبہ وہ بہت گذل لگ رہا تھا۔

محل نے دکھ سے اسے دیکھا۔ اس پلی اسے حسن سے بڑا منافق اور دوغلائی شخص کوئی نہ لگا تھا۔ حسن نے اس کی نازک کلائی کو ہی نہیں، اس کے دل کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ سارے فنکشن کا مزاح خراب ہو گیا تھا۔ وہ اتنی بد دل اور غم زدہ بیٹھی تھی کہ احساس ہی نہیں ہوا، وہ سیم کب اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

”آج کتوں کو گرانے کا ارادہ ہے، سرکار؟“ وہ ایک دم بہت قریب آ کر بولا تو وہ اچھلی۔ وہ اپنے ازی لوفرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”بڑے لشکارے ہیں جھوٹی کزن، خیریت؟“ وہ معنی خیزی سے پھر مسکرا یا تو وہ گھبرا۔

کراٹھی اور لڑکوں کے گروپ کی طرف بڑھ گئی۔ ساتھ ہی بار بار پیچھے مذکر دیکھتی۔ وہیں ادھر ادھر گھوٹے مسلسل اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں رکھے ہوئے تھا۔

وہ بیکھتی بچاتی لوگوں میں ہی بھری رہی۔ وہ سب کمزز بہت خوش اور ایک ساتھ مکمل نظر آ رہے تھے۔ صرف وہ ایک فالتو کردار تھی۔ حالانکہ کتنی ہی عورتوں نے پوچھا تھا کہ یہ بزر اور سلور کپڑوں والی لڑکی کون ہے؟ وہ تھی ہی اتنی منفرد اور الگ۔ مگر ہر شے سے بے خبر وہ سارا وقت افرادہ ہی رہی۔

سدراہ کی منگنی پر جتنے شغل اور مزے کا اس نے سوچا تھا، اس سے بڑھ کر وہ بد مزہ ہوئی تھی۔



فواد سے آفس میں چھوٹے موٹے کام دینے لگا تھا۔ زیادہ تر اسے پر وۇن پر ہی لگاتا۔

”یہ ڈرافٹ بنانا ہے، اپنی نگرانی میں فانس کے ذاکر صاحب سے بنوالا وہ۔“

”اس چیک پر سائن کروانے ہیں، مفتی صاحب سے کروالا وہ۔“

اور یہ سارے کام بہت اعتماد طلب ہوتے تھے۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ وہ اس پر بھروسہ کرتا ہے، اس کا خیال کرتا ہے۔ دوپہر کا کھانا وہ اکٹھے ہی کھاتے۔ باقی وقت وہ اپنے آفس میں کام کرتا تو محمل اپنے کیبن میں بیٹھ کر دوسروں کا بغور مشاہدہ کرتی۔ کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی نہ تو وہ زیادہ کام کے بارے میں سمجھ پائی ہے اور نہ ہی وہ اور فواد زیادہ قریب آئے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کی پسند کی چیزیں میکھواتا، اس سے اس کی اسٹڈیز اور مشاغل کے متعلق ہلکی پھلکی گپ پشپ کرتا، مگر اس شام آئیئے کے سامنے کفرے ہو کر جھمکا پہنانے بھی بے خودی اور جرأت پھر اس نے نہیں کی تھی۔

اس روز وہ صحیح فواد کے ساتھ آفس نہیں گئی تھی۔

”دوپہر میں اسٹاپ پر آتا، میں تمہیں پک کر لوں گا۔ آج مجھے تم سے کچھ بات کرنی

ہے۔“ وہ صحیح دھیرے سے کہہ گیا تھا۔ اور اب وہ مسروری دوپھر کے انتظار میں اور پھر پہنچی چائے پی رہی تھی۔

جانے فواد کو کیا بات کرنی تھی، اتنا کیا خاص کام تھا۔ وہ نائگ پہ نائگ چڑھائے پہنچی چائے کے سپ لئتی سوچے جا رہی تھی۔ نگاہیں یونہی سامنے والوں کے لان پہ بھٹک رہی تھیں۔ وہاں گھاس پہ سفید چادریں پہنچی ہوئی تھیں اور ان پہ سفید شلوار قمیض اور ٹوپیوں والے مردے کے پچھے مل مل کر سیپارے پڑھ رہے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹی میز تھی، اس پہ ایک بڑا ساقر قرآن پاک اور کچھ سیپارے رکھے تھے۔ ساتھ ہی اگر بتیاں جل رہی تھیں۔

وہ بیٹا ارادہ ہی بڑے، بند قرآن کو دیکھئے گئے۔ ذہن کے کسی نہاں خانے سے وہ چہرہ نکل کر اس کی آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔

سیاہ قام لڑکی کا چہرہ۔ سیاہ آنکھیں اور موٹے موٹے سیاہی مائل ہونٹ۔ وہ مصحف کو سینے سے لگائے لنگڑاتی ہوئی سڑک پر ڈور جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اسے وہ منظر یاد آتا تو یوں لگتا کہ شاید..... شاید جاتے سے اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کیوں رو رہی تھی، وہ سمجھنہ پائی تھی۔

اسی طرح پچھے مل مل کر سیپارے پڑھ رہے تھے۔ اس نے دیکھا، کونے میں بیٹھے ایک پچھے نے سیپارے کا صحن اٹلتے ہوئے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دو صفحے اٹھ دیئے۔ چند لمحے بعد اس نے پھر نگاہ آس پاس گھمائی اور کسی کو متوجہ نہ پا کر تین صفحے پھر سے اکٹھے اٹھ دیئے اور پھر بلند آواز میں لہک لہک کر پڑھنے لگا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی محمل نہ دی۔ وہ چھوٹا سا پچھے اپنی دانست میں اپنے اردو گرد کے لوگوں کو دھوکا دے رہا تھا یا پھر شاید ربت کو، وہ جان نہ پائی۔

پچھے آہستہ آہستہ اٹھ کر سیپارے رکھنے لگے۔ یہاں تک کہ سارے سیپاروں کا واپس میز پر ڈھیر لگ گیا تو قاری صاحب نے قریب کھڑے ملازم کو اشارے سے اپنی طرف بلا یا۔

”قرآن خوانی ہو چکی ہے۔ بر گیڈیٹر صاحب کو بلا دستجئے کہ دعا میں شرکت کر

لیں۔” ملازم سر پلا کر اندر چلا گیا۔
وہ فواد کو بھول کر دچپی اور تجسس سے رینگ پہ جھکی ساری کارروائی دیکھنے لگی۔
چائے کا کپ اس نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔

چند منٹ بعد ملازم برآمدہ عبور کر کے لان میں اتر آیا۔ قاری صاحب جو منتظر سے
بیٹھے تھے، سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

”سر کھدہ ہے ہیں کہ وہ بزی ہیں، دعائیں شرکت نہیں کر سکتے۔ مگر آپ کاشکریہ کہ
آپ نے قرآن پڑھ دیا۔ سر کھدہ ہے ہیں کہ انہیں سکون نہیں ہے، باقی سب نحیک ہے۔
بس یہی دعا کروادیں کہ انہیں سکون مل جائے۔“

قاری صاحب نے گھری سانس لی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیے۔
وہ جیسے شاکڑ سی سارا منتظر دیکھ رہی تھی۔ دل میں نامعلوم سا افسوس اتر آیا تھا۔ ایک
عجیب سا احساسِ ندامت، عجیب سی بے کلی۔ وہ اس احساس کوئی نام نہ دے سکی تو چائے
کا کپ اٹھائے نیچے اتر آئی۔

اور پھر دوپہر تک وہ اس واقعے کو بھول بھال چکی تھی۔

اسٹاپ پہ مقررہ وقت پہ فواد کی مرشدیز آتی دکھائی دی تو وہ خوش اور پُر شوق سی بیٹھی
سے اٹھی۔

”کیسی ہو؟“ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھی تو وہ مسکرا کر جیسے بے تابی سے پوچھ رہا
تھا۔

”نحیک ہوں فواد بھائی! آپ کیسے ہیں؟“ وہ سادگی سے کہہ کر بیگ کندھے سے
اٹا کر پیچھے رکھنے لگی۔ اپنے انداز سے اس نے کبھی فواد پہ یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ اس
کے جذبات تک رسائی حاصل کر چکی ہے۔ وہ ہمیشہ خود کو اس کے احسانوں کے بوجھ تسلی
ممنون ظاہر کرتی تھی۔

”آج کا دن بہت اپیشل ہے محمل!“ وہ کار سڑک پہ ڈال کر بہت جوش سے بتا رہا
تھا۔ ”آج مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔“
”مجی، کیہے۔“

”اوہوں۔ ابھی نہیں۔ ابھی سر پر اڑنہیں کھول سکتا۔“

”اچھا، ایسا کیا ہے فواد بھائی؟“

”تم خود دیکھ لینا۔ خیر، ابھی تو ہم شاپنگ پلر ہے ہیں۔ تمہارے لئے کچھ بہت اپیشن لیتا ہے۔“

”کپڑے؟ مگر ابھی تو کوئی فنکشن قریب نہیں ہے۔“

”ہے نا۔ آج ہے۔ کچھ خاص۔“

”اچھا؟ کون کون ہو گا دھر؟“

”میں اور تم۔“ اس نے مبہم سامکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آفس میں؟“ وہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی، مگر انجمنی رہی۔

”اوہوں..... میر بیٹ میں۔ آج ہم ساتھ ڈز کریں گے۔“

”میر بیٹ؟“ لمحے بھر کو تو وہ سانس لینا بھول گئی تھی۔ میر بیٹ میں ڈز تو کیا، اس نے تو کبھی اندر سے میر بیٹ کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ لیکن پھر ڈز کا لفظ اسے ذرا سا پریشان کر گیا۔

”میں اتنی رات کو کیا کہہ کر باہر رہوں گی فواد بھائی؟“

”نہیں، ہم جلدی آ جائیں گے۔ اور آج رات میں خود تمہیں گھر لے کر جاؤں گا، سب کے سامنے۔ لیکن آف کورس تمہارے جواب کے بعد۔“

”جواب؟..... کس چیز کا جواب؟“

”کچھ پوچھنا ہے تم سے۔“

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کیا جو وہ سمجھ رہی تھی، سچ تھا؟

”مگر کیا؟“

”یہ تو وہیں بتاؤں گا۔ آؤ، کچھ کپڑے لیتے ہیں تمہارے۔“ وہ کار پارک کر کے بیٹ بیٹ ہٹا رہا تھا۔

”مگر یہ ٹھیک تو ہیں۔“ اس نے معمولی سا احتیاج کیا۔

”اوہوں..... آج تمہیں اپیشن تیار ہونا پڑے گا۔“ اس کے انداز میں زمی

دھونس تھی۔ وہ بنس کر ”اچھا“ کہتی نیچے اتر آئی۔

وہ اسے ایک خاصے مہنگے بوتیک پر لے آیا تھا۔ کپڑوں سے زیادہ، کپڑوں کی قیمتیں ہوش آزادی نے والی تھیں۔ وہ خود ہی آگے بڑھ کر کپڑے ادھر ادھر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، پھر رک کر پوچھا۔

”تمہیں سائزیاں پسند ہیں محمل؟“

”سائزیاں؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”جی مگر وہ بہت فارمل.....“

”کوئی اگر مگر نہیں۔ یہ سائزی دیکھو، کیسی ہے؟“ اس نے ایک سیاہ سائزی آگے کی۔ سیاہ شیفون کی سائزی پہ سلور مقیش بکھری تھی۔ وہ اتنی خوب صورت، جھلماٹی سائزی تھی کہ نظریں خیرہ کر دیتی۔

”اچھی ہے۔ مگر بہت قیمتی۔“

”تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ یہ پیک کر دیں۔“

پھر میچنگ جوتے اور ایک نازک سا سلور نگوں والا آرٹیفیشل لگن لیتے وقت خاصا وقت لگ گیا۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی، جب وہ جیولری شاپ میں داخل ہوئے۔ گولڈ اینڈ ڈامنڈ جیولری شاپ میں محمل کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ کیا فواد اس کے لئے کچھ اتنا قیمتی لینے جا رہا تھا؟ کیا وہ اس کے لئے اتنی خاص تھی؟

”ڈامنڈ رنگز دکھائیے۔“ وہ کرسی کھینچ کر ناگ پہ ناگ رکھے بیٹھا قدرے تحریم اور رعب سے بولا تو محمل تو سانس لینا ہی بھول گئی۔ خدا اس طرح چھپڑ پھاڑ کر بھی مہربان ہوتا ہے، اسے آج ہی پستہ چلا تھا۔

معمر، باریش سنار صاحب نے فوراً کچھ سیاہ کیس سامنے کئے اور جیسے جیسے وہ سیاہ کیس کھولتے جا رہے تھے، جگر جگر کرتی ہیرے کی انگوٹھیوں سے اس کی آنکھیں چندھیڑ رہی تھیں۔

”سر! solitaire میں دکھا دوں؟“

”ہاں، بالکل۔“

وہ تو بالکل چپ کی بیٹھی تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ری ایکٹ کس طرح کرے۔

فواد کو کوئی رنگ پسند نہیں آ رہی تھی، وہ اس سے رائے بھی نہیں لے رہا تھا۔ بس دھڑکا دھڑکا انگوٹھیاں رد کرتا جا رہا تھا۔

”یوں کرو، تم پسلے تیار ہو جاؤ، رنگ بعد میں لے لیں گے۔“ شاپ سے نکلتے ہوئے اس نے گھری دیکھی۔ ”میری چھ سے سات ایک مینگ ہے، بہت ضروری ہے، مس نہیں کر سکتا۔ چھ سے سات تمہیں میرے ساتھ آفیں میں بیٹھنا پڑے گا اور پھر سات بجے ہم اکٹھے میری بیٹ کے لئے لٹکیں گے۔ سو تم ابھی تیار ہو جاؤ۔“

”کدھر؟“ وہ واقعی حیران ہوئی تھی۔

”پارلر میں۔ اور کدھر؟ میں نے تمہارے لئے اپامکھنٹ لے لی تھی، تم صرف اندر جانا اور وہ تمہیں تیار کر دیں گی۔“

وہ اسے قربی پارلر لے آیا تھا اور پھر دیے ہی ہوا جیسے اس نے کہا تھا۔ گھض ایک گھنٹے بعد جب وہ پارلر کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی تو اسے خود پر رشک آیا تھا۔

سیاہ مقیش کی جھملاتی سازی میں اس کا دراز قد سیاہ سلوپنیل ہیل کے باعث مزید نمایاں ہو گیا تھا۔ لمبی صراحی سی گردن اوپنچے جوڑے کے باعث بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ جوڑے سے چند ایک لشیں گھنگھریاں کر کے اس کی گردن اور رخساروں پر جھول رہی تھیں۔ لاٹ پلپ اشک کے ساتھ بلیک اسموکی آئیز..... اور سیاہ بلاڈز کی چھوٹی آستینوں سے چھکلتے اس کے بے حد گور۔۔۔ سبھرے سے بازو۔ ذرا سی محنت سے وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ خود کو دیکھ کر اس کا دل نہیں بھر رہا تھا۔

وہ پاہر آئی تو وہ جو اس کے انتظار میں گاڑی سے یونک لگائے کھڑا تھا، بے اختیار سیدھا ہوا اور پھر بہوت سادیکھتا رہ گیا۔ وہ سازی کا پلپ انگلی سے پسلے اختیاط سے سیلوں کے باہر کی سڑھیاں اُتر رہی تھیں۔

”اتنی حسین ہو تم محمل؟ مجھے اتنے برس پتہ ہی نہیں چلا۔“ وہ جیسے متاسف ہوا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

”تھینک یو، چلیں؟“ اس نے آسمان کو دیکھا، جہاں شام ڈھلنے کو تھی۔

”ہاں، میری میٹنگ شروع ہونے میں زیادہ وقت نہیں ہے۔ چلو۔“ ایک بھرپور مسکراتی نگاہ اس پر ڈال کر وہ کار کا لاک کھولنے ہی لگا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔

”اس وقت.....کون؟“ کہتے کہتے اس نے اسکرین کو دیکھا اور پھر چونک کرفورا کان سے لگایا۔

”جی ملک صاحب! خیریت؟.....جی، کیا مطلب؟“ اس نے لب بھینچ کر کچھ دیر کو دوسری طرف سے سنا۔ ”مگر آپ نے ان کو بتایا تھا کہ آپ کو میں نے ہی بھیجا ہے؟.....مگر کیوں؟ انہوں نے سائیں کیوں نہیں کئے؟“ اور ایک دم اسے فواد کے چہرے پر ابھرتی غصے کی لہر دکھائی دی۔ ”آپ سینٹر آفیسر ہیں یا جو نیٹر، انہیں اس سے کیا غرض؟ آپ کو پتہ ہے ملک صاحب! اگر انہوں نے قائل سائیں نہ کی تو صحیح تک ہماری نیکٹری ڈوب جائے گی، ہم بر باد ہو جائیں گے۔“ اس نے رک کر کچھ سنا اور ایک دم جیسے بدکا۔ ”کیا مطلب؟ میں اس وقت کیسے آ سکتا ہوں، اتنی دور؟ میری میٹنگ ہے صدیق صاحب کے ساتھ، چھ سے سات۔ میں ابھی اے ایس پی صاحب سے کیسے ملنے آ سکتا ہوں؟ کیا بکواس ہے؟“ اس نے تمہل کر فون بند کر دیا۔

”کیا ہوا؟“ وہ گھبرا کر قریب آئی۔

”معلوم نہیں اب کیا ہو گا؟“ وہ پریشانی سے کوئی دوسرا نمبر پر لیس کرنے لگا، لمحے بھر کو تو وہ جیسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کھڑی ہے۔

”جی راؤ صاحب! میں نے ملک ایساں کو بھیجا تھا آپ کی طرف.....مگر راؤ صاحب! اتنی بھی کیا بے اعتباری؟“ اس نے رک کر دوسری طرف سے سنا اور پھر جیسے ضبط کرتے ہوئے بے بسی سے بولا۔ ”آپ کے اے ایس پی کا دماغ تو ثحیک ہے؟ اس کا باپ جا گیردار ہو گا اپنے گاؤں کا، ہم ان کے ہزار سعے نہیں ہیں۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ان کی ایک کال پر چلا آئے، نہ ہی.....“ وہ لمحے بھر کر کا اور پھر ”میں کچھ دیر میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ کہہ کر وہ اب کوئی اور نمبر ملانے لگا تھا۔ ”اے ایس پی ہمایوں داد، جانے کیا مسئلہ ہے اس شخص کا۔“

مholm بد دل سی اس کے ساتھ گاڑی کے باہر کھڑی تھی۔ نجانے کیا ہوا تھا، دل میں

عجیب عجیب سے وسو سے آرہے تھے۔

”خریت ہے فواد بھائی؟“

”خریت ہی نہیں ہے۔ اے ایس پی کا بچہ جان کو آگیا ہے۔ کہتا ہے، کمپنی کے مالکوں کو بھیجو تو فائل اپروو ہو گی، میں ملازموں سے بات نہیں کرتا۔ اب کس کو بھیجوں ادھر؟ وہ ابھی اسی وقت بلا رہا ہے اور اس کے گھر پہنچنے میں آغا جان یا حسن کو ڈرڈھ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔ اور اگر نہ پہنچے تو میرا کروڑوں کا پراجیکٹ ڈوب جائے گا۔“ وہ جھنجلا کر بار بار کسی کوفون ملاتا بہت بے بس لگ رہا تھا۔ ”اب یہی حل ہے کہ میں ابھی اس کے پاس چلا جاؤں اور واپس آ کر صدیقی صاحب سے میٹنگ کر لوں۔“

”اور ڈر زینفل؟“ اس کا دل جیسے کسی نے مشنی میں لے لیا تھا۔

”کرنا پڑے گا محمل!“ اس نے ہاتھ روک کر محمل کا تاریک پڑتا چہرہ دیکھا۔ ”آئیں سوری، میں یوں تمہیں ہرث نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر میری مجبوری ہے۔ وہ ملازموں سے بات نہیں کرے گا، گھر کے بندے کو ہی جانا پڑے گا۔“

”میں بھی ملازم ہوں فواد بھائی؟“ ایک خیال سا اس کے ذہن میں ابھرا۔

”کیا مطلب؟“ وہ جیسے چونکا۔

”اگر..... اگر میں آپ کے دکاموں میں سے کوئی ایک کردوں، تب تو ہم ڈر زنچ جاسکتے ہیں نا؟“ وہ پچکا کر بولی کہ کہیں وہ برانہ مان جائے۔

”اے، مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ تم بھی تو کمپنی کے اوڑز میں سے ہو، تم بھی تو یہ فائل سائنس کرو سکتی ہو۔ بلکہ یوں کرتے ہیں، تم ڈرائیور کے ساتھ فائل لے کر چلی جاؤ، جب تک میں صدیقی صاحب سے نہ لیتا ہوں، اور پھر ڈرائیور تمہیں ہوٹل لے آئے گا، نھیک؟“ اس نے منشوں میں سارا پلان ترست دے دیا۔ وہ گھری سانس بھر کر رہ گئی۔

”نھیک ہے، میں پھر چینچ کرلوں۔“

”نہیں، نہیں۔ ایسے ہی نھیک ہے۔ اس طرح تو تم واقعی کوئی پُر اعتماد ایگزیکٹو لگ رہی ہو۔ یہ ساری بزنس دیکن فارٹی ایسے ہی ڈریس اپ ہوتی ہیں۔ میں ڈرائیور کو کال

کر لوں۔“ وہ مطمئن تھا مگر محمل کو قدرے بھیج سالگ رہا تھا۔ وہ اتنی قسمی اور جملائی سازی میں کسی فناش کے لئے تیار لگ رہی تھی، کسی آفیشل معاملے کے لئے موزوں نہیں۔ لیکن اگر فواد کہہ رہا تھا تو تھیک ہی کہہ رہا ہو گا۔ یہ خیال کہ وہ ڈزر پر جا رہے تھے، اسے پھر سے ایکسا یئڈ کر گیا۔

سارا راستہ وہ پچھلی سیٹ پر ٹیک لگائے آنکھیں موندے اس ہیرے کی انگوٹھی کے متعلق سوچتی آئی تھی، جو فواد نے یقیناً لے لی ہو گی۔ اور جب وہ تائی اماں کے سامنے کھڑا ہو کر محمل سے شادی کی بات کرے گا، تب تو مانو گھر میں طوفان ہی آجائے گا۔ مگر اچھا ہے۔ ایسا ایک طوفان ان فرعونوں کو لرزانے کے لئے آنا چاہئے۔
وہ پر سکون، مطمئن اور پُر اعتماد تھی۔

گاڑی طویل ڈرائیورے عبور کر کے پورچ میں رکی تو وہ ایک ستائشی نگاہ خوب صورت سے لان پہ ڈالتی نیچے اتری۔

میں ڈور پہ ایک سو ٹینڈ بونڈ اور ہیز عرب شخص جیسے منتظر سا کھڑا تھا۔

”اے ایس پی ہمیوں داؤ د۔“ اس نے ذہن میں اندازہ لگایا اور فال مفبوطی سے پکڑے اعتماد سے چلتی ان کے قریب آئی۔

”میں آغا گروپ آف انڈسٹریز سے.....“

”جی میڈم محمل ابراہیم! آئیے، اے ایس پی صاحب اندر آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے دروازہ کھول کر راستہ دیا۔ وہ لمحے بھر کو چکچکائی اور پھر خود کو ڈپٹنے ہوئے اندر قدم رکھا۔

روشنیوں میں گھرا وہ بے حد نیک اور قیمتی سامان سے آرائی گھر اندر سے اتنا خوب صورت تھا کہ خود کو سنجیدہ رکھنے کی کوشش کرنے کے باوجود اس کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”اے ایس پی صاحب کدھر؟“

”وہ اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ اس کے آگے تیز تیز چلتے ہوئے لاونچ میں لے آیا۔ ”سرایہ پہنچ گئی ہیں۔“

اس نے لاوَنْج میں قدم رکھا تو سامنے بیٹھے شخص کو اپنی طرف متوجہ پایا۔

وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے صوفے پہ بیٹھا تھا۔ پہنڈسم مگر مفرد نقوش والا چہرہ، جیل سے بال پیچھے کئے، بلیک کوت میں ملبوس جس کے اندر سفید ثرث کے دو ہن اور پر سے کھلے تھے۔ ایک ہاتھ میں اور نج جوس سے بھرا وائے گلاں پکڑے وہ بغور اسے اندر آتے دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کو تو محمل کے قدم ڈگم گئے۔ اس کا پالا زیادہ تر گھر کے لڑکوں سے ہی پڑا تھا۔ فواد اور حسن خوش شکل تھے، کچھ دولت کی چمک دمک سے بھی اشناکش لگتے تھے، باقی اس کے بچپاؤں میں بھی کوئی اتنی متاثر کن شخصیت کا مالک نہ تھا، جتنا صوفے پہ بیٹھا وہ مفرد سادہ کھنے والا شخص تھا۔ پہنڈسم..... بے حد پہنڈسم..... اتنا وجہیہ مرد اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مرعوب ہو گئی۔

وہ خاموشی سے اسے بغور جا چکتی نگاہوں سے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ آکر سیدھی سامنے والے صوفے پہ بیٹھی اور فائل سامنے میز پر رکھ دی۔ اب اس کا اعتقاد کسی حد تک بحال ہونے لگا تھا۔

”یہ فائل اپر دکروانی تھی اسے ایسی پی صاحب!“ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے اس کے مقابل بیٹھی خاصے اعتقاد سے بولی تو وہ ذرا سما سکرایا، پھر سامنے ہاتھ باندھے کھڑے سوئٹ بوئڈ شخص کو دیکھا۔

”آن کو آغا فواد کریم نے ہی بھیجا ہے راؤ صاحب؟“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے جوس کا گلاں لبوں سے لگایا۔ محمل نے ذرا چوک کر راؤ کو دیکھا۔
وہ بھی سکرا دیا تھا۔

کچھ تھا ان دونوں کی محتی خیز مسکراہٹ میں کہ دور اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بجا۔

”تو آپ فائل اپر دکروانے آئی ہیں؟“ وہ استہزا یہ مسکراتی نگاہوں سے کہہ رہا تھا۔ محمل کو انجمن سونے لگی۔

”جی، یہ آغاگروپ آف انڈسٹری کی فائل ہے اور.....“

”اور آپ کی اپنی فائل؟..... وہ کہاں ہے؟“ اس نے گلاں سائینڈ پر رکھا اور
قدرت سے جھک کر ہاتھ بڑھا کر فائل اٹھائی۔

”میری کون سی فائل؟“ کچھ تھا جو اسے کہیں غلط لگ رہا تھا، کہیں کچھ بہت غلط ہو
رہا تھا۔

”آپ جائیں راؤ صاحب!“ اس نے فائل کے صفحے پلٹا کر ایک سرسری نگاہ ڈالی
اور پھر فائل اس کی طرف بڑھائی۔ محمل لینے کے لئے اٹھی مگر بہت تیزی سے راؤ
صاحب نے آگے بڑھ کر فائل تھامی۔ ”اور جا کر آغا فواد کے ڈرائیور کو کہیں کہ فائل
اپر ووڈ ہے، صحیح ان کو رسید مل جائے گی۔“

”بہتر سرا!“ راؤ صاحب فائل لے کر پلٹے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے دے دیں، میں لے جاتی ہوں۔“

وہ دونوں ایک دم چوٹکے تھے اور پھر رک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمایوں نے
اشارة کیا تو راؤ صاحب سر ہلا کر باہر نکل گئے۔

”آپ بیٹھئے مدام! ڈرائیور دے آئے گا۔“

ایک دم ہی اس کے کافوں میں خطرے کی گھنٹی زور زد رہے بنجنے لگی تھی۔ اسے لگا وہ
غلط وقت پر غلط جگہ اور غلط لوگوں کے درمیان آگئی ہے۔ اسے وہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔
”وہ نہیں، میں چلتی ہوں۔“ وہ پلٹنے ہی لگی تھی کہ وہ تیزی سے اٹھا اور زور سے اس کو
بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ اس کے لبوں سے جیخ نکلی۔

”زیادہ اور اسارت بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کہا جا رہا ہے، ویسے ہی کرو۔“
اس کے بازو کو اپنی آہنی گرفت میں دبوچے وہ فڑایا تھا۔ لمحے بھر کو تو زمین آسان محمل کی
نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

”چھوڑیں مجھے۔“ وہ سنجل ہی نہ پائی تھی کہ ہمایوں داؤ نے اس کی دونوں
بازوؤں کو ہاتھوں میں پکڑ کر اسے جھکا دے کر اپنے بالکل سامنے کیا۔

”زیادہ چالا کی دکھائی تو اپنے پیروں پر گھر نہیں جاؤ گی۔“

”م..... مجھے چھوڑیں۔ مجھے گھر جانا ہے۔“ محل نے اس کو پرے دھکیلنا چاہا مگر اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

”گھر جانا ہے؟..... گھر ہی جانا تھا تو یہ اتنے بناو سنگھار کیوں کئے تھے، ہوں؟“ اس نے ہولے سے اس کی ٹھوڑی کوانگلی سے اوپر کیا، دوسرے ہاتھ سے کہنی اتنی مضبوطی سے جکڑ رکھی تھی کہ وہ مل نہ پائی اور گھبرا کر چہرہ پیچھے کیا۔

”میں فنکشن پہ جا رہی تھی، آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ فواد بھائی سے میری بات کرائیں، انہیں بتائیں کہ.....“

”بھائی؟“ وہ چونکا۔ ”آغا فواد تمہارا بھائی ہے؟“

”جی..... جی..... وہ میرے بھائی ہیں، آپ بے شک ان سے پوچھ لیں۔ مجھے یہاں نہیں آتا تھا، فواد بھائی کو خود آتا تھا، مگر ان کی میٹنگ تھی۔“ وہ ایک دم رو نے لگی تھی۔ ”آپ پلیز مجھے گھر جانے دیں۔ میں غلط لڑکی نہیں ہوں، میں ان کی بہن ہوں۔“ ”جھوٹ بول رہی ہے۔“ راؤ پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ ”اسی کو ادھر آتا تھا۔ چند ہفتے پہلے تو ڈیل ہوئی تھی سر! اور اسی کے نام سے ہوئی تھی۔ کم عمر، خوب صورت اور ان چھوٹی۔ آغا نے کہا تھا، یہ ہماری ڈیماڈ پوری اُترتی ہے۔“ راؤ کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ”محل ابراہیم نام ہے تا تمہارا؟ تم آغا کی بہن کیسے ہو سکتی ہو؟ وہ تین کر دوڑ کے نفع کے پیچھے اپنی بہن کو ایک رات کے لئے نہیں بیج سکتا۔“

اس کے اروگرد جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔

اُسے بہت زور کا چکر آیا تھا۔ وہ گرنے ہی لگی تھی کہ ہمایوں نے اس کی دوسری کہنی سے پکڑ کر اسے کھڑا رکھا۔

”اب سیدھی طرح بتاؤ کہ تم ہمیں بے دوقوف بنا رہی ہو یا آغا نے تمہیں بے دوقوف بنایا ہے؟ تم محل ابراہیم ہو اور وہ فواد کریم! وہ تمہارا سگا بھائی ہے؟ اتنے عرصے سے لڑکیاں فراہم کر رہا ہے، پہلے تو کبھی اپنی بہن کا سو دا نہیں کیا۔“

”نہیں.....“ اس نے بے یقینی سے نشی میں سر ہلاایا۔ ”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ فواد بھائی میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ..... آپ میری ان سے بات

کرائیں، آپ خود ہی سن لیتا، وہ میرا دوست کر رہے ہیں، ہمیں فنکشن پہ جانا تھا۔“

ہر عام انسان کی طرح محمل کو بھی جھوٹ کی ہلکی چھلکی عادت تو تھی ہی اور اسی پر انی عادت کا کمال تھا کہ خود بخود اس کے لبوں سے ذہن کی جگہ فنکشن نکلا تھا۔ کہیں لا شور میں اسے احساس تھا کہ اگر وہ اپنے اور فواد کے خاص ڈریز کا کہتی تو وہ اسے بری لڑکی سمجھتے۔

”راو صاحب! آغا فواد کو فون ملائیں۔“

”راست سر!“ راو موبائل پر نمبر ملانے لگا۔

”اور سینکر آن رکھیں۔“ اس نے کہہ کر ایک مگری نظر محمل پر ڈالی، جو بے قرار اور ہر سال سی راؤ کے ساتھ میں پکڑے فون کو دیکھ رہی تھی۔

”جی راو صاحب!“ ایک دم کمرے میں فواد کی آواز گوئی۔ ”مال پہنچ گی؟“

”پہنچ تو گیا ہے، مگر پڑے آواز بہت دیتے ہیں۔ آپ بات کر لیں۔“ اس نے فون آگے بڑھا کر محمل کے کان سے لگایا۔

”ہیلو فواد بھائی!“ وہ روپڑی تھی۔ ”فواد بھائی! یہ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں، آپ پلیز ان کو.....“

”بکواس مت کرو اور میری بات غور سے سنو۔ تمہیں وہ ڈائمنڈ رنگ چاہئے یا نہیں؟ چاہئے ہے نا! تو جیسے اے ایس پی صاحب کہتے ہیں، کرتی جاؤ۔“

”فواد بھائی.....!“ وہ طلق کے مل چلائی۔ ”یہ میرے ساتھ کچھ غلط کر دیں گے۔“

”وہ جو کرتے ہیں، کرنے دو۔ صرف ایک رات کی ہی توبات ہے۔ اب زیادہ بک بک مت کرنا، صحیح تمہیں ڈرائیور لینے آجائے گا۔“

ساتوں آسمان اس کے سر پر ٹوٹے تھے۔ وہ ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

”صرف ایک رات کی ہی توبات ہے..... صرف ایک رات کی ہی توبات ہے۔“ اس کی آواز اس کے ذہن پر ہتھوڑے بر سار ہی تھی۔

”بس ایک ڈائمنڈ رنگ کا لارا دیا ہے اس نے تمہیں؟ اور تم تو کہتی ہو کہ وہ تمہارا بھائی ہے؟“ فون اس کے کان سے ہٹا کر بند کرتے ہوئے ہمایوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

وہ اسی طرح پتھر کا بے جان بٹ نبی کھڑی رہی۔ اس کا ذہن، دل، کان، آنکھیں، سب بند ہو چکے تھے۔

”راو صاحب! پتہ کرائیں کہ یہ واقعی فوادِ کریم کی بہن ہے یا نہیں؟ اور اس کی بات میں کتنی سچائی ہے، یہ تو ہم بعد میں خود معلوم کر لیں گے۔ شش!..... بچل!“ اس نے زور سے آواز دی۔

اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔ ساکت کھڑے وجود میں سے ہمیں ہمیں جان آہستہ آہستہ نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندر میرے باول چھانے لگے تھے۔

دو گن میں دوڑتے ہوئے اندر آئے تھے۔

”شش! اسے اوپر والے کمرے میں بند کر دو، اور وہیاں کرنا کہ بھاگنے نہ پائے۔ اور بچل!.....!“ اس سے پہلے کہ اس کا فقرہ مکمل ہوتا، محمل چکرا کر گری اور اگر اس نے اس کو دنوں بازوں سے تمام نہ رکھا ہوتا تو وہ نیچے گر پڑتی۔

”محمل!..... محمل!“ وہ اس کا چہرہ تپتیپا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اور ذہن گہرے اندر میں ڈوبتا چلا گیا۔



اُس کی آنکھوں پر نبی ذالی گئی تھی۔ گلے پن کا احساس تھا یا کچھ اور، اس نے ایک دم ہڑبرا کر آنکھیں کھولیں۔

”اٹھ جاؤ، بہت سولیا۔“ وہ گلاں ساید ٹیبل پر رکھ کر سامنے کری پر جا بیٹھا تھا۔ چند لمحے تو وہ خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی اور جب آہستہ آہستہ ذہن بیدار ہوا تو جیسے چونک کر سیدھی ہوئی۔

وہ بڑا سا پر ٹیش بیڈر دم تھا۔ قیمتی صوفے، قالین اور بھاری خوب صورت پر دے۔ وہ ایک بیڈ پر لیٹی تھی اور اس کے اوپر بیڈ کو رُلا ہوا تھا۔ سامنے کری پر وہ اکھڑے اکھڑے تپور کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

اسے یاد آیا، وہ اسے کسی کمرے میں بند کرنے کی بات کر رہے تھے، جب وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب وہ کہہ تھی؟ اور اسے کتنی دری بیت چکی تھی؟ کھر میں سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔

وہ گھبرا کر قدرے سیدھی ہو بیٹھی۔ وہ ابھی تک اسی سیاہ جملہ لاتی سازی میں لمبوس تھی اور بیویشن کی لگائی گئی ساری پنیں دیے ہی کس کے لگی تھیں۔

”میں..... میں کہہ رہوں؟..... کیا وقت ہوا ہے؟..... صح ہو گئی؟“ وہ پریشان سی ادھر ادھر دیکھنے لگی تو سامنے وال کلاک پر نگاہ پڑی۔

سازی میں تمن نہ رہے تھے۔

”ابھی صح نہیں ہوئی اور آپ وہیں ہیں، جہاں آنے کے لئے فواد نے آپ کو ذا انہنز رنگ کا لائچ دیا تھا۔“

”مجھے فواد بھائی نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ میں فائل سائیں کرو کر واپس آ جاؤں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔“

”میں کیسے مان لوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو؟ آغا فواد تو کہتا ہے کہ تم اس کے گھر میں پہنے والی ایک تیم لڑکی ہو، نہ کہ اس کی بیہن۔“

”تیم ہوں، تب ہی تو تم جیسے عیاشوں کے ہاتھ سچ ڈالا اس نے مجھے، جو میرا سما
تیاز اور بھائی تھا۔ تم سب گدھوں کا بس تیموں پر ہی تو چلا ہے۔“ وہ پھٹ پڑی تھی۔

”مجھے یہ آنسو اور جذباتی تقریریں متاثر نہیں کرتیں۔“ وہ اب اطمینان سے سگریٹ
سلکا رہا تھا۔ ”مجھے صرف سچ سننا ہے اور صحیک صحیک۔ ورنہ میں تھانے لے جا کر تمہاری
کھال اور ہیڑ دوں گا۔“

”میں جھوٹ نہیں بول رہی۔“

”مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے وہ تمہیں کتنا شیئر دیتا رہا ہے، کدھر کدھر بھیجا
ہے اس نے تمہیں؟ اور تمہارے اس گینگ میں اور کون کون ہے؟“ سگریٹ کا ایک کش
لے کر اس نے دھواں چھوڑا تو لمبے بھر کو دھوئیں کے مرغولے ان دنوں کے درمیان حائل
ہو گئے۔

”مجھے سے قسم لے لو، میں سچ.....“

”قسم لے لوں؟..... واقعی؟“

”ہاں، لے لیں۔“

”سو بندوں کے سامنے عدالت میں اٹھاؤ گی قسم؟“ وہ ٹائگ پہ ٹائگ رکھے بیٹھا
سگریٹ بیوں میں دبائے کش لے رہا تھا۔

”میں تیار ہوں، مجھے عدالت میں لے جائیں، میں یہ سب ڈھرانے کو تیار ہوں۔“

”وہ تب ہو گا، جب میں تمہارے کپھے پہ یقین کروں گا۔ یقین..... جواب بھی تک
مجھے نہیں آیا۔“ اس نے سگریٹ ایش ٹرے پہ چھکلی۔ راکھ کے چند ٹکڑے ٹوٹ کر گئے۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں، میرا کسی گینگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے فواد بھائی نے
کچھ نہیں بتایا تھا۔“

”تم اسے بچانے کی کوشش کر رہی ہو، میں جانتا ہوں۔“

”نہیں، پلیز!“ وہ لحاف اتار کر بستر سے اتری اور گھنٹوں کے مل اس کے قدموں

میں آ بیٹھی۔

”اے ایس پی صاحب!“ اس نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں لاعلم تھی کہ آپ کا کیا مقصد ہے یا فواد بھائی کا کیا مقصد ہے۔ میں میریست میں ڈنر پر جانے کے لئے تیار ہوئی تھی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ اس کی کافی سنبھالی آنکھوں سے آنسوٹ کر گرنے لگے۔ ”اللہ کی قسم! یہ سچ ہے۔“

”اللہ کی قسم کھانے کے لئے آغا فواد نے کیا پیش کیا تھا؟ ڈاکمنڈ کا سیٹ؟“ وہی شکلی پولیس آفیسر، اور مخصوص طنزیہ انداز۔ جتنا وہ شخص وجہیہ تھا، اس کی زبان اس سے بڑھ کر کڑوی تھی۔ محمل کا دل چاہا، اس کا منہ نوچ لے اور اگلے ہی بل وہ اس پر چھپی اور اس کی گروں دبوچتی چاہی، مگر ہمایوں نے اس کی دونوں کلایاں اپنی گرفت میں لے لیں۔ اسی کھلکھل میں محمل کے دوناں خون اس کے گال سے رکھ لے گئے۔

”صرف آنکھیں نہیں، تمہاری تو حرکتیں بھی بلیوں والی ہیں۔“ وہ کھڑا ہوا اور اس کو کلایوں سے پکڑے پکڑے ساتھ کھڑا کیا، پھر جھٹکا دے کر چھوڑا۔ وہ دو قدم پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

”مجھے گھر جانا ہے..... مجھے گھر جانے دو..... میں تمہاری منت کرتی ہوں۔“ وہ مڑ کر جانے لگا تو وہ ترپ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور پھر سے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”صحیح ہو گئی تو بدنام ہو جاؤں گی۔“

”میں نے کہانا تابی بی! مجھے یہ جذباتی تقریبیں متاثر نہیں کرتیں۔“ اس نے اپنے گال پر ہلکا سا ہاتھ پھیرا، پھر استہزا سیہ سکر کیا، پھر کہا۔ ”تم بہادر لڑکی ہو۔ میں تمہیں گھر جانے دوں گا، مگر ابھی نہیں۔ ابھی تم ادھر ہی رہو گی۔ کم از کم صحیح تک۔“

”میں بدنام ہو جاؤں گی، اے ایس پی صاحب! رات گزر گئی تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔“

”ہو جائے، مجھے پرواہیں ہے۔“ وہ جھک کر سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ ہاتھ جوڑے کھڑی رہ گئی اور وہ دروازہ باہر سے بند کر کے جا چکا تھا۔ دروازے کی جانب وہ پیکی اور ڈور ناٹب زور سے کھینچا۔ وہ باہر سے بند تھا۔

”دروازہ کھلوو!.....کھلوو!“ وہ دونوں ہاتھوں سے زور زور سے دروازہ بجانے لگی، مگر جواب ندارد.....وہ بے بس سی زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

فواو.....فواد اس کے ساتھ ایسا کر سکتا تھا؟ اسے یقین نہ آتا تھا۔ اس نے کیا بگاڑا تھا فواد کا، جو اس نے چند روپوں کے عوض اسے بیج دیا؟

وہ گھنٹوں پر رکھے، آنسو بہاتی، وہ شام یا وکر رہی تھی، جب وہ اسے دیکھتے چونکا تھا اور چائے کا کپ لیتے ہوئے اس کی انگلیاں اس کے ہاتھ سے مس ہوئی تھیں۔

”کم عمر، خوب صورت اور ان چھوٹی۔“ آغا نے کہا تھا۔ ”یہ ہماری ڈیماں پر پوری اترتی ہے۔“

تو وہ اس لئے چونکا تھا کہ کسی عیاش شخص کی بتائی گئی ڈیماں پر اس کے گھر میں پلنے والی وہ شیم لڑکی پوری اترتی تھی۔

”تم کتنی خوب صورت ہو محمل! مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔“ اس کے لمحے کا فسول اور پھر اس کی وہ ساری عنایتیں.....وہ جانتا تھا کہ اس کی کمزوری کیا ہے، اس نے اس کی من پسند چیزوں کی جھلک دکھائی۔ یہاں تک کہ وہ جب اس کے مکمل قابو میں آگئی تو فواد نے اسے ادھر بھیج دیا اور وہ بھی کتنی بے وقوف اور سادہ تھی، اسے پتہ ہی نہ چلا۔ وہ اس کو آفس میں ادھر ادھر چیزوں سامن کر دانے بھیج دیتا تھا، اور کوئی کام تو اس نے محمل سے لیا ہی نہ تھا، وہ تب بھی نہ سمجھ سکی۔

اور اب یہ شخص ہمایوں داؤ و.....وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ آدمی کون تھا؟ اس سے یہ سب باتیں کیوں پوچھ رہا تھا؟ اور اس کا کیا مقصد تھا؟ اسے صرف علم تھا تو اتنا کہ اگر رات بیت گئی تو صبح اسے کوئی قبول نہ کرے گا۔ اور قبول تو شاید اب بھی کوئی نہ کرے۔ کوئی فواد کے خلاف اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا، کوئی اسے بے گناہ نہ سمجھے گا۔ اور فواد، وہ تو شاید سرے سے مٹک رہی جائے کہ وہ کبھی محمل کو آفس لے کر گیا ہے۔ خدا یا! وہ کیا کرے؟ اس نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔ کمرہ قدرے دھنلا سا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں تو آنسوؤں کی وہندی بیچے رکھتی چلی گئی۔

کمرہ نہایت خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ قیمتی قالین، خوب صورت فرنچر، اور

بھاری مخملیں پر دے۔

پر دے؟..... وہ چونگی۔ کیا ان کے بچھے کوئی کھڑکی تھی؟ وہ پردوں کی طرف دوڑی اور جھٹکے سے انہیں ایک رخ کھینچا۔ پرداہ کھلتا چلا گیا۔

باہر ٹیس تھا اور اس کی روشنیاں جلی ہوئی تھیں، جن میں وہ بغیر دقت کے دگن میں چوکس کھڑے دیکھ سکتی تھی۔

اس نے گھبرا کر پرداہ برابر کیا۔

”اللہ تعالیٰ! پلیز۔“ وہ روکر دعا کرنے لگی اور جب دعا کرتے کرتے تحک گئی تو ڈرینگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اپنا عکس دیکھا۔

رونے سے اس کا سارا کاجل بہہ گیا تھا، آنکھیں متورم اور قدرے بھیاںک لگ رہی تھیں۔ جوڑا ڈھیلا ہو کر گردن تک آ گیا تھا اور گھنگھریاں لٹوں کے بل سیدھے ہونے لگے تھے۔

محمل ایک مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی۔ اس کے باوجود فواد کے اس بھیانک روپ کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ شروع میں تو اس نے ہمت ہار دی اور اعصاب جواب دے گئے، لیکن اب وہ کسی حد تک سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تھی۔ فواد سے سارے بد لے تو وہ بعد میں چکائے گی، ابھی اسے اس اکھڑا اور سردہراۓ ایس پی کی قید سے نکلنا تھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا، کچھ خاص نظر نہ آیا تو پھر واڑ روپ کھولا۔ اندر مردانہ کپڑے شنکے ہوئے تھے۔ اس نے کچھ ہینگرز الٹ پلٹ کئے اور سوچ کر ایک گرتہ شلوار نکالا۔ براؤن گرتہ اور سفید شلوار۔ سب سے پہلے اس نے سازھی کے بوجھ سے نجات حاصل کی، پھر اس گرتے شلوار کو پہن کر بال سیدھے کر کے بینڈ میں باندھے اور با تھ روم میں جا کر منہ اچھی طرح دھویا۔ باہر نکلنے کے لئے کسی روزن کو تلاشی اس کی نگاہوں کو با تھ روم کی کوئی کھڑکی دروازہ نظر نہ آیا تو ماہی سے پلنے ہی لگی تھی کہ ایک دم چونگی۔

ایک دیوار میں شیلیف تھا۔ اس میں شیپو اور شیوگنگ کا سامان رکھا تھا۔ شیلیف کا اندر سے رنگ باقی دیواروں سے زیادہ چکنا سفید تھا۔ بھلا کیوں؟

وہ قریب آئی، سارا سامان نیچے اتارا اور پھر بغور اندر دیکھتے ہاتھ پھیرا تو احساس ہوا

کہ اس خانے کے پیچے دیوار نہیں بلکہ کارڈ بورڈ کے سفید پھٹے تھے جو میخوں سے جڑے تھے۔ میخیں بیکی اور تازہ لگ رہی تھیں۔

آگے کا کام بہت آسان تھا۔ اس نے سارے غل کھول دیئے، تاکہ آواز باہر نہ جائے اور تھوڑی سی محنت کے بعد پھٹے کھنچ کر اتار لئے۔ وہ جلدی میں لگائے لگ رہے تھے، سوا سے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا۔

اس کے پیچے کھڑکی تھی۔ اچھی خاصی چوڑی تھی۔ وہ اس میں سے با آسانی گزر سکتی تھی۔ بے حد مطمئن سی ہو کر محمل نے کھڑکی کھولی اور جب باہر جہان کا تو ایک لمبے کوسر چکرایا۔ کھڑکی سے دو فٹ کے فاصلے پر دیوار تھی۔ گھر کی چار دیواری کی کھڑکی اور چار دیواری کے درمیان صرف خلا تھا اور نیچے، بہت نیچے پکا فرش تھا۔ وہ اس گھر کی غالباً تیسری منزل پر موجود تھی۔ شاید اسی لئے انہوں نے کچے کچے پھٹے لگا دیئے تھے، انہیں اندازہ ہوگا کہ وہ یہاں سے نہیں نکل سکتی۔

اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔ یہ آخری راستہ بھی بند ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ ماہیوں سی ٹل بند کر کے کھڑکی بند کرنے ہی لگی تھی کہ سنائی میں ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔

”آپ صحن میں کیا کر رہی ہیں؟“

”بس یونہی، تجوید کی پریکش کر رہی ہوں۔“

لڑکیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں، بہت قریب تو نہیں بہت دور بھی نہیں تھیں۔ وہ چونکی اور پھر باتھر دم کی لائٹ بند کی۔

باہر کا منظر قدر سے واضح ہوا۔ کھڑکی سے دیوار کا فاصلہ دو فٹ کا تھا، مگر وہ دیوار کی منڈیر تھی اور وہ آوازیں کہیں نیچے سے نہیں، برابر سے آ رہی تھیں۔ بالکل برابر سے۔ یعنی اس باتھر دم کے برابر سامنے کا صحن تھا۔

اگر وہ یہ دیوار پھاند جائے تو.....؟

اس اچھوتے خیال نے ذہن میں سراخایا تو اس نے جوتے اتارے اور نیچے جہان کا۔ اگر گر گئی تو نہیں پہنچے گی۔ مگر موت اس ذلت سے تو بہتر ہو گی، جو صحیح یا اس سے بھی بدیر گھر پہنچنے پر اسے اٹھانی پڑے گی۔

اس نے دونوں ہاتھ چوکھت پر رکھے ہی تھے کہ کمرے کا دروازہ کسی نے زور زور سے کھلکھلایا۔ دروازے کی وہ اندر سے کنڈی لگا چکی تھی، سو وہ کھولنے پار ہے تھے۔ یقیناً کسی نے پہنچنے کا کھاڑنے کی آواز سن لی تھی وہ لمبے بھر کو بھی نہ گھبرائی اور ہاتھ بڑھا کر دیوار کو شو لا۔ وہ قریب ہی تھی۔

”اللَّهُمَّ...أَوْنِبُونَ...” برابر والے صحن میں وہ کھنکاری تھی، اگلے لمبے اس کی مدد مگر ہلکی آواز اندھیری فضائیں گو نجخے لگی۔

”اللَّهُمَّ جَعْلْ فِي قَلْبِي نُورًا“ (اے اللہ! میرے دل میں نور ڈال دے)

محمد نے دیوار پر دونوں ہاتھ رکھے اور نیچے دیکھے بغیر پاؤں بھی اوپر رکھ دیا۔

”وَفِي بَصَرِي نُورًا وَفِي سَمْعِي نُورًا“ (اور میری بصارت و سماعت میں نور ہو) گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کی طرح سے وہ دیوار پر پیٹھی اور نیچے دیکھا۔ صحن کی زمین بہت قریب تھی۔ دیوار چھوٹی سی تھی۔

”وَعَنْ يَمِينِي نُورًا وَعَنْ يَسَارِي نُورًا“ (اور میرے دائیں اور بائیں جانب

نور ہو)

اس نے آہستہ سے دونوں پاؤں زمین پر رکھے۔ وہ بالآخر برابر والوں کی چھت پر اتر آئی تھی۔ لمبے بھر کو وہ بے یقین سی پیٹ کر دیوار کو دیکھنے لگی، جس کے پار اے ایس پی ہمایوں داؤ د کا گھر تھا بلکہ قید خانہ۔ جس سے وہ نکل آئی تھی۔ اسی پل دیوار کے پار سے روشنی سی چکی۔ یقیناً کسی نے با تھر روم کی لائٹ جلائی تھی۔

اپنی بے دوقنی پے اسے غصہ آیا۔ اسے با تھر روم کا دروازہ بند کر کے ٹل کھول کر آنا چاہئے تھا۔ مگر عادی فراری تو نہ تھی، یا پھر اس لڑکی کی آواز کے فسروں میں ایسی کھوئی تھی کہ ہوش نہ رہا تھا۔

”وَفَوْقِي نُورًا وَتَحْتِي نُورًا“ (اور میرے اوپر اور نیچے نور ہو)

سامنے ایک برآمدہ تھا جس کے آگے گریل لگی تھی۔ گریل کا دروازہ کھلا تھا اور دروازے سے کافی دور ایک لڑکی پیٹھی، گریل سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کئے گنگا رہی تھی۔

”وَأَمَامِي نُورًا وَخَلْقِي نُورًا“ (اور میرے آگے پیچھے نور ہو) وہ دیوار کے ساتھ گھننوں کے مل رینگتی گرل تک آئی۔ وہ لڑکی دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی مناجات میں گم تھی۔

”وَاجْعَلْ لِي نُورًا“ (اور میرے لئے نور بنادے)

محمل چپ چاپ کھلے دروازے سے اندر رینگ گئی۔ لڑکی اسی طرح مگن سی تھی۔

”وَفِي لِسَانِي نُورًا وَعَصْبِي نُورًا“ (اور میری زبان واعصاب میں نور ہو) اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا۔ لمبا سا برآمدہ خالی تھا۔ بس دور ایک فرتج پڑا تھا اور اس کے ساتھ جالی دار الماری تھی۔ اندر میرے میں مدھم چاندنی کے باعث اسے اتنا ہی نظر آیا تھا۔ وہ بہت آہستہ سے اٹھی اور دبے پاؤں فرتج کی طرف بڑھی۔

”وَلَحْيِي نُورًا وَدَمِي نُورًا“ (اور میرے گوشت اور لہو میں نور ہو)

فترج اور الماری کے درمیان چھپنے کی جگہ تھی، وہ جھٹ ان کے درمیان آئی تھی، مگر سامنے ہی دروازہ تھا۔ وہ لڑکی واپس آتی تو سیدھی اس پر نگاہ پڑتی۔ نہیں، اسے یہاں چھپنے کے بجائے نیچے جانا چاہئے۔

”وَشَغْرِي نُورًا وَبَشَرِي نُورًا“ (اور میرے بال اور کھال میں نور ہو)

اندر جانے والا دروازہ بند تھا۔ اگر اسے کھلوتی تو آواز باہر جاتی۔ وہ پریشان سی کھڑی ہوئی۔ تب ہی جالی دار الماری کے پینڈل سے کچھ لٹکتا نظر آیا۔ اس نے جھپٹ کر وہ اٹا را۔ وہ سیاہ جارجٹ کا لبادہ تھا۔

اس نے چاند کی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا چاہا۔

”وَاجْعَلْ فِي نَفْسِي نُورًا“ (اور میرے نفس میں نور ہو)

باہر وہ بے خبری ابھی تک دعا پڑھ رہی تھی۔

اس نے لبادہ کھولا۔ وہ سیاہ عبایا تھا اور ساتھ ایک گرے اسکارف۔ محمل نے پھر کچھ نہیں سوچا اور عبایا پہننے لگی۔ تمہی اسے احساس ہوا کہ وہ مردانہ گرتہ شلوار میں کھڑی ہے اور ننگے پاؤں ہے۔ وہ عبایا بھی اسے غنیمت لگا تھا۔

”وَأَعْظُمُ لِي نُورًا“ (اور میرے لئے نور بڑھا دے)
اسکارف کو اس نے بمشکل چہرے کے گرد پیٹا۔ عادت نہ تھی تو مشکل لگ رہا تھا۔
اب اسے کسی طرح نیچے جا کر سڑک تک پہنچا تھا، آگے اپنے گھر کا راستہ تو آنکھیں بند کر کے بھی آتا تھا۔

”اللَّهُمَّ أَغْطِنِي نُورًا“ (اے اللہ! مجھے نور عطا کر)
وہ اسی ترجمہ میں پڑھ رہی تھی۔ محمل تیزی سے عبایا کے بیٹھنے بند کر کے، سکارف پر ہاتھ پھیر کر درست کر رہی تھی کہ ایک دم اسے بہت خاموشی لگی۔
باہر چکن بہت چپ سا ہو گیا تھا۔ شاید اس لڑکی کی دعا ختم ہو گئی تھی۔
اس نے قدرے گھبراہٹ، قدرے جلد بازی میں تیزی سے دروازہ کھولنا چاہا، اسی پلے اس لڑکی نے پچھے گریل کی چوکھٹ پر قدم رکھا۔
”السلام عليکم..... کون؟“ چونکی سی آواز اس کے عقب میں ابھری تو اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ دروازے پر ہاتھ رکھ کر رکھے، وہ گھری سانس لے کر پڑی۔
وہ سامنے شلوار قمیض میں لمبیوس، سر پر دو پٹہ لپیٹے، ہاتھ میں کتاب پکڑے، ابھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

محمل کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ جانے اب کیا ہو گا؟
”وہ میں، آپ کی آوازن کر آئی تھی۔ بہت اچھی تلاوت کرتی ہیں آپ۔“
”تلاوت نہیں..... وہ دعائے نور تھی۔ میری آواز نیچے تک آ رہی تھی کیا؟“ لڑکی کا انداز سادہ مگر محتاط تھا۔ محمل کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے کسی طرح اس لڑکی کو باتوں میں الجھا کروہاں سے نکلنا تھا۔ ایک دفعہ وہ سڑک تک پہنچ جائے تو آگے گھر کے تمام راستے اسے آتے تھے۔

”خوب صورت آواز ہر جگہ پہنچ جاتی ہے، میں تلاوت سمجھ کر آئی تھی، معلوم نہ تھا کہ آپ دعا مانگ رہی ہیں۔“

”آپ نے بتایا نہیں آپ کا نام؟“
شانگی سے کہتی وہ لڑکی دو قدم آگے آئی تو گریل سے چمن کر آتی چاندنی میں اس کا

چھرہ واضح ہوا۔

چکنی سپید رنگت، بے حد گلابی ہونٹ اور بادامی آنکھیں، جن کی رنگت سنہرے پکھراج کی سی تھی۔ ”گولڈن کرشنل؟“ یہ لفظ محمل کے ذہن میں آیا تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی وہ مجھے بھر کو چونکی تھی۔ بہت شدت سے محمل کو احساس ہوا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو پہلے کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہیں بہت قریب۔ ابھی سچھہ وقت پہلے۔ اس کے نقش نہیں، یہ وہ بھوری سنہری آنکھیں تھیں جو شناسا تھیں۔

”میں محمل ہوں۔“ جانے کیسے لوں سے پھسل پڑا۔ ”مجھے دراصل راستے نہیں معلوم، تو بھلک جاتی ہوں۔“

”اوہ..... آپ ہائل میں نئی آئی ہیں؟ خوکمر ہیں؟“

اور اسے امید کا ایک برا نظر آگیا۔ وہ شاید کوئی گرلاز ہائل تھا۔

”میں، میں شام میں ہی آئی ہوں۔ خوکمر! اوپر آ تو گئی ہوں مگر نیچے جانے کا راستہ نہیں مل رہا۔“

”نیچے آپ کے رومز تھرڈ فلور پہ ہی ہیں تا، پھر نیچے..... اوہ آپ تجد پڑھنے کے لئے اٹھی ہوں گی یقیناً۔“ وہ خود سے ہی کہہ کر مطمئن ہو گئی۔ ”میں بھی تجد کے لئے نیچے میں جا رہی ہوں، آپ میرے ساتھ آ جائیں۔“ Prayer Hall

اس لڑکی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”میں فرشتے ہوں، آ جائیں۔“ وہ دروازہ دھکیل کر آگے بڑھ گئی تو محمل بھی متذبذب سی پیچھے ہو لی۔ سامنے سنگ مرمر کی طویل راہداری تھی۔ دائیں طرف اوپنجی کھڑکیاں تھیں، جن سے چھمن کر آتی چامدی سے راہداری کا سفید مرمریں فرش چک اٹھا تھا۔ فرشتے راہداری میں آگے تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔

وہ ننگے پاؤں اس کے تعاقب میں چلنے لگی۔ مردانہ کھلے پاچھے اس کے پاؤں میں آ رہے تھے، مگر اوپر عبا یا نے ڈھانپ رکھا تھا۔

راہداری کے اختتام پہ بیڑھیاں تھیں۔ سفید چمکتے سنگ مرمر کی بیڑھیاں جو گولائی میں نیچے جاتی تھیں۔ اس نے ننگے پاؤں زینے پر رکھے۔ رات کے اس پھر زینوں کا

سنگ مرمر بے حد سرد تھا۔ نیچے ٹھنڈا۔ وہ محسوس کئے بغیر تیز تیز سیرھیاں اُترنے لگی۔
تین منزلوں کے زینے ختم ہوئے تو سامنے ایک کشادہ برآمدہ تھا۔ برآمدے کے
آگے بڑے بڑے سفید ستون تھے اور سامنے لان نظر آتا تھا۔ بلکی چاندنی میں برآمدہ نیم
تاریک سالگ رہا تھا۔

ایک کونے میں چوڑی، بے حد چوڑی سیرھیاں نیچے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔
فرشتے ان سیرھیوں کی طرف بڑھی تو لمبے بھر کو تو اسے خوف آیا۔ وہ بے حد چوڑی
سیرھیاں خاصی نیچے تک جا رہی تھیں۔ مدھم چاندنی میں چند زینے ہی دیکھتے تھے، آگے
سب تاریکی میں گم تھا۔ جانے کیا تھا نیچے؟

فرشتے کے پیچے وہ سچ کر نیم تاریک زینے اُترنے لگی۔ بہت نیچے جا کر فرش
قدموں تلے آیا تو محسوس ہوا کہ نیچے زم ساقالیں تھا، جس میں اس کے پاؤں وہنہ گئے
تھے۔ وہ ایک بے حد طویل و عریض کرے میں کھڑی تھی۔ وہ کدھر شروع، کدھر ختم ہوتا
تھا، کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ ادھر ادھر گردن گھماتی، اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

فرشتے نے دیوار پہ ہاتھ مارا۔ ٹھنڈے دبانے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمبے جیسے پورا
آسمان روشن ہو گیا۔ محمل نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

وہ ایک بہت بڑا سا ہال تھا۔ چھت گیر فانوس اور اسپاٹ لائش جگہاں تھیں۔ ہال
چھو اوپر ستونوں پہ کھڑا تھا۔ بے حد سفید ستون، سفید دیواریں، روشنیوں سے جگہاں
اوپری چھت اور دیواروں میں اوپری گلاس وندوز۔

”وضو کی جگہ وہ سامنے ہے۔“ فرشتے نے اپنے دوپٹے کو پن لگاتے ہوئے ایک
طرف اشارہ کیا تو وہ جیسے چونکی، پھر سر ہلا کر اس طرف بڑھ گئی۔

وضو کی جگہ نیم تاریک تھی۔ سنگ مرمر کی چوکیاں اور سامنے ٹوٹیاں۔ ایک ایک
ٹائل چک رہا تھا۔ وہ ہر شے کو ستائش سے دیکھتی ایک چوکی پہنچی اور جھک کر ٹوٹی
کھولی۔

فواد اور وہ ایسے ایسے پی..... محمل ابراہیم کو سب فراموش ہو چکا تھا۔

”سنوا!“ کھلے دروازے سے فرشتے نے جہان کا۔ ”بسم اللہ پڑھ کر وضو کرنا۔“

محمل نے یونہی سر ہلا دیا اور پھر اپنے گیلے ہاتھوں کو دیکھا، جن پر ٹوٹی سے پانی نکل کر پھسل رہا تھا۔ وہ سر جھنک کر وضو کرنے لگی۔

فرشتے جیسے اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

محمل اس کے برابر نماز کے لئے کھڑی ہو گئی۔ شاید تجدید پڑھنی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھائے تو رات بھر کے تمام مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے۔ درد کی ایک تیز لہر سینے میں آٹھی تھی۔

دھوکا دہی، اعتماد کا خون، فراڈ، بے وقوف بنائے جانے کا احساس..... کیا کچھ فواد نہ نہیں کیا تھا اس کے ساتھ؟ وہ کس کس کا ماتم کرتی؟

سلام پھیر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ساری عمر کی محرومیاں اور نارساںیاں سامنے آنے لگیں۔

”میں کیا مانگوں؟ ما نگنے کی ایک طویل فہرست ہے میرے سامنے۔ مجھے کبھی وہ نہ ملا جس کی میں نے تمنا کی تھی، جو ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے انسان کے پاس ہونا چاہیے۔ مجھے کبھی بھی وہ نہ ملا جو لوگ جمع کرتے ہیں۔ کیوں؟..... کیوں میرے پاس وہ سب نہیں ہے جو لوگ جمع کرتے ہیں؟“

اور جب دل نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر آنسو خشک کئے اور سر اٹھایا۔

سامنے ہال کے سرے پر ایک بڑا سا اشیج بنا تھا۔ درمیان میں میز اور کرسی رکھی تھی، ایک طرف فاصلے پر ڈائس بھی رکھا تھا۔ شاید وہاں درس و تدریس کا کام بھی ہوتا تھا۔

کرسی کے پیچھے دیوار پر ایک بے حد خوب صورت خیالی سے ہر یہ فرمی آؤزیں تھا۔ اس پر وہ سرسری سی نگاہ ڈالتی یک دم خشک کر رکی۔

خوب صورت عربی عبارت کے نیچے اردو میں خوش خط لکھا تھا۔

”پس لوگوں کو چاہئے کہ اس پر خوشی منائیں۔ قرآن ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ جمع کر رہے ہیں۔“ (یونس: 58)

وہ یک لخت چونگی۔

”کیا دیکھ رہی ہو محمل؟“ فرشتے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہی کہ میں نے بھی ایسا ہی کچھ سوچا تھا، جو ادھر لکھا ہے۔ کتنا عجیب اتفاق ہے نا۔“

”اتفاق کی کیا بات ہے؟ یہ فرمیں اسی لئے تو ادھر لگا تھا، کیونکہ تم نے آج صحیح یہاں بھی بات سوچنی تھی۔“

”مگر فرمیں لگانے والے کو تو علم نہیں تھا کہ میں یہی سوچوں گی۔“

”لیکن اس آیت کے اشارے والے کو تو تھا نا۔“

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“

”جس نے قرآن اشارا ہے، وہ جانتا ہے کہ تم نے کب کیا سوچتا ہے، اور یہ تمہاری سوچ کا جواب ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے شانے اپکائے۔ ”میری سوچ کا اس سے کوئی تعلق نہیں، میں تو بہت کچھ سوچتی رہتی ہوں۔“

”مثلا کیا؟“ وہ دونوں دوز انو ہو کر بیٹھی تھیں اور فرشتے بہت نزی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہی کہ اچاک کسی بے قصور انسان پر خواخواہ مصیبت کیوں آ جاتی ہے؟“

”وہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے، ہم قطعاً بھی بے قصور نہیں ہوتے محمل!“

”غلط..... بالکل غلط۔ میں نہیں مانتی۔“ وہ جیسے بھڑک اٹھی۔ ”ایک لڑکی کو اس کا سگا تایا زاد پروپوز کرنے کے بہانے ڈزر کا جہانسہ دے کر، اسے خوب بخنے سنونے کا کہہ کر، اپنے کسی عیاش دوست کے گرفتے جا کر ایک رات کے لئے بیچ آئے، یہ خواخواہ کی مصیبت، خواخواہ کا ظلم نہیں ہے کیا؟“

”نہیں۔“

”نہیں؟“ محمل نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔

”ہاں، قطعاً نہیں۔ اسی صورت حال سے بچنے کو تو اللہ تعالیٰ نے اسے بہت پہلے ہی سب بتا دیا تھا۔ یقیناً اس لڑکی کو یہ تو علم ہو گا کہ اسے ایک ناممکن کے لئے تیار نہیں ہوا چاہئے۔ کزن بھی تو ناممکن ہے اور اسے یہ بھی پتہ ہو گا کہ اسے اپنا جسم اور چہرہ اس طرح ڈھکنا چاہئے کہ کسی ناممکن، بالفرض اس کے کزن کو، کبھی علم ہی نہ ہو سکے کہ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ وہ اسے ”بیچنے“ کا سوچے۔ اب بتاؤ، یہ ظلم ہے یا اس کے ہاتھوں کی کمائی؟“

وہ دھوال دھوال ہوتے چہرے کے ساتھ پنا پلک جھپکے فرشتے کو دیکھ رہی تھی، جو سر جھکائے دوز انوپیشی آہنگی اور زیستی سے کہہ رہی تھی۔

”اور یقیناً اپنے کزن کے دھوکے میں آنے سے قبل کسی نے اللہ کے حکم سے اسے خبردار ضرور کیا ہو گا۔ اس کے خمیر نے یا شاید کسی انسان نے۔ مگر اس نے پھر بھی نہیں سنا اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اسے عزت اور حفاظت سے رکھے، یہ تو اللہ کا بہت بڑا احسان ہے، آؤٹ آف دی وے فور ہے۔ ہم اتنے بے قصور ہوتے نہیں ہیں محمل! جتنا ہم خود کو سمجھتے ہیں۔“

وہ کہے جا رہی تھی اور اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔

پچاؤں کا قطعیت سے فواد کو محمل کے آفس میں کام کرنے سے منع کرنا..... حسن کے الفاظ..... اور وہ تعبیر جو سدرہ کی میکنگی والے روز اس نے کی تھی۔

اس نے اپنی دائیں کلائی دیکھی۔ اس پر ادھ مندل ہوئے زخم کے نشان تھے۔ ہاں، حسن نے اسے خبردار کیا تھا۔

”میں..... فرشتے میں!..... واقعی مجھے.....“

”اپنی نادانخوں پر کسی کو گواہ نہیں بناتے محمل!..... چلو جر کی اذان ہو رہی ہے۔ نماز پڑھتے ہیں۔“

وہ سادگی سے کہتی پھر سے کھڑی ہو گئی تھی، مگر محمل اپنی جگہ سے مل نہ پائی۔

آگئی کا آئینہ بہت بھی ایک تصور پیش کر رہا تھا۔ اسے ایک ایک کر کے تمام باتیں

پھر سے یاد آنے لگیں۔ فرشتے نجیک کہہ رہی تھی۔ سب سے زیادہ قصور تو خود اسی کا تھا۔ وہ آخر فواد کی گاڑی میں بیٹھی ہی کیوں تھی؟ اس نے دل اور مصحف میں سے دل کا انتخاب کیوں کیا تھا؟

اس نے بھیگی آنکھیں اٹھائیں۔ فرشتے اسی سکون سے رکوع میں کھڑی تھی اور سامنے وہی الفاظ چمک رہے تھے۔

”قرآن ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ جمع کر رہے ہیں۔“
اس کا دل رو دیا تھا۔

کیسے ڈھنائی سے اس نے اس سیاہ قام لڑکی کو اس کا مصحف واپس کیا تھا۔ اس سے اس کی آواز میں کیسی بے رنج تھی۔

ٹی وی پر اذان لگتی یا علاوت ہوتی تو وہ چینل بدل دیا کرتی تھی۔ یہ آواز کانوں پر بوجھ لگتی تھی۔ سیپارے پڑھنا کتنا کٹھن لگتا تھا اور فجر تو سوائے پیپرز کے، اس نے کبھی نہ پڑھی تھی۔ اب وہی فجر پڑھنے کے لئے وہ فرشتے کے برابر کھڑی تھی۔

”مرے اللہ تعالیٰ! مجھے گھر واپس پہنچا دے۔“ وہ پھر سے رو دینے کو تھی۔ ”مجھے تیری قسم، میں پھر کبھی فواد بھائی کے ساتھ کبھی تھا، کبھی ان کو اکیلے نہیں ملوں گی۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ آئی سویر؟“

دعا مانگ کر قدرے پر سکون ہوئی تو چہرے پر ہاتھ پھیر کر اٹھی۔

”ایک بات پوچھوں فرشتے؟“ وہ دونوں ساتھ ساتھ ہال کی سیرھیاں چڑھ رہی تھیں۔

”پوچھو؟“

”قسم کھانے سے اللہ مان جاتا ہے؟“

”قسم ناپسندیدہ چیز ہے، یہ مقدر نہیں بدلتی۔ جو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔“

”اور اگر قسم کھائی جائے تو؟“

”تو مرتے وقت تک اس کو بھانا پڑتا ہے۔“ آخری سیرھی چڑھتے فرشتے دراہی چوکی۔ ”کوئی الٰہ سیدھی قسم مت کھانا کہ یہاں سے رہائی بلنے پر تم فلاں اور فلاں کام

کرو گی۔“

”رہائی؟“ برآمدے کی چوکھت پار کرتے محمل گڑ بڑا گئی۔ دل زور سے دھڑکا۔

”ہاں، تمہیں گھر جانا ہے نا۔ میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔“ وہ ساکت سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

”زک کیوں گئیں؟ آؤ نا۔“

”آپ کو..... آپ کو کیسے پتہ چلا؟“

”بات یہ ہے محمل! کہ اول تو تہجد کے وقت یہاں ہماری مسجد میں کوئی عبایا چکن کر نہیں گھومتا، دوم یہ کہ تم نے میرا عبایا اور اسکارف چکن رکھا ہے۔ اور سوم، میں نے تمہیں صحن پھلانگتے دیکھ لیا تھا۔“

محمل نے بوکھلا کر اپنے جسم پر موجود عبایا کو دیکھا، جس سے لمبی مردانہ شلوار کے پانچے ذرا ذرا سے جھامک رہے تھے۔

”وہ..... دراصل.....“

”ہمیوں کے باتحدروم کی کھڑکی ہماری چھت پر کھلتی ہے۔ اس نے تمہیں باتحدروم میں بند کر دیا تھا؟ میں اس سے بات کروں گی، اسے ایسے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تھوڑا سا خشک مزاج ہے، مگر دل کا برا نہیں ہے۔ آوا!“ پھر اس کی شاکذ شکل دیکھ کر وضاحت کی۔

”ہمیوں میرا فرسٹ کزن ہے، وہ برا آدمی نہیں ہے۔ آوا!“

اسی پل گیٹ کسی نے زور سے بچایا۔ ساتھ ہی بیل بھی دی۔ فرشتے نے گہرے سانس لی۔ ”آواڑ کی!“ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ تک لا لی۔ پھر ہاتھ چھوڑ کر دروازہ کھولا۔

”فرشتے! اوہر وہ.....“ باہر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

”السلام علیکم! اور یہ کیا غلط حرکت ہے؟ تمہیں مسئلہ اس کے کزن کے ساتھ ہے۔“ اس کو باتحدروم میں کیوں بند کیا تھا؟“

”بالکل صحیک کیا تھا، ہے کدھر وہ؟“ وہ جواباً بگز کر بولا تھا۔

محمل سہم کر قدرے اوت میں ہو گئی۔ یہ تو وہی تھا۔ وہ اس کی آواز پہچانتی تھی۔

”وہ میرے ساتھ ہے، مگر تمہیں اس سے عزت سے پیش آنا چاہئے تھا۔“ فرشتے کے لجھے میں دبی دبی سختی تھی۔

”جبھی ہے، تم اسے.....“

”نہیں ہمایوں! تم اس کو مجرم کی طرح ٹریٹ مت کرو۔ اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو اپنے بھائیوں جیسے کزن پر ٹرست کر کے مخصوصیت میں چلی آئی تھی۔

وہ حق دق سے جا رہی تھی۔ ابھی تو فرشتے کو بالواسطہ سب کھانا آئی تھی اور تب فرشتے فواد کو ”نامحرم“ کہہ رہی تھی اور اب ہمایوں کے سامنے اس کی نادانیوں پر کیسے پردہ ڈال گئی تھی۔

”اس کا قصور یہ ہے کہ وہ فواد کریم کی کزن ہے۔ اسے لے کر آؤ۔“ اب کے ہمایوں داؤ دکالا لہجہ متوازن تھا۔ فرشتے اسے راستہ دینے کے لئے چوکھٹ پار کر کے باہر چلی گئی تو وہ دھڑکتے دل سے گیٹ کی اوٹ سے نکلی۔ سامنے ہی وہ کھڑا تھا۔ یونیفارم میں ملبوس، مکمل طور پر تیار، اکھڑ تیور اور ماٹھے پر مل لئے۔

”جب میں نے بکواس کی تھی کہ وہاں رہو تو تم نے باہر قدم کیوں نکالا؟“

”نوكر نہیں ہوں میں آپ کی، جو آپ کا حکم مانوں۔ آپ ہیں کون مجھے حکم دینے والے، ہاں؟“ وہ بھی جواباً غریبی تھی۔

”وہاٹ؟..... تم.....“

”زبان سنچال کر بات کریں، اے ایس لی صاحب! میں مسجد میں کھڑی ہوں، اور اب آپ کا مجھ پر کوئی زور نہیں ہے۔“ اس نے گیٹ کا کنارہ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”تم.....“ وہ کچھ سخت کہتے کہتے ضبط کر گیا، پھر فرشتے کی طرف پلٹا جو خاموشی سے سب دیکھ رہی تھی۔

”اس سے کہو کہ میرے ساتھ آئے۔ میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔“

فرشتے نے خاموشی سے ہمایوں کی بات سنی اور جب وہ چپ ہوا تو وہ محمل کی طرف ٹڑی۔

”اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ تمہارا دشمن نہیں ہے۔“

”مجھے ان پر رتی برابر بھروسہ نہیں ہے۔“

”ہوتا بھی نہیں چاہئے۔ مگر تمہارے تھنا گھر جانے اور پولیس موبائل میں جانے میں فرق ہوگا۔ آگے تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔“

بات کچھ ایسی تھی کہ وہ خاموشی ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، آئیں۔“ اس نے باہر قدم رکھے۔ پھر پلٹ کر فرشتے کی طرف دیکھا جو گیٹ کے ساتھ سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

اس کی پشت پر وہ عالیشان تین منزلہ عمارت تھی جس کے اوپر سفید ستون بہت وقار سے کھڑے تھے، جیسے کوئی بلند و بالا سفید محل ہو۔ اس کا گنبد نہ تھا، مگر فرشتے اسے مسجد کہہ رہی تھی۔

اس سے متصل بوجھے اپنی خوب صورت آرائش کے ساتھ وہیں موجود تھا، جہاں اس نے رات میں دیکھا تھا۔ فخر کی نیلاہٹ میں وہ اور بھی شاندار لگ رہا تھا۔

”جھینکس؟“ وہ کہہ کر رکھی نہیں۔

ہمایوں سامنے کھڑی پولیس موبائل کی ڈرائیور گ سیٹ سنجھاں چکا تھا۔ وہ اعتماد سے چلتی ہوئی آئی اور فرنٹ ڈرائیور کو نیشنل سنجھاں سے سوچا۔

”آپ مجھے میرے گھر لے کر جا رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ سرد سے انداز میں کہہ کر وہ گاڑی سڑک پر ڈال چکا تھا۔

”پھر..... پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”تھانے۔“

”مگر مجھے گھر.....“

”بی بی! مجھے بحث پسند نہیں ہے۔ خاموش رہو۔“ اس کو جھڑک کر ہمایوں نے اپیڈ بھادی۔

وہ نم آنکھوں سے سامنے سڑک کو دیکھنے لگی۔ جانے اس کی قسمت اس کو اب اور کیا کیا دکھانے والی تھی۔



آج آغا ابراہیم کی عالیشان محل نما کوئی کے لान میں صحیح سے ہی سب جمع تھے۔ آغا کریم چہرے پر ڈھروں غیض و غضب لئے پر رعونت انداز میں کری پڑا جمان تھے۔ مہتاب تائی، فضہ اور نامہ چھپی قریب ہی کریں گے پہنچی معنی خیزی سے مدھم سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ غفران چھپا اور اسد چھپا بھی پاس ہی پریشان سے بیٹھے تھے۔ برآمدے کے مختصر ذینے پر آرزو پہنچی تھی۔ گھنٹوں پر پلیٹ رکھے، وہ اپنی ازلی بے نیازی سے توں پر جیم لگا رہی تھی۔

اس کے پیچے برآمدے میں پہنچی کریں گے پہنچی کھسپھسر کر رہی تھیں۔

حسن مختار بسا گھاس پر ٹھل رہا تھا۔ بار بار اپنے سیل فون پر کوئی نمبر پر لیں کرتا وہ جھنجلا سارا تھا۔ دیکھ اپنے کمرے میں تھا اور۔

فواد، آغا جان کے برابر کری ڈالے اخبار پھیلائے سرسری سامطالعہ کر رہا تھا۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر سب کے چہروں کے تاثرات دیکھ لیتا۔ اس کے انداز میں اطمینان و سرشاری تھی۔

بس ایک مرتب تھیں جو کچن میں کری پہنچی خاموشی سے آنسو بہارہی تھیں۔ ان کی ساری زندگی کی ریاضت رایگاں نئی تھی۔ محمل کل اکیڈی جانے کا کہہ کر باہر نکلی تھی اور جب شام تک اس کی واپسی نہ ہوئی تو اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ کتنے قفل پڑھ ڈالے،

کتنی دعائیں کر لیں، مگر وہ واپس نہ آئی۔

بات چھپنے والی کہاں تھی بھلا؟ سب کو خبر ہو ہی گئی۔ آغا جان تو سراپا غیض و غضب بن گئے۔ تھانے جانے کی بات کی تو فواد نے ہی انہیں سمجھایا کہ گھر کی عزت داؤ پر لگانے کا فائدہ، تھوڑی دیر مزید انتظار کر لیتے ہیں۔

حسن اور اسد پچھا ساری رات اسے ہسپتالوں، مُردہ خانوں اور سڑکوں پر ٹلاشتے رہے تھے، مگر جب تم بجے کے قریب وہ ناکام لوٹے تو گھر میں گویا صفحہ ماتم بچھ گئی۔ عورتوں کی معنی خیز نگاہیں، مردوں کے ملامت بھرے فقرے سرت کو اپنی روح میں گزتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ اسی وقت سے روئے چلی جا رہی تھیں۔ کوئی صفائی، کوئی دہائی نہیں، بس آنکھ میں آنسو اور لبوں پر ایک ہی دعا کہ محمل کی لاش کی ہسپتال، کسی نہر، نالے سے مل جائے مگر وہ نہ ہو جو ان کی ساری ریاضت ضائع کر دے۔

”بھاگ گئی کسی کے ساتھ۔ ارے میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔“ صبح کا سورج طلوع ہونے لگا تھا، جب تائی مہتاب کی آواز کچن میں سنائی دی۔

”شک تو مجھے بھی بہی ہے۔“ ناعمرہ چھپی نے بلندی سرگوشی کی۔ وہ سب رات سے جاگ رہی تھیں۔ البتہ حسن کے علاوہ دوسرے لڑکے لڑکیاں بھرپور نیند لے کر ابھی بیدار ہوئے تھے۔

”باس!“ آغا جان ایک دم دھاڑے۔ اندر کچن میں روٹی سرت نے دل کر بھیجا چہرہ اٹھایا۔

سب نے چونک کر آغا جان کو دیکھا، جن کا سرخ و سفید چہرہ غصے سے تھمارہا تھا۔ ”اب اگر وہ زندہ اس دلیز پر آئی تو میں اسے بھیں دفن کر دوں گا۔ سن لیا سب نے؟“

”ارے ایسی بیٹیوں کا تو پیدا ہوتے ہی گا کھونٹ دینا چاہئے۔ ابراہیم اس کو بھی ساتھ لے کر مرتا۔ ہماری عزت داغ دار کرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ توبہ، توبہ!“

”ضرور کسی کے ساتھ چکر تھا۔ قرآن اٹھا کر چھٹ پر جاتی تھی۔ توبہ استغفار، تاکہ ہم

اس پر شک نہ کریں۔ اسی لئے تو میں نے اس دن کہا تھا، مگر کوئی سنے تو۔“ تائی مہتاب کو اپنا غم یاد آیا تھا۔

سرت کا دل ڈوبتا چلا گیا۔

”تم مر جاؤ محمل!..... خدارا مر جاؤ مگر واپس نہ آؤ۔ ان کا دل درد سے چلا یا تھا۔“
”آج کے بعد اس کا نام کوئی اس گھر میں نہیں لے گا۔ اور اگر.....“ آغا جان کی بات ادھوری رہ گئی۔

کسی نے زور سے گیٹ پر دستک دی تھی۔

سب نے چونک کر گیٹ کو دیکھا، یہاں تک کہ برآمدے کی سڑھیوں پر بیٹھی تو س کھاتی آرزو نے بھی سراہایا تھا۔

سرت دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئیں۔ صبح کے سات بجے پہلے تو کبھی اس طرح دستک نہ ہوئی تھی۔

”حسن! دروازہ کھولو۔“ اسد پیچا نے کہا تو حسن نے آگے بڑھ کر گیٹ کے چھوٹے دروازے کے پینڈل کا یک کھولا اور پیچھے ہوا۔

دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ایک مرمریں سپید ہاتھ دروازے پر دھرا اور پھر چوکھٹ پر اندر آتے سپید نگے پاؤں دکھائی دیئے۔

آغا جان بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باقی سب بھی ساتھ ہی اٹھے، سب کی نظریں گیٹ پر جمی تھیں جہاں چھوٹے دروازے کو کھول کر وہ اندر داخل ہو رہی تھی۔

سیاہ پاؤں تک آتا عبا یا اور چہرے کے گردختی سے لپیٹا سرمگی اسکارف، نگے پاؤں، سرجھکائے محمل ابراہیم نے اندر قدم رکھا۔

”حسن! اس سے کہو یہاں سے دفع ہو جائے، درنہ میں اس کا خون کر دوں گا۔“
آغا جان زور سے دھاڑے تھے۔ ”ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے بے شرم لڑکی!
ورنہ.....“

”آپ کے باپ کا گھر ہے جو نکل جاؤ؟“

وہ جو گردن جھکائے اندر قدم رکھ رہی تھی، ایک دم سراہا کرتی بے خوف سے غرائی

کر لمحے بھر کو سب بھونپکارہ گئے۔ تائی مہتاب نے تو ششند رسا ہو کر منہ پہ باتھ رکھ لیا۔
حسن انجھ کر محمل کو دیکھ رہا تھا اور فواد.....
فواد اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔
وہ اب پلٹ کر گیٹ کھول رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے زن سے دو پولیس موبائلز آگے پیچھے ڈرائیووے پہ اندر آئیں۔
کھٹا کھٹ دروازے کھلنے اور سپاہی اُتر کر تیزی سے ارد گرد پھلتے چلے گئے۔
”پورے گھر کی ملاشی لو۔“ بلند حکمیہ کہتا وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر نیچے
اُڑا۔ یونیفارم میں ملبوس، چہرے پر مدھم سی فاتحانہ مسکراہٹ لئے وہ گھاس پر کھڑے ان
پتھر ہوئے لوگوں کے قریب آیا۔

یہ سب اتنا اچاک اور غیر متوقع تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ مل سکا۔ فواد کو ہی سب
سے پہلے ہوش آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہھکڑی لگائی جا رہی تھی۔

”کیا بکواس ہے؟“ اس نے غزا کر ہاتھ پیچھے کرنے چاہے۔

”اس بکواس میں لکھا ہے کہ تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری منسوخ ہو جگی ہے اور یہ
کہ تمہیں فوری گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔“ ہمایوں داؤ نے ایک کاغذ اس
کے چہرے کے سامنے لہرا�ا

”مسئلہ کیا ہے آفسر؟ کیا کیا ہے میرے بیٹے نے؟“

”آغا صاحب! آپ کے بیٹے نے اپنی کزن.....“ ہمایوں نے ایک نگاہ محمل پہ
ڈالی جو گیٹ کے ساتھ، بینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی نفرت بھری نظر وہ سے فواد کو دیکھ
رہی تھی۔ ”محمل ابراہیم کو اپنی ایک چھنسی ہوئی فائل نکلوانے کے عوض ایک رات کے لئے
بیچا اور ابھی ناشہ کرتے ہوئے وہ غالباً اسی فائل کے اپر وہ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سرا! میرا بیٹا.....“

”آپ کا بیٹا شمالی علاقہ جات کی لڑکیوں کے اخوا اور خرید و فروخت میں ملوث ہے،
یہ آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی۔ اس دفعہ انہوں نے چالاکی کی اور اپنی کزن کا سودا کر
کے اسے دھوکے سے متعلقہ پارٹی کے پاس بھیجا، البتہ آپ کی بھتیجی پولیس کی حفاظت میں

ہی رہی کیونکہ وہ سب پولیس کے پلان کے تحت تھا۔ آغا فواد گینگ کو منتظر عام پنہلانے کے لئے چال تو اچھی چلی، مگر ہر چال کامیاب نہیں ہوتی۔“

”محل کا اس اے ایس پی سے چکر تھا۔“ فواد خاموشی سے سن کر بہت آرام سے بولا۔ ”میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا، اب اپنے کرتوت پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ مجھے پھنسار ہے ہیں تاکہ.....“

”خاموش ہو جائیں۔“ وہ پھٹ پڑی تھی۔ ”ایک لفظ بھی آپ نے میرے متعلق کہا تو میں آپ کا منہ نوچ لوں گی۔ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا، آپ کو اندازہ ہے؟“ ”اے یہ کیا چپ رہے، میں بتاتی ہوں۔“ تائی مہتاب جیسے ہوش میں آئی تھیں، ایک دم سینے پر ہاتھ مارتی سامنے آئیں۔ ”سارا فساد اسی لڑکی کا مچایا ہوا ہے۔ یہ میرے بیٹے کو پھنسارتی ہے تاکہ اس کے اپنے کرتوت نہ کھلیں، آغا صاحب!“ انہوں نے تائید طلب نظروں سے آغا جان کو دیکھا اور ادھر ادھر گردن گھمائی۔ سب خاموش کھڑے تھے، کسی نے ہاں یا ناں نہیں کی۔

”لڑکی کا نام محل ابراہیم ہے۔“ ہمایوں نے موبائل کا بٹن دبا کر ان کے سامنے کیا۔ اسیکر سے آواز گونجنے لگی۔ فواد کی آواز۔ جو ناوقت پہچانی جاتی تھی۔ ”تین تاریخ، بھتے کی شام وہ آپ کے پاس ہوگی۔ معصوم، ان چھوٹی اور نوجوان ہے۔ آپ کی ڈیماڈ پر پوری اُتری ہے۔“ اور ایک قہقهہ۔

محل کو اپنا چہرہ تھتا تا ہوا محسوس ہوا۔

ذرا سے وقت سے مختلف آوازیں گونجی تھیں۔

”فواد بھائی! یہ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔“

”فواد بھائی! یہ لوگ میرے ساتھ کچھ غلط کر دیں گے۔“

”بکواس بند کرو اور میری بات غور سے سنو۔ تمہیں وہ ڈائیٹریکٹ چاہئے تا؟ تو جیسے وہ کہیں، کرتی جاؤ۔ بس ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ صبح تمہیں ڈرائیور لینے آجائے گا۔“

ہمایوں نے بٹن دبایا، اور موبائل نیچے کیا۔ فواد نے سر جھکا۔

”آڈیو قانون کی عدالت میں قابل قبول نہیں ہوتا، اے ایس پی صاحب!“

”گھر کی عدالت میں تو ہوتا ہے۔“

اور وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ان سب کو سانپ سوگھ گیا تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ ساکت و متاسف کھڑا تھا۔

”دیکھ لون گا میں، ایک ایک کو دیکھ لون گا۔“

”فی الحال تو تمہیں ایک لمبے عرصے تک جیل کی دیواروں کو دیکھنا ہو گا۔“

”اسی دن کے لئے۔“ حسن ایک دم تیزی سے سامنے آیا۔ ”اسی دن کے لئے کہتا تھا کہ اس سے دور رہو۔ ساری دنیا جانتی ہے، یہ کس قلاش کا آدمی ہے۔ لڑکوں کا کاروبار کرتا ہے، اسی لئے تمہیں منع کرتا تھا۔“

”مجھے منع کر سکتے تھے، اس کے ہاتھ نہیں توڑ سکتے تھے؟ میری جگہ اپنی بہن ہوتی تو بھی کچھ نہ کرتے؟“ وہ جواباً ایسے رُخ کر بولی کہ حسن کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ محمل بھی ایسے نہ بولی تھی۔

”محمل!..... میں.....“

”مجھے آپ کی کوئی وضاحت نہیں چاہئے۔ آپ سب ایک سے ہیں۔“ اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ تب ہی اس نے برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹھہرائی سرست کو دیکھا، جو جانے کب ادھر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے قریب برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھی آرزو دینا پلک جھپکے مبہوت سی اس مغرور اور وجیہ سے اے ایس پی کو دیکھ رہی تھی۔ توں کا مکڑا اس کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔

”آغا صاحب! انہیں روکیں، یہ میرے بیٹے کو کھڑ لے جا رہے ہیں؟“ وہ فواد کو لے جانے لگے تو تائی مہتاب، آغا جان کا بازو جھنجور کے روپڑی تھیں۔ آغا جان چپ کھڑے تھے، بالآخر غفران پچھا آگے بڑھے۔

”بھاہی بیگم! حوصلہ کریں۔ ان شاء اللہ فواد شام تک گھر پہ ہو گا۔“ ان کی بات پر ہمایوں نے استہزا سیہ سر جھٹکا اور پلٹا۔

”ایک منٹ اے ایس پی صاحب!“

آغا جان نہ بھرے ہوئے انداز میں مخاطب ہوئے تھے۔ وہ چونک کر پڑا۔

”یہ لڑکی رات باہر گزار آئی ہے، ہم شریف لوگ ہیں، اس کو قبول نہیں کر سکتے۔

آپ اسے بھی بھلے ساتھ ہی لے جائیں۔“

محمل ساکت رہ گئی۔ اسے لگا، وہ کبھی اپنی جگہ سے مل نہیں سکے گی۔

”واقعی؟“ ہمایوں نے ابرد اٹھائی۔

برآمدے کے ستوں سے لگی سرت کے آنسو پھر سے امبل پڑے۔

”جی واقعی؟“ ان کے چبا کر کہنے پر وہ مسکرا یا۔

”ٹھیک ہے محمل بی بی! تھانے چلئے۔ آپ سلطانی گواہ ہیں، گواہی دیں اور فواد کریم کو ساری عمر جیل میں سڑتے دیکھیں۔ میں نے تو چاہا تھا، گھر کی بات گھر میں رہ جائے، لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کو علم ہو کہ فواد نے گھر کی بچی کا سودا کیا ہے تو ٹھیک ہے، ہم اس سلطانی گواہ کو ساتھ لے چلتے ہیں۔ نہ آپ اس بچی کو سمجھا بجا کر راضی کر کے چپ کر اسکیں گے، نہ ہی فواد کبھی باہر آئے گا۔ چلو محمل؟“

”ارے نہیں اسے ایس لپی صاحب! محمل ہماری بچی ہے۔ بھائی صاحب بس یونی ناراض ہیں، ہمیں یقین ہے کہ یہ پولیس کی حفاظت میں رہی ہے۔ عزت سے گھر آئی ہے۔“ غفران چچا نے بوکھلا کر بات سنھالی۔

”نہ بھی یقین کریں، پھر بھی، محمل کو ہم نے مسجد بھجوایا تھا، عورتوں کی مسجد ہے۔ میری بہن ادھر پڑھاتی ہے۔“ اس نے آغا صاحب کو بخورد دیکھتے ہوئے بہن پر زور دیا اور ایک سخت نظر ڈالتا پڑت گیا۔

وہ ابھی تک ویسے ہی ساکت و ششدار کھڑی تھی، جیسے اسے آغا جان کے الفاظ کا ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔

کاڑیاں گیٹ سے باہر نکل گئیں۔ غفران چچا موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگے۔ تائی مہتاب زور زور سے روئے لگیں۔

”یہ سارا اسی مخور، کا کیا دھرا ہے۔ اسے گھر سے نکالنے آغا صاحب! کمخت نے میرے پیچے کو پھسادیا ہے، اپنے باپ کے ساتھ کیوں نہیں مر گئی؟“

وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھیں مگر حسن درمیان میں آگیا۔

”کیا کر رہی ہیں آپ تائی ماں؟“ ان کے دونوں ہاتھوں کو گرفت میں لئے اس نے بمشکل انہیں باز رکھا۔ ”بھلا ایک لڑکی کے کہنے پر فواد کریم جیسے اثر ورسون خدا لے شخص کے اریست وارٹ بن سکتے ہیں؟“

”یہ جھوٹ بکتی ہے، میں اسے جان سے مار دوں گی۔“

”محمٰل! اندر جاؤ۔“ فضہ چچی نے آہستہ سے کہا تو وہ چونکی اور پھر اندر کی طرف دوڑی۔

فضہ اور ناعمہ نے متین خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آغا جان ڈرائیور کی طرف بڑھ گئے۔ تائی ماں ابھی تک حسن کے پازوؤں میں روچنے رہی تھیں۔

وہ بھاگتی ہوئی برآمدے کے سر پر رکی۔ ستون سے لگی کھڑی سرت نے منہ پھیر لیا۔ اسے دھکا سالاگا۔

”ماں....!“ اس کی آنکھوں میں مرچیں چینے لگیں۔

”اے محمل!“ آرزو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ڈرائیور چونکی۔

”یہ ہینڈسم آفیسر کون تھا؟“

”یہ ہمایوں تھا۔ ہمایوں داؤد۔“

”ہوں، نائس نیم۔ کہ ہر رہتا ہے؟“

”جہنم میں۔ ایڈر لیس چاہئے؟“ وہ زہر خند ہوئی تو آرزو نے بر امامہ بیٹایا۔ محمل اس کا ہاتھ جھٹک کر ایک شکوہ کناب نگاہ ماں پر ڈالتی اندر بھاگتی گئی۔

”ہمایوں داؤد.....!“ آرزو زیر ب سکرائی اور پھر تو س کھانے لگی۔



گھر میں اگلے کئی روز تک خاموشی چھائی رہی۔ بس ایک حسن تھا، جو ہر دم، ہر ایک کے سامنے اس کا دفاع کرتا نظر آتا۔

”اگر محمل کی جگہ آرزو ہوتی تو بھی آپ سبھی کہتیں چھی؟“ وہ نامہ کی کسی بات پر بھڑک کر بولا، تو وہ جو سرمنہ لپیٹے اندر پڑی تھی، جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے باہر آئی۔
”آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے، ہر ایک کے سامنے میری صفائی دینے کی۔“ وہ لاونچ میں آ کر ایک دم چلا کر بولی تو سب چونک کراسے دیکھنے لگے۔
”مگر محمل؟“

”اگر ان لوگوں نے مجھے یونہی پورے خاندان میں بے عزت کرنا ہے تو تمہیک ہے۔ اگر عزت ایک دفعہ چلی گئی تو میں کس عزت کو بچانے کے لئے کورٹ میں چپ رہوں گی؟ میں بھری عدالت میں سارے شہر کو بتاؤں گی۔ سن لیں آپ۔“
اپنے پیچھے دھاڑ سے دروازہ بند کر کے اس نے پھر سے خود کو کمرے میں قید کر لیا۔
اندر سرست بستر کی چادر درست کر رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر لمحے بھر کو سراٹھایا، پھر واپس کام میں مصروف ہو گئیں۔

”آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں اماں؟“ سرست خاموشی سے نکلے پہ غلاف چڑھاتی رہیں۔

”اماں!“ اس کی آنکھوں کے گوشے بیکنے لگے۔ وہ نکلے درست کر کے دروازے کی طرف بڑھیں۔

”میں نے کیا کیا ہے اماں؟“ وہ روپڑی تھی۔

دروازے کی طرف بڑھتی سرت نے گردن موڑی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا مجمل!“ بہت دنوں بعد وہ اس سے بولی تھیں۔

”اماں!“ وہ ترپ کران کے قریب آئی۔ ”فواز بھائی نے مجھے نقش کا کہہ کر.....“

”مجھے پتہ ہے۔“

”پتہ ہے، مگر یقین نہیں ہے؟“

” ہے۔“

”پھر بات کیوں نہیں کرتیں مجھے سے؟“

”میں برسوں ان کی خدمت کرتی رہی کہ شاید کبھی یہ ہمیں کچھ عزت دیں، مگر میری بیٹی ان ہی کے بیٹے سے پکڑدا کر اس کے خلاف کورٹ پکھری میں گواہی دیتی پھرے..... پہلے زندگی کم مشکل تھی مجمل! جو تم نے مزید مشکل بنادی ہے۔“ وہ تھکی تھکی سی پلٹ گئیں۔

وہ نم آنکھوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ایک غلط قدم اسے یہاں لا پہنچانے والے، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔



پھر کتنے ہی دن وہ ماتم کرتی رہی۔ اس کے پاس رونے کو بہت کچھ تھا۔ پھر کئی دنوں بعد اسے اس عبا یا اسکارف اور مردانہ شلوار قمیص کا خیال آیا تو دنوں کو الگ الگ شاپرز میں ڈال کر فرشتے کو واپس کرنے نکلی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے ہمایوں داؤد کے منہ لگنے کی۔ فرشتے کو دے دوں گی، وہی آگے پہنچا دے گی۔“ اس نے سوچا تھا۔

بس اسٹاپ کا بیخ اب دیران ہوتا تھا۔ وہ سیاہ قام لڑکی مژکر کبھی واپس نہ آئی تھی۔ جانے کون تھی، کہاں چلی گئی۔ وہ اکثر سوچتی رہ جاتی۔

بس سے اتر کر اس نے سڑک پر کھڑے، گردن اوپنجی کر کے دیکھا۔ وہ دونوں عمارتیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ہمایوں داؤد کا بنگلہ بزر بیلوں سے ڈھکا تھا اور ساتھ موجود

اوپنے ستونوں والی سفید عمارت کوئی انسی شوٹ تھا شاید۔

کوئی ضرورت نہیں ہے اس فضول انسان کا دروازہ کھٹکھٹانے کی۔ میں مسجد میں ہی چلی جاتی ہوں۔ وہ مسجد کے سیاہ گیٹ کے سامنے آئی۔ گیٹ کا سیاہ لوہا چمک رہا تھا۔ اسے اس چمکتے لوہے میں اپنا عکس دکھائی دیا۔

بلیو جیز کے اوپر گھنٹوں تک آتا گرتا، گردن سے لپٹا دوپٹہ، اوپنجی بھوری پونی ٹیل باندھے، ماتھے پہ میل ڈالے وہ اپنے مخصوص حلیبے میں تھی۔

گیٹ کے اس طرف ایک بورڈ لگا تھا، جس کو وہ پہلے نہ دیکھ سکی تھی۔ اس پہ واضح لکھا تھا۔ "No men Allowed" (مردوں کا داخلہ منوع ہے)

ساتھ بادری گارڈ بیٹھا تھا۔ اس نے گھری سانس لے کر اندر قدم رکھا۔

بڑا سارہ بزرگان، سامنے سفید سنگ مرمر کا چمکتا برآمدہ۔ برآمدے کے کونے میں ریپشن ڈیک کے پیچے کھڑی لڑکی، جو سیاہ عبا یا کے اوپر سرگی اسکارف میں لمبیں، فون کان سے لگائے محو گفتگو تھیں۔

سامنے سے سفید شلوار قمیض میں لمبیں ایک لڑکی چلی آ رہی تھی۔ اس نے عنابی اسکارف لے رکھا تھا، جیسے یونیفارم ہو۔ محمل کے قریب سے گزرتے اس نے مسکرا کر "السلام علیکم" کہا۔

"جی؟" وہ چوکی۔ وہ لڑکی مسکرا کر اس کے پاس سے گزر کر چلی گئی۔

"پیں.....؟ اس نے مجھے سلام کیوں کیا؟..... کیا یہ مجھے جانتی ہے؟" وہ ابھی ہی رہی تھی کہ ریپشنست کی آواز آئی۔

"السلام علیکم! کیمن آئی ہیلپ یو؟"

"جی مجھے فرشتے سے ملتا ہے۔" وہ ڈیک کے قریب آئی۔

"فرشتے باتی کلاس میں ہوں گی۔ اندر کا ریڈور میں رائٹ پر فرست ڈور۔"

"اچھا۔"

وہ ادھر ادھر دیکھتی سنگ مرمر کے چمکتے فرش پہ چلتی جا رہی تھی۔ کاریڈور میں پہلے کٹلے دروازے پر وہ رکی۔ اندر سے فرشتے کی مضبوط گر خوب صورت آواز آ رہی تھی۔

”مرتین، سے مراد بھی اسرائیل میں ہونے والا دو مرتبہ کا فساد ہے۔ مفر کے مطابق پہلی دفعہ سے مراد زکریا کا قتل، جبکہ دوسری دفعہ سے عیسیٰ کے قتل کی سازش مراد ہے۔“

اس نے کھلے دروازے سے اندر گردن کی۔ سامنے بنے پلیٹ فارم پر کری پ وہ بیٹھی اپنے آگے میز پر کتاب کھولے مصروف سی پڑھا رہی تھی۔ اس کے سامنے قطار در قطار لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ عنابی اسکارف میں لپٹے بہت سے بھکے سر اور تیزی سے لکھتے قلم۔ وہ واپس پلٹ گئی۔

برآمدے میں ریپیشن ڈیک کے سامنے دیوار سے لگے کاؤچ پر بیٹھ کر وقت کا ثنا اسے بہتر لگا، سو کتنی ہی دیر وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی، پاؤں جھلاتی چیوٹم چباتے ہوئے تنقیدی نگاہوں سے ارد گرد گزرتی لڑکیوں کا چائزہ لیتی رہی۔

وہاں ایک منظم سی چہل پہل ہمدرد وقت ہو رہی تھی۔ وہ جیسے کوئی اور ہی دنیا تھی۔ یونیفارم میں لمبوس ادھر ادھر تیزی سے آتی جاتی لڑکیاں۔ وہاں ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اسٹوڈنس کی سفید شلوار قمیض اور اوپر کسی رنگ کا اسکارف تھا، جبکہ تمام ٹیچرز اور آفیشلو کے سیاہ عبا یے اور سرگی اسکارف تھے۔ ان کے عبا یا اور اسکارف لینے کا انداز بے حد نفس تھا۔ بہت پر اعتماد، ایکٹو اور مصروف سی لڑکیاں۔ جیسے وہ الگ سی دنیا وہ لڑکیاں ہی چلا رہی تھیں۔ کچھ تھا اس مسجد میں جو محل کوئی نہیں اور نظر نہیں آیا تھا۔

”السلام علیکم۔ اگر آپ بورہ رہی ہیں تو اس کا مطالعہ کر لیں۔“

”شیور۔“ اس نے شانے اچکا کر ریپیشن کے ہاتھ سے وہ دیز کتاب لی۔

چند صفحے پڑھتے ہی اسے بے اختیار وہ شام یاد آئی، جب آغا جان نے ٹیرس پر اس سے وہ سیاہ جلد والا مصحف چھینا تھا۔

وہ قرآن کی سادہ ٹرائلیشن تھی۔

وہ یونی درمیان سے کھول کر پڑھنے لگی۔

”اور اس نے ہی غنی کیا اور مالدار بنایا ہے۔ اور وہی ہے جو شعری (ستارے) کا رب ہے اور بلاشبہ اس نے ہی پہلی قوم عاد کو ہلاک کیا اور قوم ثمود کو بھی۔ پھر کچھ باقی نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قوم لوط کو بھی۔ بلاشبہ یہ سب انتہائی ظالم و سرکش لوگ تھے۔ اور

اسی نے پلٹا اٹھی ہوئی بستیوں کو۔ پھر ان پر چھا گیا جو چھانا تھا۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں پر جھگڑو گے؟ یہ تو تنبیہ تھی پہلی تنبیہات میں سے۔ آنے والی قریب آگئی۔ اللہ کے علاوہ کوئی ظاہر کرنے والا نہیں تو کیا تم اس قرآن سے تعجب کرتے ہو اور ہستے ہو، رو تے نہیں اور تم کھیل تماشا کر رہے ہو؟“

”محل!..... اے؟“

وہ جو بالکل کھو کر پڑھتی چلی جا رہی تھی، بری طرح چونکی۔
سامنے فرشتے کھڑی تھی۔

اس نے قرآن بند کیا اور میز پر رکھ کر کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم! کیسی ہو؟“ فرشتے اس کے گلے لگ کر الگ ہوئی اور اسے شانوں سے تھام کر مسکرا کر دیکھا۔ وہ محل سے دوائیج لمبی تھی۔ شفاف پییدہ چہرہ سرگی اسکارف میں مقید، اور وہ کاچھی بخوری آنکھیں جو کسی سے بہت ملتی تھیں۔

”ٹھیک، آپ کیسی ہیں؟“

”الحمد للہ۔ اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ گھر میں سب ٹھیک ہے؟“

”میں۔“ اس نے نگاہیں جھکائیں اور بہت سی نبی اپنے اندر اتاری۔

”چلو کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ کی چیزیں تمہیں میرے پاس۔“ اس نے شاپر اوپر کیا۔

”میں سمجھی، تم میرے لئے کوئی گفت لائی ہو۔“ وہ ہنسی اور شاپر لے لیا۔ کوئی تکلف نہیں، بہت خالص سا انداز۔ سچا اور خالص۔

”لیکن اگر تم یہ رکھنا چاہو تو.....“

”نہیں، میں یہ عبایا وغیرہ نہیں لیتی۔“

”تو پاہلی دین۔ بہت شکر یہ۔“ وہ خوش دلی سے مسکرانی تو محل کو اچھا لگا۔

بہت مذہبی لوگ عموماً اتنے سنجیدہ اور سخت نظر آتے ہیں کہ جیسے ایک وہی نیک مومن ہوں اور باقی سب گناہ گار کافر۔ اسے ایسے لوگوں سے شدید چڑھتی تھی، جن کے سامنے اسے لگئے کہ یہ مجھے بہت گناہ گار سمجھ رہا ہے۔ مگر فرشتے اور اس کی مسجد کی ووکیاں

اس روایتی ایج سے بہت مختلف تھیں۔

”یہ ان کا ہے۔“ اس نے دوسرا شاپر سامنے کیا۔

”ہمایوں کا؟“

”جی۔“

”اچھا، ہمایوں کبھی شہر میں ہوتا ہے، بکھی نہیں۔ میرا اس سے ایزیج کوٹھیکٹ نہیں رہتا۔ میں بھول بھی جاتی ہوں بہت۔ اگر تم یہ اس کے چوکیدار کو دے دو، تو وہ پہنچا دے گا۔“

”فرشتے! انہوں نے آپ کو اپنی اور فواد بھائی کی ڈیل کے بارے میں بتایا تھا؟“
”ڈیل نہیں، وہ دراصل آغا فواد سے بہت تنگ تھا اور اسے اس کے گینگ کی کسی لڑکی کے ذریعے پکڑنا چاہتا تھا۔“

”وہ گینگ کی لڑکی توقع کر رہے تھے تو آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں ان کی کزن ہوں؟“

”تم نے خود بتایا تھا، جب ہم پر یہ رہا میں تجد پڑھ رہے تھے۔“
”اوہ!“ کئی دن کی انجمن سلیمانی۔ ”میں تو گینگ کی لڑکی نہیں تھی، پھر انہوں نے فواد بھائی کو کیسے اریست کر لیا؟“

”یہ تو تم ہمایوں سے پوچھنا۔ میری تو عرصے سے اس سے بات نہیں ہوئی۔“
”ٹھیک۔ دو بنخنے کو ہیں فرشتے! میں پھر آؤں گی۔“ اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا ہمایوں سے زیادہ رابطہ نہیں رہتا مگر اسے فواد کے کیس کی ہر بات معلوم تھی۔ عجیب بات تھی۔

”اور میں دعا کروں گی کہ تم کبھی ہمارے ساتھ آ کر قرآن پڑھو۔“

”معلوم نہیں۔ شاید میں کچھ عرصے سے تک انگلینڈ چلی جاؤں۔“

”اوہ۔“ فرشتے کے چہرے پر سایہ لہرایا۔

”آپ کی مسجد میں قرآن پڑھاتے ہیں؟“

”ہاں۔ یہ دراصل ایک اسلامک اسکول ہے۔“

”ہوں، میں چلتی ہوں۔“ وہ اسے لان تک چھوڑنے آئی۔

”تمہیں کبھی کسی نے اس کتاب کی طرف نہیں بلا�ا محمل؟“ جانتے سے اس نے پوچھا تو اس کے پڑھتے قدم رک گئے۔

یادوں کے پردے پر ایک سیاہ فام چہرہ لمبرایا تھا۔

”بلایا تھا۔ مگر میں نے دل کا انتخاب کیا اور میں خوش تھی۔ اس نے کہا تھا، یہ کتاب سحر کر دیتی ہے، اور مجھے مسحور ہونے سے ڈر لگتا تھا۔“

”کتاب سحر نہیں کرتی، پڑھنے والا خود کو سحر زدہ محسوس کرتا ہے۔“

”ان دونوں میں کیا فرق ہے؟“

”بہت ہے۔ لفظوں کو الگ الگ پر کھنا سیکھو، ورنہ زندگی کی سمجھ نہیں آئے گی۔“

فرشتنے پلی گئی اور وہ شاپر انٹھائے خود کو گھستی باہر نکلی۔

ساتھ والے گیٹ میں اندر جاتی گاڑی لمحے بھر کو رکی، شیشہ نیچے ہوا۔ سر پر کیپ اور وجہے چہرے پر ڈارک گاسز لگائے ہمایوں نے اسے دیکھا تھا، جو گیٹ کے سامنے کھڑی آنکھیں سکوڑے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ چوکیدار کو کچھ کہہ کر گاڑی زدن سے اندر لے گیا۔

چوکیدار بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا۔

”صاحب کہہ رہا ہے، آپ کو اندر روم میں بٹھائے، وہ آتا ہے۔“

”تمہارے صاحب نے سوچا بھی کیسے کہ میں اس سے ملنے آئی ہوں؟ مالی فٹ۔ یہ پکڑو، اور اپنے صاحب کے منہ پر مارنا۔“ غصے سے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ سارا کیا دھرا اسی شخص کا تھا۔ اسے اس پر بے طرح غصہ آیا تھا۔ اس نے شاپر اسے تھما�ا۔

اسی میں وہ کیپ ہاتھ میں لئے تیزی سے چلتا ان تک آیا۔

”خان! گیٹ بند کر دو اور بتول سے کبو، چائے پانی کا بندوبست کرے، مہمان بیس۔ اور آپ، پلیز اندر آ جائیں۔“ شاستر و ہموار لہجہ، وہ قطعاً مختلف لگ رہا تھا۔

”مجھے اندر آنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”لیکن آغا فواد کے باہر آنے کی خبر سننے کا تو ہو گا۔“ اور وہ متذبذب سی سوچتی رہ گئی

تو ہمایوں نے مسکرا کر سر جھکتے راستے چھوڑ دیا۔

دن کی روشنی میں اس کا لاؤخ اتنا ہی قیس تھا جتنا اس رات لگا تھا۔

اوپھی دیوار کیڑ کیوں کے ٹلکے ہی گرین پرے نفاست سے بندھے تھے۔ شہری روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی کونوں میں بڑے بڑے مغذیہ طرز کے شہری گلوں میں لگے پودے بہت تردتا زہ لگ رہے تھے۔

”بیٹھئے۔“ وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا سامنے صوف فی پہ بیٹھا۔ اس کے چہرے پہ کھڑکی سے روشنی سیدھی پڑ رہی تھی۔

”تھینک یو۔“ وہ ذرا تکلف سے بیٹھی۔ اس کا صوف اندر ہیرے میں تھا۔ ہمایوں کو اس کا وجود بھی اسی تاریکی کا حصہ لگا تھا۔

”آپ نے جو بھی کہنا ہے، ذرا جلدی کہئے۔“

”ڈرگی میں؟“ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے ٹیک لگائے محنظو ناظر سامسکرا یا۔

”میں ڈرتی نہیں ہوں، بلکہ آپ کو بے حد ناقابل اعتبار سمجھتی ہوں۔“

”شوق سے سمجھیں۔ مگر میں نے آپ کو انداز نہیں کیا۔ آپ کو رث میں میرے خلاف بیان نہیں دے سکتیں۔“

”آپ کو کس نے کہا کہ میں آپ کے خلاف بیان دے رہی ہوں؟“

”آپ کے تایا نے۔“

محمل نے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بات کچھ کچھ کچھ میں آنے لگی۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کو رث میں یہ بیان دیں گی کہ میں نے آپ کو جس بے جا میں رکھا اور یقیناً وہ آپ پر اس کے لئے دباؤ ڈالیں گے۔“

”آپ کو کوئی لگا کر انہیں بجھ پر دباؤ ڈالنا پڑے گا؟“ وہ اب مطمئن سی ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، پاؤں جھلا رہی تھی۔ انداز میں ہلکا سا ظہر تھا۔ ہمایوں ذرا چوک کر سیدھا ہوا۔

”کیا مطلب؟“

”جس بے جا میں تو آپ نے مجھے رکھا تھا، اے ایس پی صاحب!“

”مس محمل ابراہیم! اتنی آسانی سے اتنے بڑے بیان نہیں دیئے جا سکتے۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ میں بے قصور ہوں۔“

”بے قصور؟ اگر آپ مجھے گھر جانے دیتے تو میں یوں بدنام نہ ہوتی۔“

”پہلے آپ بے ہوش ہوئیں، حالانکہ اس وقت آپ ایک اے ایس پی کی تحویل میں تھیں، ہمایوں داؤد کی نہیں۔ اگر آپ مسجد کی چھت نہ پھلانگتیں تو میں آپ کا بیان لے کر رات میں ہی آپ کو اکیلے گھر چھوڑ آتا۔“

”مجھے کمرے میں بند کرتے وقت تو آپ نے کسی بیان کا ذکر نہیں کیا تھا۔“

”مجھے قانون مت سکھائیں۔ وہ میرا تفتیش کا طریقہ تھا۔“

”اور آپ کے اس طریقے میں بھلے کوئی بدنام ہو جائے؟“

”تو ہو جائے۔ مجھے پرواہیں۔“

”آپ.....“ اس کا دل چاہا، وہ گلے اس کے سر پر پھوڑ دے۔

”میں! اس وقت آپ کو آپ کے گھر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ہم فواد کو ڈھیل دے رہے تھے۔ میں جانتا تھا، آپ مسجد گئی ہیں اور فجر سے پہلے مسجد کے دروازے نہیں کھلتے، سو میں اذان سنتے ہی آپ کو لینے آیا تھا۔“

”مجھے آپ کی کہانی نہیں سنی۔“ وہ پیر پختی اٹھی۔ وہ ابھی تک تاریکی میں تھی جس سے اس کے چہرے کے نقوش مدھم پڑ گئے تھے۔

”نہ سنیں۔ مگر میرا کارڈ رکھ لیں۔ ہو سکتا ہے، آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے۔“ اس نے ایک کارڈ اس کے ہاتھ میں گویا زبردستی رکھنا چاہا۔

”مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے پکڑ تو لیا، مگر جتنا نہ بھولی۔ اور پھر اسی طرح کارڈ پکڑے باہر نکل گئی۔

وہ لاڈنگ میں تنہا کھڑا رہ گیا۔ کھڑکی سے چمن کر آتی روشنی ابھی تک اس کے چہرے پر رہی تھی۔



لاونج میں سب بڑے موجود تھے۔ وہ سر جھکائے، کارڈ کو احتیاط سے پاکٹ میں چھپا کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

”محمل!“ غفران چھانے قدرے رعب سے پکارا۔ آغا جان نے تو اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس دن سے اس سے مخالف نہیں ہوئے تھے۔
”جی؟“ وہ ناگواری سے رکی۔

”کدھر سے آ رہی ہو؟“

”پرچہ کٹوانے گئی تھی تھا۔“

”واٹ؟“ غفران چھا غصب تاک سے اس کی طرف بڑھے۔

”جی۔ آپ کے فواد آغا کے خلاف پرچہ کٹوانے گئی تھی۔ کیوں، نہیں کٹا سکتی؟“ وہ ان کے بالکل سامنے کھڑی بلند آواز میں بدلماخی سے بولی تھی۔ اور مجھ سے آئندہ سوال جواب مت سمجھئے گا، میں جدھر بھی جاؤں، میری مرضی۔ آپ لوگ ہوتے کون ہیں مجھ سے.....“

چٹاٹ کی آواز کے ساتھ اس کے منہ پر تھپڑ لگا تھا۔

وہ بے اختیار دو قدم پیچپے ہٹی اور چہرے پر ہاتھ درکے بے شکنی سے غفران چھا کو دیکھا۔

”پرچہ کٹا دی گی تم، ہاں؟“ انہوں نے اس کو بالوں سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

”ہاں، ہاں۔ کٹا دیں گی۔ مجھے نہیں روک سکتے آپ لوگ۔“ وہ حلق پھاڑ کر چلائی

تھی۔

دوسرے ہی لمحے اسد چچا اٹھے اور پھر ان دونوں بھائیوں نے پکھنہ دیکھا۔ تاہر توڑ اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

آغا جان بڑے صوفے پر خاموشی سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے اسے پٹھے دیکھ رہے تھے۔ تائی مہتاب، ناعمہ اور فضہ بھی قریب ہی بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ سامیہ پکن کے کھلے دروازے میں کھڑی تھی۔ اور پیر یثیر حیوں سے ندا جھاںک رہی تھی۔

وہ اسے بری طرح گالیاں بکتے مارتے چلے گئے۔ وہ صوفے پر بے حال سی گری چیخ چیخ کر رورہی تھی، مگر ان دونوں نے اسے نہیں چھوڑا۔

”بول، کٹوانے کی پرچہ؟“ وہ دونوں بار بار یہی پوچھتے، یہاں تک کہ نہ ہال سی محمل میں جواب دینے کی سکت نہ رہی تو انہوں نے ہاتھ روک لیا۔ صوفے کو ایک ٹھوکر مار کر غفران چچا باہر نکل گئے۔

”ای!.....ای!“ وہ صوفے پر گری منہ پہ بازو رکھے گھٹی گھٹی سسکیوں سے رورہی تھی۔ سرت ادھر کہیں بھی نہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ سب بڑے ایک ایک کر کے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ یثیر حیوں سے لگی تماشا دیکھتی لڑکیاں بھی اپنے کمروں کو ہولیں۔

”مر جاؤ تم سب۔ اللہ کرے تمہارے سب کے پنجے مر جائیں، چھت گرے تم لوگوں پر... گردن کاٹ دوں میں تمہارے بچوں کی۔“ وہ ہنگیوں سے روٹی گھٹ گھٹ کر بد دعا میں دیئے جا رہی تھی۔

کتنی ہی دیر بعد لاڈنخ کا دروازہ کھلا اور دن بھر کا تھکا ہارا حسن اندر داخل ہوا۔ کوٹ بازو پر ڈالے، تائی کی ناث ڈھیلی کرتا وہ ”می، می،“ پکارتا ذرا آگے آیا تو ایک دم ساکت رہ گیا۔

کارپٹ پر بکھرے کشن اور ایک صوفہ جیسے ٹھوکر مار کر اپنی جگہ سے ہٹایا گیا تھا۔ اس پر عجیب طرح سے گری محمل..... بکھرنے بال، چہرے پر نسل۔ بازوؤں پر سرخ نشان۔ وہ بازوؤں سے آدھا چہرہ چھپائے سسکیوں سے رورہی تھی۔
وہ متغیر سا چند قدم آگے آیا۔

”محمل!“ وہ پنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”کس نے.... کس نے کیا ہے یہ سب؟“

”مر جاؤ تم۔“ ایک دم بازو ہٹا کر اس نے حسن کو دیکھا اور پھر چلائی تھی۔ ”خدا کرے تم سب مر جاؤ، قیمتوں پر ظلم کرتے ہو، خدا کرے تمہارے بچے مر جائیں، سب کے۔“

”محمل! مجھے بتاؤ، یہ کس نے کیا ہے؟ میں.....“

”مر جاؤ تم سب۔“ وہ پوری قوت سے چلائی، پھر یک دم پلک کر رو دی اور انہوں نے کھڑا تھا اپنے کرے کی طرف بڑھ گئی۔



رات کے تیرے پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مدھم سی چرچاہت سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ لا دنچ سنائے اور تاریکی میں ڈوبا تھا۔

وہ ذکھتے جسم کو زبردستی گھسیتی تھی وی تک آئی۔ ساتھ ہی فون اسٹینٹ رکھا تھا۔ اس نے کارڈ لیس نکالا اور ادھر ادھر احتیاط سے دیکھتی واپس آئی۔

سرت آج گھر پر نہ تھیں۔ صبح جب وہ مسجد جانے کے لئے نکلی تھی تو سرت گھر پر ہی تھیں، مگر شاید اس کے جاتے ہی ان کو کہیں بھیج دیا گیا تھا۔ غالباً ارضیہ پھیپھو کے گھر۔ وہ دروازے کی کنڈی لگا کر بیٹھ پڑی۔ لائٹ آن کر کھی تھی۔ سامنے دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ اسے اپنا عکس سامنے ہی دکھائی دے رہا تھا۔

لبے بال چہرے کے اطراف میں گرے، سوچے ہونٹ، ماتھے اور گال پر سرخ سے نشان جو نیلے پڑ رہے تھے۔ اس نے بے اختیار بال کانوں کے چیچپے اڑ سے۔ وہ کارڈ ابھی تک اس کی جیز کی جیب میں تھا۔ اس نے مڑا تڑا سا وہ کارڈ نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔

پہلی گھنٹی پوری بھی نہ گئی تھی کہ چونکی سی ”جیلو“ سنائی دی۔

”اے..... اسے ایسی پی صاحب؟“ اس کی آواز لڑکھڑا تھی۔

”کون؟“ وہ چونکا تھا۔

”میں..... میں..... میں.....“ اسے اپنا گھنڈی انداز یاد کر کے رونا آیا۔

”میں؟..... کدھر ہو تم؟..... خیریت ہے؟“

وہ چپ رہی۔ آنسو اس کے چہرے پر لٹکتے گئے۔

”میں! بولو۔“

”مجھے..... مجھے انہوں نے ٹارچ کیا ہے۔ مارا ہے۔“

”اوہ..... اب وہ چپ ہو گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔“ اب کیسی ہو؟“

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ رونے لگی تھی۔ ”مجھے بتائیں، فواد بھائی جیل میں ہیں؟“

”ہے تو سہی۔ مگر شاید جلد ہی اس کی ضمانت ہو جائے۔ وہ لوگ عنقریب تمہیں میرے خلاف گواہی دینے پر اکسائیں گے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”مان جاؤ۔“

”کیا؟“ اس نے بے یقینی سے فون کو دیکھا۔ عجیب سر پھرا شخص تھا۔

”تم جھوٹا وعدہ کر لو کہ تم میرے خلاف بیان دو گی۔ ورنہ یہ تمہیں کورٹ میں نہیں پہنچنے دیں گے۔“

”اوہ کورٹ میں جا کر کمر جاؤں؟“

”ہاں، وہاں سب صحیح بتادیتا۔“

”اوہ وہ اس دھوکے پر میرا کیا حشر کریں گے، آپ کو اندازہ ہے؟“

”تم اس کی پروا.....“

”آپ سب مجھے اپنے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں، آپ کو مجھ سے کوئی پچی ہمدردی نہیں ہے۔“

چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر ہمایوں نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔

وہ ذکھی سی فون ہاتھ میں لئے بیٹھی رہ گئی۔

اسے دیکھ کر ایک جامد سی چپ ہوئوں پلگ گئی۔ بہت دیر بعد آہستہ سے بو لیں تو بس اتنا کہہ۔

”تم فواد کے خلاف ضرور گواہی دو گی۔ انہوں نے میری بیٹی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ اور پھر چپ چاپ کام میں لگ گئیں۔

پورے گھر کا اس سے سوچل بایکاٹ تھا۔ وہ کمرے میں کھانا کھاتی اور سارا دن اندر ہی بیٹھی رہتی۔ باہر نہ نکلتی۔ اگر نکلتی بھی تو کوئی اس سے بات نہ کرتا۔

اس روز بہت سوچ کر وہ فرشتے سے ملنے مسجد چلی آئی۔ فی الحال اس کے کہیں آنے جانے پر کوئی روک نوک نہ تھی۔

کالونی کی سڑک گھنے درختوں کی باڑ سے ڈھکی تھی۔ درختوں نے سارے پہنچنے کی چھایا کر رکھی تھی۔ آہنی گیٹ کے سامنے رک کر اس نے گردن اور پرانہ تھا۔

سفید اوپنے ستونوں والی وہ عالیشان عمارت اپنے ازلی وقار و تمکنت کے ساتھ کھڑی تھی۔ برابر میں بزر بیلوں سے ڈھکا بنگلہ تھا، جس کے بیرونی دیوار کے ساتھ ایک خالی سنگی بیجخ نصب تھا۔ محمل جب بھی ادھر آتی، وہ بیجخ ویران نظر آتا۔ اسے بے اختیار بس اشاپ کا بیجخ اور وہ سیاہ فام لڑکی یاد آئی تھی۔ نہ جانے کیوں۔

سفید سنگ مرمر کی لش پیش چمکتی راہداریاں آج بھی ویسی ہی پُر سکون تھیں جیسی وہ ان کو چھوڑ کر گئی تھیں۔ وہ ادھر ادھر کلاسز کے کھلے دروازوں میں جھائختی آگے بڑھتی گئی۔

”باب، دجال مدینہ طیبہ میں نہ آ سکے گا۔“

آخری کھلے دروازے سے اسے فرشتے کی آواز سنائی دی۔ اس نے ذرا سا جھانکا۔

وہ کتاب ہاتھ میں لئے منہک سی پڑھا رہی تھی۔ سیاہ عبایا کے اور پرمی اسکارف میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور وہ سنہری چمک دار کرشل کی سی آنکھیں اس نے کہیں دیکھ رکھی تھیں..... مگر کہاں؟

وہ ان ہی سوچوں میں گھری دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی، جب فرشتے باہر آئی۔

”ارے محمل! السلام علیکم۔“

اور اسے دیکھ کر خود وہ بھی بہت خوش ہوئی تھی۔

”تم کیسی ہو محمل؟..... آؤ، بلکہ یوں کرو، میرے ساتھ اندر آفس میں چلتے ہیں۔“

فرشتے نے اس کا ہاتھ ہولے سے تھاما اور پھر اسے تھامے ہی اسے مختلف راہدار یوں سے گزارتی اپنے آفس تک لا لی۔

”اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟“

”پتہ نہیں۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے میز کی ششی کی سطح میں اپنا عکس دیکھا۔ بھوری اوپھی پونی ٹیلی سے نکلتی لاپرواٹیں، آنکھوں تک گہرے حلقات، ماتھے اور گال پر گہرے نیل اور ہونٹوں کے سوچے کنارے۔

یکدم روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو اس نے آنکھیں چند ٹھیک کر چہرہ پیچھے کیا۔

فرشتے اپنی کرسی کی پشت پر کھڑکی کے بلاسند ذکھول رہی تھی۔

”ہمایوں نے بتایا تھا، تم نے اسے کال کی تھی؟“

وہ ذرا سی چوکی۔ ہمایوں ہر بات کیوں اسے بتاتا تھا؟ اسے یہ نہیں بتانا چاہئے تھا۔

”ہمایوں کو تمہاری بہت فکر تھی۔“ وہ واپس کرسی پر آیا۔

”انہیں میری نہیں، اپنی فکر ہے۔ بہت خود غرض ہیں آپ کے کزن۔“

”جانے دو۔“ وہ نرمی سے سکراتی۔ ”کسی کے پیچھے اس کا براؤ ذکر نہیں کرتے۔“

”جو بھی ہے۔“ اس نے شانے اچکائے۔ یقیناً وہ اپنے کزن کی براہی نہیں سن سکتی تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ۔“ وہ ذرا کرسی پر آگئے کوہوئی۔ ”آگے پڑھائی کا کیا پروگرام ہے؟“

”ستمبر میں یونیورسٹی جوانی کرنی ہے۔“

”تو ابھی گریسوں کی پیشیوں میں ادھرا سکول آ جاؤ، قرآن پڑھنے۔“

”آ..... نہیں..... ایکچوئی..... میرے پاس قرآن ہے ترجیحے والا۔ گھر میں پڑھ لوں گی۔“

”بی ایس سی میں کون سا سمجھیکش تھا؟“

”میتھس۔“

”کس سے پڑھا تھا؟“

”کانج میں پروفیسر سے اور شام میں ایک بائی کے پاس ٹیوشن لینے جاتی تھی۔“
”میتھس کی بجک تھی تو سہی تمہارے پاس، پھر دو دو جگہ سے کیوں پڑھا؟ گھر بیٹھ کر
پڑھ لیتیں۔“

”گھر میں خود سے کیسے پڑھا جاتا ہے؟ اور....“ پھر رک گئی، اور جیسے سمجھ کر گھری
سانس لی۔ ”قرآن اور نصابی کتابوں میں فرق ہوتا ہے۔“

”اسی لئے ہم چار سال کی عمر سے گھنٹوں نصاب کو پڑھتے رہتے ہیں، اور قرآن کو
بڑھا پے کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔“

”مگر قرآن کو اللہ نے آسان بنا کر اتنا را ہے، تاکہ ہر کوئی سمجھ سکے۔ میتھس، شیر
کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔“

”قرآن آ جاتا ہے؟“

”ہاں، کیوں نہیں۔“

فرشتے نے گھری سانس لی اور جھک کر دراز سے ایک سیاہ جلد والی دبیز کتاب
ٹکالی۔

”یہ انجلیل مقدس کا ایک قدیم اقتباس ہے۔ اس میں محمد ﷺ کے ظہور کی پیش گوئی
ہے۔ کافی دلچسپ ہے یہ، پڑھو۔“ اس نے ایک صفحہ کھول کر اس کے سامنے کیا۔ محمل نے
کتاب اپنی جانب کھسکائی۔ ”بعد میں یہ حذف کر دیا گیا تھا۔“

”اس کی امت کی انجلیل ان کے سینوں میں ہوں گی۔“ وہ بے اختیار پڑھتے
پڑھتے رکی۔ ”انجلیل؟“ اس نے پوچھا۔

”انجلیل کی جمع۔ مراد ہے قرآن مجید۔ یہ یہاں سے پڑھو۔“ فrustے نے ایک جگہ
انگلی رکھی۔ مخروطی سپید انگلی جس کا گلابی تاخن نفاست سے تراشیدہ تھا۔ اس نے انگلی میں
زمرد جڑی چاندی کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔

”اوہ اچھا!“ وہ ادھر سے پڑھنے لگی۔

”وہ بازاروں میں شور کرنے والا ہو گا نہ بے ہودہ گو۔ نام احمد ہو گا۔ ولادت مکہ،

ہجرت طیبہ اور ملک شام ہوگا۔ وہ آفتاب کے سایوں پر نظر رکھنے والا ہوگا۔ اس کے اذان دینے والے کی پکار دور تک سنی جائے گی۔” وہ رک کر، جیسے الجہ کر پھر شروع سے دیکھنے لگی۔

”ملک شام ہوگا؟“ اس نے سوالیہ نگاہ فرشتے ہی طرف اٹھائی۔

”بعد میں مسلمانوں کی حکومت شام تک پھیل گئی تھی، اسی طرف اشارہ ہے۔“

”اور آفتاب کے سایوں پر نظر رکھنا؟“

”نمازوں کے اوقات کے لئے۔“

”اور اذان دینے والا؟“

”بلال۔“ فرشتے جواب دیتے ہوئے مسکرائی۔ ”گھر بیٹھ کر پڑھو گی تو یہ سوال کس سے پوچھو گی؟“

”قرآن کی تفاسیر بھی تو پڑھ سکتے ہیں۔“

”علم پڑھنے سے نہیں، سننے سے آتا ہے۔“

”آخر گھر بیٹھ کر پڑھنے میں کیا ہے؟“

”موی کو خضر کے پاس جانا پڑتا ہے میری جان! خضر، موی کے پاس نہیں آتے۔ اچھی کوائی کے علم کے لئے اتنا ہی سفر کرنا پڑتا ہے۔“

”آپ..... آپ کی ساری بات ٹھیک ہے مگر..... میری بات بھی ٹھیک ہے۔“

”مدد بین بین ذالک، لا الی هولا، ولا الی هولا۔“ فرشتے پین کو انگلیوں کے درمیان گھماتی مسکرا کر مگری سانس لے کر بوی۔ (وہ ان کے درمیان تذبذب میں ہیں، نہ ادھر کے ہیں، نہ ادھر کے ہیں)

”آپ نے عربی میں کچھ کہانا، اب عام بندے کو عربی کہاں سمجھے میں آتی ہے؟ قرآن اردو میں کیوں نہیں اتراتھا؟“

”اچھا سوال ہے۔“ وہ اپنی نشست سے اٹھی اور سامنے کتابوں کے روک کی طرف بڑھ گئی۔ پھر سیدھی کھڑی کتابوں کی جلدیوں پر انگلی گزارتی ایک کتاب کو تلاش کرنے لگی۔

”تو تمہارا نقطہ یہ ہے کہ صرف خالی محاورتاً ترجمہ دیکھ کر قرآن پڑھنا بھی کافی ہے۔“ اس نے ایک کتاب پر انگلی روکی اور اسے کھینچ کر باہر نکلا۔

”یہ سورۃ بنی اسرائیل میں ابلیس کے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے کا قصہ ہے۔ یہاں ابلیس نے اولاد آدم کے لئے کیا لفظ استعمال کیا۔ یہ پڑھو۔“ اس نے بڑا ساتھ جسے والا قرآن اس کے سامنے کھول کر رکھا اور اپنی زمرہ جزوی انگوٹھی والی انگلی ایک لفظ پر رکھی۔ محمل بے اختیار قرآن پر جھکی۔

”لا حستکن، البتہ میں ضرور قابو کروں گا۔“ اس نے لفظ اور ترجمہ دونوں پڑھے۔

”راست۔ اگر البتہ میں اور ضرور کے خواز کو نکال دو تو تین حرفي لفظ رہ جاتا ہے۔ حنک یعنی حنک، حنک کے تین معانی ہوتے ہیں۔ کسی چیز کو خوب بار کی میں سمجھنا، مذبوح کا کھیت کا صفائیا کرنا اور گھوڑوں کے جبڑوں کے درمیان سے لگام گزار کر گھوڑے کو قابو کرنا۔ اردو میں بس اتنا لکھا ہے قابو کرنا۔ جسے انگریزی میں کنٹرول کہتے ہیں۔ جبکہ عربی کی وسعت ہمیں بتاتی ہے کہ شیطان کس طرح ہماری نفیات سمجھ کر ہمارے ایمان کا صفائیا کر کے ہمیں لگام ڈالتا ہے اور وہ لگام عموماً نہ کے راستے۔ ڈالی جاتی ہے اور قرآن اسی لئے عربی میں اڑا..... اور تم میری بات سے بور ہو رہی ہو۔ چلو جانے دو۔ ابھی تمہارے پاس ٹائم ہے، اس لئے کہہ رہی تھی، ورنہ بعد میں دنیاوی تعلیم میں کھو کر تمہیں اس کا وقت نہیں ملے گا۔“

”یعنی آپ بھی ٹیکل مولویوں کی طرح بنیادی تعلیم کو گناہ سمجھتی ہیں؟“

”میں دنیاوی تعلیم میں کھو کر مادہ پرست بننے کو گناہ سمجھتی ہوں۔“

”اچھا، میں چلتی ہوں۔“ وہ بیگ کندھے پر ذاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے، گھر میں سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”پریشان وریشان کوئی نہیں ہوتا۔ تمہیوں کی پرواکسی نہیں ہوتی۔“

”کون پیتم؟“ فرشتے نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں۔ میرے ابا نہیں ہیں۔“

”عمر کیا ہے تمہاری؟“

”بیس سال۔“

”پھر تو تم تیم نہیں ہو۔ تیم تو اس نابالغ بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہو جائے۔ بلوغت کے بعد کوئی تیم نہیں ہوتی۔ اپنی اس خودتری کو اپنے اندر سے نکال دو مجمل!“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ مجمل بے یقین سے پچھے ہٹی اور چند لمحے اسے یونہی بے اعتماد نگاہوں سے دیکھ کر، دنا کچھ کہہ تیزی سے باہر بھاگ گئی۔

فرشتے کی بات نے ایک دم اسے بہت ڈشرب کر دیا تھا۔

”بھاڑ میں گئی ڈکشنری اور لغوی معنی۔ میں تیم ہوں۔“ وہ تیزی سے راہداری عبور کر کے برآمدے میں آئی۔ آگے نکل ہی نہ پائی تھی کہ ریپشنٹ نے روک دیا۔

”السلام علیکم! یہ آپ کا ایڈیشن فارم۔ فرشتے بامی نے کہا تھا کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔“

”اُف!“ وہ گہری سانس بھر کر ڈیک کے قریب آئی۔ ”دکھائیے۔“

”بس دیکھ کر واپس کر دوں گی۔ مجھے مولوی نہیں بننا، ماشرز کرنا ہے۔ اس نے سوچا۔

”نیا نج کون سا ہے؟“ وہ اب پر اسپلیکش کے صفحے پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

”علم الکتاب۔ پرسوں ہیلی کلاس ہے۔“

”میں فرشتے کو صاف انکار کر دوں گی، بھلے وہ ہر امنا ہے۔“ بس پورا دیکھ کر واپس کر دوں گی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

”اور یہ فارم فل کر کے کھرد دینا ہے؟“

”اسی ڈیک پر۔“

”اورفیس؟“

”علم کی فیس نہیں ہوتی۔“

”پھر بھی، کچھ چار جزو ہوں گے۔“

”ہم قرآن پڑھانے کے چار جزو نہیں لیتے۔“

”تو نہ لیں۔ مجھے کون سا ادھر داخلہ لیتا ہے۔ میں تو پورا دن اسکارف لپیٹ کر قرآن نہیں پڑھ سکتی۔ آئی ایم سوری فرشتے! مگر میں یہ نہیں کروں گی۔“ اس نے خود کلائی کی تھی۔

مگر دس منٹ بعد وہ فارم فل کر رہی تھی۔



وہ بیگ کو اسٹریپ سے تھاے، ہاتھ گرانے یوں تھے تھکے قدموں سے چل رہی تھی کہ بیگ لکتا ہوا زمین کو چھور رہا تھا۔ کالونی کے گھنے درخت خاموشی سے جھکے کھڑے تھے۔ وہ آہستہ سے شیخ پر جا پہنچی جو آج بھی اُداس تھا۔ وہ فارم جمع کراکے فرشتے سے ملے بغیر وہاں سے نکلی تھی۔ ابھی تک وہی سوچ رہی تھی، تب ہی کسی کے ذور سے دوڑتے قدم اس کے قریب ست پڑے۔

”کیسی ہو؟“ کوئی اس کے پاس آ کر رہا ہوا۔

اس نے ہولے سے سراخایا۔

ہمایوں بہت سمجھیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ ٹراوُزر پر رف سی سفید شرت پہننے، مانچے کے گلے بال اور چہرے پنی، پھولی سانس، جیسے تیز جاگنگ کرتا ادھر آیا تھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے آپ کو؟“

”فرق تو پڑتا ہے۔ تمہیں یوں دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ تم میرے خلاف کورٹ میں پیش ہونے کے لئے تیار ہو گئی ہو۔“

”ہونا پڑے گا، مگر اب کیا کروں؟“

”پچھنا کرو۔“ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ محمل چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی، جو سامنے گھنے درختوں کی باڑ کو دیکھ رہا تھا۔ ”جب تک تم عدالت میں جاؤ گی، ہمارا پھنڈا فواد کی گردن کے گرد مزید شک ہو چکا ہو گا۔ بس ابھی ان کی مانسی جاؤ اور کورٹ میں بچ بول دینا۔“

ہستیاں کر لیں سب مجھے اپنے اپنے مقاصد کے لئے۔ وہ دکھ سے سر جھکتی اٹھی اور زمین پر گرا بیگ اسٹریپ سے اٹھایا۔

”کمزور ہو گئی ہو بہت۔ اپنا خیال رکھا کرو۔“

”آپ کی فکر میں بھی غرض پوشیدہ ہے۔ کاش میں آپ کے خلاف بیان دے سکوں۔“ وہ تیز تیز قدموں سے سڑک پر آگے بڑھ گئی۔

وہ شانے اچکا کر گیٹ کی طرف آیا۔ گیٹ بند کرتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کو گردن موڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا جو سر جھکائے تیز تیز سڑک کے کنارے چلتی جا رہی تھی۔ اس کی بھوری اوپنی پونی ٹھیل گردن پر برابر جھوول رہی تھی۔

ہالیوں پلٹ کر ڈرائیورے پر جا گنگ کی طرح بھاگتا ہوا اندر بڑھ گیا۔

درختوں کی باڑ اور پتھر کا بیچ پھر سے دریان ہو گئے۔



”ہیلو؟“

وہ بیٹھ سے بیک لگائے، گھننوں پر پاپیکش رکھے سر بری سا پڑھ رہی تھی جب دروازہ کھلا۔ آواز پر محمل نے سرا اٹھایا۔

چوکھت میں آرزو دکھڑی تھی۔ ریڈ ٹراؤزر کے اوپر سلیولیس سفید شرت، یہ اس کا مخصوص ایکسرسائز کا بیاس تھا۔ کئے ہوئے بال شانوں تک آتے تھے۔ پتلی کمان کی طرح بھنوئیں اٹھائے وہ سکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیسی ہو؟“ انداز دوستانہ تھا۔ محمل بمشکل سنبھل پائی۔

”ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟“ وہ سیدھی ہو ٹیکھی اور پاپیکش نامحسوس انداز سے ایک طرف کھسکا دیا۔

”تیک!“ وہ بے تکلفی سے اس کے بیٹھ کے کنارے ٹک گئی۔ اور آتے ہوئے اس نے دروازہ پورا بند کر دیا تھا۔ محمل بے تینی سے اسے دیکھ رہی تھی، جو عادتاً بالوں میں انگلیاں چلاتی، اپنی پتلی بھنوؤں کو سیکڑے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

”کتنا چھوٹا کمرہ ہے تمہارا محمل؟ ایسٹ لیسٹ آغا جان کو تمہیں پر اپر بیٹھ روم دینا چاہئے تھا۔ بعض دفعہ آغا جان بہت زیادتی کر جاتے ہیں۔ ہے نا؟“ اس نے رائے مانگی۔ محمل نے ایک نظر دروازے کو دیکھا۔ وہ بند تھا۔

”معلوم نہیں۔“

”تم کہوتے میں ابا سے کہہ کر تمہیں بڑا روم دلا دوں؟“

(یہ خیال اتنے سالوں میں تو آپ کو نہیں آیا۔ آج کیوں؟)

”اُس اور کے۔ میں خوش ہوں۔“ اس نے پھر سے بند دروازے کو دیکھا۔ ”مجھے آغا جان سے کوئی شکایت نہیں۔“

”خیر، آغا جان کی ہی کیا بات۔ خود فواد نے تمہارے ساتھ کتنی زیادتی کی۔ کم از کم گھر کی عزت کا ہی خیال کیا ہوتا۔“

”آپ کو..... آپ کو میرا یقین ہے؟“ اسے جھکا لگا تھا۔

”آف کورس۔ فواد کو کون نہیں جانتا۔ اور اب تو یہ لوگ تمہارے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔“

”کیسی سازشیں؟“ وہ محتاط ہوئی۔

”یہ تم سے اس اے الیں پی کے خلاف بیان دلوائیں گے۔ کیا نام تھا اس کا..... ہمیوں؟“ اس کا انداز بے حد سرسراں تھا۔

”ہمیوں داؤد۔“ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

”ہاں، اسی کے گھر فواد تمہیں لے گیا تھا تا۔ کہہ رہتا ہے وہ؟“ اب آرزو بہت ہی لاپرواں سے کہتی ادھر ادھر زیادہ دیکھ رہی تھی۔

”یہ تو مجھے نہیں پتہ آرزو باتی! کہ وہ کس کا گھر تھا۔“

”فون نمبر تو ہو گا تمہارے پاس؟“

”جی ہے۔ آپ کو چاہئے؟“

”ہاں بتاؤ۔“ آرزو یکدم الرٹ سی ہوئی۔ سارا سرسرا پن اڑنچھو ہو گیا۔

”ون فائیو پکال کر لیں، یہی نمبر ہوتا ہے پولیس والوں کا۔“ اس نے مسکراہٹ دبائے پر اسٹیکس پھر سے اٹھایا۔

”خیر رہنے دو۔ مجھے کام ہے، چلتی ہوں۔“ آرزو ناگواری سے کہتے ہوئے تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

ان کا بھی کیسا دل ہے، فٹ بال کی طرح۔ فواد اور ہمیوں کے درمیان لڑھکتا رہتا

ہے، ہونہے۔ اس نے استھرا ایسے سر جھک کر پھر سے پا سپیکلش اٹھا لیا۔



آج کتنے ہی دنوں بعد وہ خود سے ناشتے کی میز پر موجود تھی۔ کسی نے اس کو مخاطب نہ کیا۔ وہ خود بھی خاموشی سے تیز تیز لقے لے رہی تھی۔ یونیفارم کی سفید شلوار قمیص پہنے اور بے بلی پنک اسکارف گردن میں ڈالے، بالوں کی اوپنجی پونی ٹیل بنائے، وہ اپنی پلیٹ پر جھکی تھی۔

”محمول!“ فضہ چجی نے خود ہی اسے مخاطب کیا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ ”کافی جوان کر لیا ہے؟“

تو س پر جیم لگاتے حسن نے چوک کر اسے دیکھا جو سر جھکائے ناشتے میں گئن تھی۔ اوپنجی بھوری پونی سے ایک لٹ نکل کر گال کو چھوڑ رہی تھی۔ فضہ کے پکارنے پر اس نے گردن اٹھائی۔

”نہیں۔ ایک انسانی ثبوت میں ایڈیشن لیا ہے۔“

”کیا پڑھتی ہو ادھر؟“

”میں بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“ وہ کرسی دھکیلتی اٹھ گئی۔ حسن کی نگاہوں نے دور تک اسے باہر جاتے دیکھا تھا۔

سکول کی ایک راہداری میں لگے ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اسکارف کو سر پر رکھا اور چہرے کے گرد نفاست سے لپیٹ کر پن لگائی، یوں کہ دلکشی سنبھلی رنگت والا چہرہ، بے بلی پنک بیضوی ہالے میں مقید ہو گیا۔ اوپنجی پونی ٹیل کے باعث پیچھے سے اسکارف قدرے اور پر اٹھ گیا تھا۔

”ہوں..... ناس!“ وہ خود کو سراہتی واپس برآمدے تک آئی۔ گھر سے اسکارف لے کر آنا اسے عجیب سالگ رہا تھا، سو یہیں آکر اسے سر پر رکھ لیا۔

برآمدے سے چوڑی میرھیاں نیچے ہال میں جاتی تھیں۔ ساتھ ہی جو توں کا ریک پڑا تھا۔ اس نے جوتے ریک پر اٹارے اور ننگے پاؤں سنگ مرمر کے ٹھنڈے زینے اترنے لگی۔

وستح و عریض prayer ہال بھرا ہوا تھا۔ قاتلین پے سفید چادریں پچھی تھیں۔ ان پے بہت سلیقے سے صفوں میں ڈیک لگے تھے۔ وہ ڈیک زمین سے بازو بھرہی اونچے تھے، جیسے عموماً رسول میں ہوتے ہیں۔ ڈیکوں کے پچھے سفید یونیفارم اور بے بی پنک اسکارف سے ڈھکے ہر دوں والی لڑکیاں سفید چادر دوں پے دوز انو موڈب سی بیٹھی تھیں۔

محل نے آہستہ سے آخری بیٹھی پے پاؤں رکھا۔ وہ ہال کے آخر میں تھی۔ اس کے سامنے ان ساری صفوں میں بیٹھی لڑکیوں کی پشت تھی۔ سامنے اونچے پلیٹ فارم پے میڈم کی کری اور شیبل تھی۔ ان کے پیچھے دیوار پے وہ کیلی گرافی آویزاں تھی۔

”قرآن ان سب چیزوں سے بہتر ہے، جنہیں لوگ جمع کر رہے ہیں۔“

اسے لگا دہ ان لڑکیوں کی طرح نیچے نہیں بیٹھ سکے گی۔ سو ہال کے آخر میں دیوار سے لگی کرسیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اس کی کتابیں خاصی انٹرنسنگ تھیں۔ کتاب الطہارۃ، کتاب الزکوۃ، کتاب العلم، کتاب الصلوۃ، کتاب الصیام، کتاب الحج و عمرہ..... چھوٹے چھوٹے کتابیے تھے۔ باقی ایک سیپارہ تھا۔ پہلا سیپارہ، بہت بڑے سائز کا۔ ہر صفحے پے بڑی بڑی پانچ عربی کی سطور تھیں اور ہر دو کے درمیان تین خالی لائیں تھیں، غالباً نوش لینے کے لئے۔ عربی کے ہر لفظ تکے اس کا اردو ترجمہ ایک چوکور خانے میں لکھا تھا، یوں ہر لفظ الگ الگ نظر آتا تھا۔ وہ دس منٹ لیٹ تھی۔ میڈم مصباح کا پھر شروع ہو چکا تھا۔

”سب سے پہلے تو آپ لوگ یہ ذہن میں رکھیں کہ یہاں آپ کو دین پڑھایا جائے گا، مذہب نہیں۔ دین اور مذہب میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دین religion کو کہتے ہیں اور مذہب عقیدے یا اسکوں آف تھاٹ کو۔ دین پڑھنے سے قبل ایک بات ذہن میں نقش کر لیں اور گرد سے باندھ لیں۔ دین میں دلیل صرف قرآن کی آیت یا حدیث صلی اللہ علیہ وسلم سے دی جاسکتی ہے۔“

اب وہ سورۃ فاتحہ سے آغاز کر رہی تھیں۔

”الحمد للہ..... عربی کے الفاظ تین یا چار حروف سے بنتے ہیں، جنہیں ہم روٹ ورڈ کہتے ہیں۔ الحمد میں ”حمد“ کا روٹ ورڈ حامیم دال (ح م د) ہے۔ یعنی تعریف، اسی

”حمد“ سے حامد، حماد، احمد، محمد، حمید، محمود بنہتے ہیں۔ حامد تعریف کرنے والا۔ احمد تعریف والا۔ حمید خوب خوب تعریف والا..... جب آپ قرآن کو لائل درڈ فینیشن پر پڑھیں گے تو آپ اتنا انجوانے کریں گے کہ بس۔ جیسے ”مسجدہ“ کا روٹ ورد ”مسجد“ ہے۔ اس سے مسجد، ساجد، سجدہ بنتا ہے۔

پڑھانے کا انداز دلچسپ تھا۔ محمل تیزی سے نوش لے رہی تھی۔ اس نے بارہا سوچا کہ یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط، مگر اندر سے وہ متذبذب ہی رہی تھی۔

انگلے کچھ روز وہ پڑھائی میں اتنی مصروف رہی کہ فرشتے سے مل ہی نہ سکی۔ تجوید، تفسیر، حدیث کی پڑھائی..... پڑھائی صحیک تھی، اور بس صحیک ہی تھی۔ کوئی غیر معمولی چیز تو اسے ابھی سکھ نظر نہ آئی تھی۔ البتہ اپنی رائے صحیح لگی کہ قرآن میں وہی کچھ تھا جو اس نے سوچا تھا۔ نماز کا حکم، زکوٰۃ دینا، مال خرچ کرنے کی تائید، مومن، کافر، منافق کی تعریف وہی، مدینہ کے منافقوں کا ذکر۔ بھی اب مسلمان ہیں، اتنا تو پڑھ ہی رکھا تھا۔ ہاں وہ باتیں تو ہرگز نہ تھیں جس کا ذکر وہ سیاہ فام لڑکی کیا کرتی تھی۔

البتہ وہ قرآن کو بہت دھیان سے پڑھتی، الفاظ کے معنی یاد کرنے کی کوشش کرتی، نوش لیتی اور روٹ ورد و زمجھتی۔ آہستہ آہستہ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا غلط قرآن پڑھتی تھی۔ الفاظ کو مجهول ادا کرتی تھی۔

مشلب (بازیر) بی ہوتا ہے، مگر وہ بازیر (بے) پڑھتی تھی اور وہ سوچتی کہ یہ ساری ایساں، نالی دادیاں جو ہمیں قرآن سکھاتی ہیں، وہ عموماً غلط تلفظ سے مجهول ہی پڑھتی ہیں۔ س، هس اور ش کا فرق ہی نہیں پڑھ چکا۔ جب ہم زبر زیر کو بہت لمبا کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم قرآن میں ایک حرفاً کا اضافہ کر رہے ہیں۔ زبر کو سمجھ کر الف کا اضافہ کر رہے ہیں، قرآن میں تحریف کر رہے ہیں، معانی بدل رہے ہیں۔ انگریزی کو تو خوب برٹش اور امریکن لجھے میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور قرآن جس کو عربی لب و لجھے میں پڑھنے کا حکم ہے اور جس میں زبر زیر کو اصل سے زائد کھینچنا بھی حرام درجے کی غلطی شمار ہوتا ہے، اس کے سیکھنے کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔

مسجد میں ایک اور عجیب روانج تھا۔ اسے شروع میں تو عجب ہی لگا اور بعد میں اچھا۔

وہاں ہر کسی کو سلام کیا جاتا تھا۔ راہداریوں میں سے گزرتے، بیٹھیوں پر اترتے چڑھتے، جو بھی لڑکی نظر آتی، اس کو مسکرا کر سلام کیا جاتا۔ بھلے کسی کو آپ جانتے ہیں یا نہیں، مگر سلام فرض تھا۔ کسی کو مخاطب کرنے کے لئے بھی ”ایکسکیو زمی“ کی جگہ السلام علیکم کہہ کر مخاطب کیا جاتا۔ ”ایکسکیو زمی“ کہہ کر معافی کس غلطی کی مانگیں جو ہوئی ہی نہیں؟ دعا کیوں نہ دیں؟“ فرشتے نے بہت پہلے ہنس کر بتایا تھا تو وہ سوچتی رہ گئی تھی۔

ان تمام سوچوں کے بر عکس محمل قرآن کو عزت دیتی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھ پڑھی صبح کے نوش پڑھ رہی تھی، جب دروازہ ہولے سے بجا۔

اس نے حیرت سے سراہایا۔ یہ کھٹکھٹا کر کون آئے گا بھلا اس کے کمرے میں؟
”جی؟“

دروازہ ہولے سے کھلا۔ وہ ابلجہ کر آہستہ آہستہ کھلتے دروازے کو دیکھے گئی۔ یہاں تک کہ وہ پورا کھل گیا اور لمحے بھر کو تو وہ سُن سی ہو گئی، پھر جیسے بوکھلا کر نیچے اُتری۔

”آ..... آغا جان..... آپ؟“

وہ دلیز میں کھڑے تھے۔ اطراف کا جائزہ لیتے کرپ پہاڑ باندھے اندر داخل ہوئے۔

”آپ..... آپ بیٹھیں آغا جان!“ چھوٹا سا کرہ تھا، وہ انہیں کہاں بھاتی؟ جلدی سے سیپارہ اور پر شیلف پر رکھا اور بیڈ کی چادر ٹھیک کی۔ وہ خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئے۔
”ادھر آؤ بیٹا! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

یہ اس واقعہ کے بعد پہلی دفعہ تھا، جب وہ اس سے مخاطب ہوئے تھے اور انداز میں خاصی نرمی تھی۔ وہ کسی معمول کی طرح ان کے سامنے آ بیٹھی۔

”نج..... جی۔“

”محمل؟“ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے آہستہ سے ہولے۔ محمل سانس روکے ان کو دیکھے گئی۔

”فواز نے تمہارے ساتھ برا کیا۔ بہت برا۔ میں تم سے اس کی طرف سے معاف مانگتا ہوں۔“

”نہیں، نہیں آغا جان! پلیز۔“ انہوں نے دونوں ہاتھ اور انھائے تو وہ موم کی طرح پکھلنے لگی۔ بے اختیار ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔

”تمہارے ساتھ بہت زیاد تیار ہو میں، میں جانتا ہوں، اور اب میں ان کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی؟“ وہ پکھ کجھ نہ پارہی تھی۔

”میں جائیداد میں سے تمہارا حصہ الگ کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم اس کی دیکھ بھال کر سکو۔ فقیہ پرسند کی تم مالک ہو۔ تم وہ حصہ لے لو۔ میں نے وکیل کو پیپرڈ تیار کرنے کا کہہ دیا ہے۔“

وہ حق دق ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کیا تم اپنا حصہ لینا چاہتی ہو؟“

”جج..... یہی آپ کہیں۔“ بعض دفعہ اپنے حقوق کی بات اکیلے میں کہنا آسان ہوتا ہے بہ نسبت اپنے مخالفین کے سامنے۔ وہ اور پکھ کہہ ہی نہ سکی۔ بس یک نیک انہیں دیکھے گئی جو اس کے سامنے بیٹھ کی پاکتی پر بیٹھے تھے۔

”میں آج جائیداد کے کاغذ سائنس کر دیتا ہوں، مگر تم..... میری ایک شرط ہے یہ.....“ وہ لمحے بھر کو رکے، ان کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں، وہ پلک نہیں جھپک رہے تھے، اسے دیکھ رہے تھے جو دم سادھے ان کی منتظر تھی۔

”مگر تم فواد کے خلاف نہیں بلکہ اے ایس پی ہمایوں داؤد کے خلاف انہوں کے جرم کا بیان دو گی کورٹ میں۔“

وہ ادھ کھلے لب اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔

”عدالت نے ہمیں تاریخ دے دی ہے۔ اگلے ماہ کی تاریخ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم عدالت میں اپنے بیان سے نہ پھرو، تاکہ میں جائیداد کے کاغذ تمہارے حوالے کر دوں۔ جیسے ہی تم کورٹ میں بیان دو گی، میں دستخط کر دوں گا۔“

وہ انھوں کھڑے ہوئے۔ وہ انہیں دیکھنے کے لئے گردن بھی نہ انھا سکی۔

”تمہارے پاس وقت ہے، خوب اچھی طرح سوچ لو۔ اور اسے ایک بنس ڈیلگ۔“

مجھو۔ یہ تمہیں آئندہ ابراہیم کی بزنس ایضاً سنبھالنے میں مددے گی۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھے۔

”مجھے منظور ہے۔“ وہ تیزی سے بولی۔ فیصلہ کرنے میں اسے ایک بل لگا تھا۔ ’بھاڑ میں گیا ہمایوں۔ جس بے جا میں تو اس نے بھی مجھے رکھا تھا۔‘ انہوں نے مڑکر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

”تم اچھی بزنس و دس بن سکتی ہو۔ شیک کیسر۔“ اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ کیا یوں ہمایوں گرفتار ہو جائے گا؟ اور..... اور فواد..... کیا وہ گھر آجائے گا؟ نہیں....! مگر جائیداد۔ اپنے مقام کو پالینے کی خواہش۔ کبھی وہ بھی تائی پر یونہی حکم چلا سکے۔ سب اس کی عزت کریں۔ اس کے حکم سے گھر میں کام ہوں، اس کی موجودگی ہر جگہ ضروری کبھی جائے۔ وہ الجھ کر رہ گئی۔ کیا اس نے صحیح کیا؟ کچھ سمجھنا آرہا تھا۔



صحیح آئندہ بیکے وہ مسجد کے گیٹ پر تھی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے رک کر بیلوں سے ڈھکے بنگلے کو دیکھا، جس کا سنگی بنیج آج بھی دریان پر اتحا۔

”بابا! تمہارا صاحب ہے؟“ کچھ سوچ کر اس نے باور دی گارڈ کو مخاطب کیا۔

”وہ تو شہر سے باہر گیا ہے۔“

”کب آئے گا؟“

”معلوم نہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے ذرا سی ایڑی اوپنجی کر کے گیٹ کے پار دیکھا۔ ہمایوں کی گاڑی کھڑی تھی۔

”وہ..... وہ بی بی! وہ چہاڑ پر گیا ہے۔“ گارڈ قدرے گز بڑا یا۔

”بھاڑ میں گیا تمہارا صاحب میری طرف سے۔ اس سفید سر پر جھوٹ تو نہ بولو۔ نہیں لمنا چاہتا تو سیدھا منع کر دو۔ جھوٹ بولنا منافقت کی نشانی ہوتی ہے، ایمان کی نہیں۔ خدا کا خوف کرو۔“ وہ آخری فقرے قدرے نصیحت آمیز انداز میں کہتی اسکوں کے گیٹ کی طرف بڑھتی۔ پتہ نہیں، ہمایوں نے اس کے لئے یہ کیوں کہہ رکھا تھا۔

(اور پتہ نہیں، میں نے صحیح کیا یا غلط۔ مگر وہ ایسے میری جائیداد کبھی نہیں دیں گے، پھر اور کیا کرتی؟)

بے زار سا تاثر چہرے پر سجائے، بیک اٹھائے وہ ست روی سے برآمدے کی طرف چل رہی تھی۔

(اور یہ جھوٹ تو نہیں، اس نے تو مجھے جس بے جا میں رکھا تھا۔)

اس نے چیل ریک پہ اتاری اور خود کو گھستی ہوئی نیچے سیرھیاں اترنے لگی۔
(مگر انگوا تو نہیں کیا تھا، میں ادھراپنی مرضی سے ہی گئی تھی تو اس پہ یوں انگوا کا
الرام لگا دینا جھوٹ نہیں ہوگا؟)

وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ زینے اُتر رہی تھی۔

(نہیں، جھوٹ کہاں۔ اس نے ڈیل تو کی تھی۔ انگوا اور خریدنا ایک ہی بات ہے۔

اگر ذرا سالفظوں کا ہیر پھیر کر دوں تو کیا ہے؟)

اس نے کری پہ بیٹھ کر کتاب میں سائیڈ بورڈ پر رکھیں، اور ساتھ بیٹھی لڑکی کے سپیارے
پہ جھانکا، اور پھر مطلوبہ صفحہ کھولنے لگی۔ تقریر شروع ہو چکی تھی۔ وہ آج بھی لیٹ تھی۔

(فواڈ کے خلاف گواہی نہ بھی دوں تو بھی وہ سزا پائے گا، اور وہ اتنا بڑا اے ایس
لہ، کوئی میرے بیان سے اسے سزا تھوڑی ملے گی؟ بس لفظوں کو تھوڑا سا انٹر چینچ کر دیا
جائے، تو کیا ہے۔ میری نیت تو صاف ہے۔)

مطلوبہ صفحہ کھول کر اس نے پین کی کیپ اتاری، اور آج کی تاریخ لکھنے لگی۔

”اور تم جھوٹ کوچ کے ساتھ نہ طاؤ، اور نہ تم بچ کو چھپاؤ، حالانکہ تم خوب جانتے

ہو۔“

میڈم مصباح کی آواز پہ جیسے کرنٹ کھا کر اس نے سراٹھایا۔ وہ اپنی ٹھپر چیر پہ بیٹھی
کتاب سے پڑھ رہی تھیں۔ اس نے بے اختیار اپنے سیپارہ کو دیکھا۔ اس صفحے پر سب
سے اوپر یہی لکھا تھا۔

”تم میری آیات کے بد لے تھوڑی قیمت نہ لو، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو۔ اور تم
jhoot کوچ سے نہ طاؤ، اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو۔“

وہ سن کی، بے حد ساکت سی، پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان الفاظ کو دیکھ رہی تھی۔ میڈم
آگے پڑھ رہی تھیں مگر اسے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ ساری آوازیں جیسے بند ہو کر رہ گئی
تھیں۔ وہ پناپلک جھپکے ان ہی الفاظ کو دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور اپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم
کتاب پڑھتے ہو۔ کیا پھر تم عقل سے کام نہیں لیتے؟“

اے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ ذرا دیر پہلے گارڈ کو کی گئی فصیحت اس کے کانوں میں گنجی۔ اے لگا، وہ کتاب اس سے زیادہ جانتی ہے۔

(پھر.....پھر.....میں کیا کروں؟) اس کا دل کاپنے لگا تھا۔ بے اختیار اس نے رشی تھامنا چاہی۔ کلام کی رشی۔ وہ نہ جانتی تھی کہ دوسرے سرے پر کون ہے، مگر اے یقین تھا کہ دوسرے سرے پر کوئی خود موجود ہے۔

”بھر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔ بے شک وہ (نماز) سب پر بہت بھاری ہے، سوائے ان کے جو ذر نے والے ہیں۔“

اس نے وحشت زدہ سی ہو کر سراخایا۔ پنک اسکارف والے بہت سے سراپی کتابوں پر بھکے تھے۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

اس نے پھر سے ان الفاظ کو پڑھا۔ وہ کوئی مضمون نویسی نہ تھی، وہ گفتگو تھی۔ ”اوامی گاؤں“ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”It's talking to me“

ساتھی بیٹھی لڑکی نے سراخایا۔

”تو یہ ناک ہی تو ہے۔ کلام۔ اس کو ہم کلام پاک اسی لئے تو کہتے ہیں۔“ وہ سادگی سے کہہ کر اپنے سیپارے پر بھک گئی۔

محمل نے سیپارہ بند کر دیا اور کچھ بھی اٹھائے دنا، تیزی سے بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی گئی۔

فرشتبے اپنے آفس میں آئی تو وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”محمل تم؟“

”میں.....میں آئندہ نہیں آؤں گی، میں مسجد چھوڑ رہی ہوں۔“ وہ جو کرسی پر بیٹھی، بے چینی سے کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف اور گھبراہٹ تھی۔ فرشتبے نے آرام سے فائل میز پر رکھی اور کرسی کی دوسری جانب جگہ سنچالی۔ کھڑکی کے بلاسندہ زندگی تھے۔ کمرے میں چھاؤں سی تھی۔

”آپ میری بات سن رہی ہیں؟“

”بیٹھو۔“ وہ میز کی دراز کھول کر جھلک پکھہ تلاش کرنے لگی تھی۔ محمل بمشکل ضبط کرتی کری پکی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ ادھر سے بھاگ جائے۔
”میں نہیں آؤں گی آئندہ فرشتے؟“ اس نے دہرا�ا۔ وہ ابھی تک دراز سے مصروف تھی۔

”پھر کہاں جاؤ گی؟“

”بس، قرآن چھوڑ رہی ہوں۔“

”اے چھوڑ کر کہاں جاؤ گی محمل؟“ وہ پکھہ کاغذات نکال کر سیدھی ہوئی اور اسے دیکھا۔

”اپنی نارمل لائف میں۔“

”تمہیں یہ اہنارمل لائف لگتی ہے؟“

”یہ مجھ سے بات کرتی ہے فرشتے؟“ وہ دلبی دلبی سی چھین۔ ”آپ سمجھ نہیں سکتیں، میں کتنے کرب سے گزر رہی ہوں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔ آپ سمجھ نہیں سکتیں۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں، جب قرآن مخاطب کرنے لگتا ہے تو سب اس کرب سے گزرتے ہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے سختی سے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”وہ کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا، جو میرے ساتھ ہوا، آپ تصور نہیں کر سکتیں۔“

”تمہیں لگتا ہے، تم پہلی ہو؟“

اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کیں اور سر دنوں ہاتھوں میں گرالیا۔

”ہم انسان ہی تو یہ بوجھ اٹھانے کے قابل ہیں، پھر تم اتنی کمزور کیوں پڑھ رہی ہو؟
ہم پہاڑ ہوتے تو نہ سہار سکتے۔ وہ جاتے۔“

اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ فرشتے کو وہ لمحے بھر میں بہت بیمار لگی تھی۔

”کوئی میری سوچیں پڑھ رہا ہے فرشتے؟“

”وہ حکلوں نہیں ہے، وہ کلام ہے۔ بات ہے۔ اللہ کی بات۔ اور اللہ ہی تو سوچیں“

پڑھ سکتا ہے۔“

وہ گم صمی ہو گئی۔

”میں..... میں اللہ تعالیٰ سے بات کر رہی تھی؟“

”تمہیں کوئی شک ہے؟“

”مگر..... یہ چودہ سو سال پرانی کتاب ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ پاسٹ (اضی) میں ہو کر ہم سے چودہ سو سال بعد کے نوچ (ستقبل) سے خود کو کنیکٹ کر لے؟ اس لائک اے میریکل۔“ (یہ تو مجھہ کی طرح ہے)

”یہی تو ہم اے کہتے ہیں۔ مجھہ!“

”اور جب یہ ختم ہو جائے گی؟“

”تو پھر سے شروع کر لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے، قرآن کے مجھزے بار بار دہرانے سے کبھی پرانے نہیں ہوں گے۔ فہما بتا رہی ہوں۔“

”میں..... میں اے چھوڑ دوں تو؟“

فرشته نے تاسف سے اے دیکھا۔

”محل! جب روزِ قیامت اللہ زمین آسمان کو بلائے گا تو ہر چیز کھنپی چلی آئے گی۔ طوعاً یا کرہا، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ جب ہم اللہ کے بلاں پر نماز اور قرآن کی طرف نہیں آتے تو اللہ ہمارے لئے ایسے حالات بنا دیتا ہے، یہ دنیا اتنی تک کر دیتا ہے کہ ہمیں زبردستی، سخت ناخوشی کے عالم میں آنا پڑتا ہے اور پھر ہم کہا بھی بھاگ کر آتے ہیں اور اس کے علاوہ ہمیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ اس کی طرف طوعاً آ جاؤ محل! ورنہ تمہیں کہا آنا پڑے گا۔“

پھر وہ مزید کوئی بحث نہ کر سکی۔

اسے فرشته کی بات سے بے حد خوف آیا تھا۔ اے لگا وہ اب کبھی قرآن چھوڑ نہ سکے گی۔



اگر اے معلوم ہوتا کہ اس ایک لفظ میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان چھپا

ہے تو وہ اسے کبھی مس نہ کرتی، اور نہیں تو اس کا مطلب لغت میں ہی تلاش کر لیتی۔ مگر جانے کیسے وہ اس سے لکھنا رہ گیا تھا۔

آج کارکوئی میڈم مصباح کے علاوہ ایک اور پیچر پڑھا رہی تھیں۔ میڈم ذکیرہ بنی اسرائیل کے بیکل میں داخل ہونے کا قصہ بیان کر رہی تھیں۔

”اور دروازے میں داخل ہو جاؤ، سجدہ کرتے ہوئے، اور کہو ”حُنْطَةٌ“ ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور عنقریب ہم محسینین کو زیادہ دیں گے۔“ وہ آیت پڑھ کر اب الفاظ کی گھبرائی میں جا رہی تھیں۔

”حُنْطَةٌ“ کا مطلب گرانا مراد گناہ گرانے یعنی بخشش مانگنے سے ہے۔ اب بنی اسرائیل نے کیا یہ کہ انہوں نے جیسا کہ اگلی آیت میں ذکر ہے، منہ ٹیڑھا کر کے بات کو بدل دیا۔ وہ سجدہ کرتے، یعنی جھک کر ”حُنْطَةٌ“ کہہ کر داخل ہونے کے بجائے ”حُنْطَةٌ“ hinta'tun کہہ کر داخل ہوئے۔ ”حُنْطَةٌ“ کہتے ہیں.....“

وہ تیز تیز قلم چلا کر لکھ رہی تھی کہ کسی نے برہمی سے پین اس کے رجڑ پر رکھا۔ اس نے ہڑ بڑا کر سراخھایا۔

ایک کلاس انچارج اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

”بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں، اور قرآن ان کے لئے دعا کرتا ہے۔ اور بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت کرتا ہے۔“
”کیا ہوا میم؟“

”آپ رجڑ قرآن پر رکھ کر لکھ رہی ہیں۔“ انچارج نے صدمے سے اسے دیکھا تو اس نے گھبرا کر قرآن نیچے سے نکالا۔ یہ اس کا تجوید کا قرآن تھا، سیل آف وائٹ جلد والا۔ ”سوری میم!“ اس نے قرآن احتیاط سے ایک طرف رکھا اور رجڑ پر جھک گئی۔

پھر ادھر ادھر ساتھ والی لڑکی کے رجڑ پر جھانکا کر دیکھے سکے کہ ”حُنْطَةٌ“ کا کیا مطلب میڈم نے لکھوا�ا ہے، مگر اس نے پچھنہ لکھا تھا۔ قرآن کی کلاس تھی، وہ بول نہ سکتی تھی، سو مایوسی سے واپس اپنے نوش کو دیکھا۔ صفحے کی لائن یہاں ختم ہوتی تھی، وہاں اس نے لکھ رکھا تھا۔ ”حُنْطَةٌ“ یعنی ”گند...“ گند کے دال کے آنے کے صفحے ختم تھا۔

بعض رفعہ ہم میکائی انداز میں کچھ لکھتے ہوئے جب صفحہ ختم ہو جائے تو آگے جو بھی چیز ہو، بھلے نیچے رکھی ہوئی کتاب ہو یا ذیک کی لکڑی اس پر لکھ ڈالتے ہیں، اور بعد میں یاد ہی نہیں آتا۔

”گند، اس کا مطلب ہے؟“ وہ اس ادھورے لفظ پر حیران ہوئی۔ کوئی سینس نہ بنتا تھا، مگر خیر وہ آگے لکھنے لگی۔ سوچا بعد میں کسی سے پوچھ لے گی، مگر بعد میں یاد ہی نہ رہا۔ چھٹی کے وقت اس نے ہمایوں کو اپنے گیٹ کا دروازہ بند کرتے دیکھا۔ وہ بک پڑھا کر پلاہی تھا کہ وہ سامنے آ کھڑی ہوئی۔

پنک اسکارف میں مقید چہرہ کندھے پر بیگ، سفید یونیفارم اور سینے پر ہاتھ باندھے وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ تبدیلی کیسے آئی؟“ وہ بے اختیار مکرا دیا۔ غالباً اچھے موڑ میں تھا۔ محمل اسی طرح تیکھی سخت نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

”خیریت؟“ وہ دو قدم آگے پڑھا۔ اس کے پیچے سیاہ گیٹ کے باہر اس کا مستعد چوکیدار کن اکھیوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا، جو آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ہمایوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور وہ سخت تیوروں کے ساتھ سینے پر بازو لپیٹے۔

”آپ کو سئلہ کیا ہے فواد بھائی کے ساتھ؟“

”شاطر مجرم کسی بھی پولیس آفیسر کے لئے چلتی ہوتے ہیں اور مجھے چلتی لینے میں مزا آتا ہے۔“

”اس مرے میں اگر آپ اٹا پھنس گئے تو؟“

”میں کیوں پھنسوں گا؟ تم نے کورٹ میں مگر جانا ہے تا۔“

”آپ کو کس نے کہا کہ میں مگر جاؤں گی؟“

”کیا مطلب؟“ وہ یک سخت چونکا۔

وہ اسی طرح اسے جھوٹی نگاہوں سے دیکھتی واپس ٹلٹی اور سینے پر بازو لپیٹے، سر جھکائے سڑک پر چل دی۔

عقل کے سارے راستے عجیب دھوئیں میں گم ہوتے تھے، وہ کچھ سمجھنا پا رہی تھی۔

کتنے دنوں بعد آج وہ شام کی چائے سرو کرنے ٹرالی دھکیلتی باہر لائی تھی۔ لان میں سب بڑے یونی ہیٹھے تھے۔ ادھر ادھر کی خوش گپیاں، تبادلہ خیال چل رہے تھے۔

”محمٰل! میری چائے میں کینڈرل ڈالنا بیٹھا!“ آغا جان جس بے تکلفی سے کہہ کر غفران پہنچا سے بات کرنے میں مصروف ہو گئے، ناعمرہ اور فضہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک درے کو دیکھا۔ جب سے فواد جیل گیا تھا، ان دنوں کا الائنس (اتحاد) تائی مہتاب سے ہٹ کر بن چکا تھا۔ دنوں کے خواب اسے داماد بنانے کے چکنا پور ہو گئے تھے۔ اور اب وہ مزید تائی کی خوشامدیں کرنے کے بجائے انہیں بے رخی دکھانے لگی تھیں۔

”یہ لیجئے آغا جان!“ اس نے بھی پورے اعتماد سے کپ ان کو تھما یا اور پھر تائی مہتاب کو، جو الگ سی گم صنمی ہیٹھی تھیں۔

”تھینک یو محٰل!“ جانے انہوں نے کس دل سے بظاہر مسکرا کر کہا۔ فضہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ناعمرہ کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ ناعمرہ نے ”ہونہ“ کہہ کر سر جھکا۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ اچاک وہ اس پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے تھے۔

وہ خالی ٹرے لئے اندر آئی تو سیرہیوں سے اُتر تا حسن، جو شرٹ کے گف بند کر دیا، اسے دیکھ کر لیے بھر کو رک گیا۔

”محٰل!“

ایک پرانا منظر اس کی آنکھوں میں لہرایا تھا۔ فواد کا یوں اُترنا، پھر اس کا اسے چائے دینا، اور وہ الگیوں کا نکرانا۔ کیا تب فواد نے یہ سوچا تھا کہ یہ لوگی بھی اس کا ہتھیار بن سکتی ہے۔ اتنی ارزان تھی وہ؟

منظروں ہی تھا، بس چہرہ بدل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کرچیاں سی چھینے لگیں۔

”مومن! ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈساجاتا۔“ وہ تیزی سے پکن کی طرف آئی۔

”محٰل! رکو، سنو۔“ وہ سرعت سے اس کے پیچھے پکا اور پکن کے دروازے پر ٹھہر بامگیا۔

اندر سرست پکڑے سے سلیب صاف کر رہی تھی۔ محٰل ساتھ ہی کری پر رخ موڑے

بیٹھی تھی۔ اونچی بھوری پوئی ٹیل، جس سے اس کی لمبی گردن پیچھے سے جھکتی تھی اور گرتے کے اوپر دوپٹے کوشانوں پہ ٹھیک سے پھیلائے، ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے وہ چہرہ موڑے بیٹھی تھی۔ اس کے اس ساید پوز سے بھی حسن کو اس کی جھلکی آنکھوں کا سو گوار سار ٹنگ دکھائی دیا تھا، اسے لگا وہ بہت بدلتی ہے۔

”محمل! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

سرت کا سلیب کو رُگڑتا ہاتھ تو رک گیا، انہوں نے حیرت سے گردن موڑی۔

”حسن!“

”چھی! محمل کو کہیں، ذرا میری بات سن لے۔“

انہوں نے اسے دیکھا، جو بے تاثری لب بھینچ پر جھکائے کری پہ بیٹھی تھی۔

”محمل! حسن بلا رہا ہے۔“

”میں ان کے باپ کی نوکر ہوں جو آؤں؟“ اس کا دل چاہا وہ یہ کہہ دے، مگر صحیح ہی تو فرشتے نے اس سے کچھ کہا تھا۔

”محمل!“ سرت نے پھر پکارا۔

”انہیں جو کہنا ہے، میں کہہ لیں۔ منظور نہیں ہے تو بے شک نہ کہیں۔“ وہ سر جھکائے ٹھیل کو دیکھ رہی تھی۔ ایک قسم اس اترتی فجر میں اس نے کھائی تھی، وہ قسم اسے اب آخری سانس تک بھانی تھی۔

”محمل! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟“ وہ بے بس سا اس کے سامنے آیا۔ ”وہ تمہیں فواد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ تم خود کو اس کیس میں مت الجھاؤ۔“

اس نے گردن اٹھائی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

محمل کا چہرہ بے تاثر تھا، بالکل سپاٹ۔

”آپ نے کہہ لیا جو کہنا تھا؟ اب آپ جا سکتے ہیں۔“

اس نے آلوؤں کی ٹوکری قریب کھسکا کر میز سے چھری اٹھائی۔ وہ چند لمحے بے بس سا اسے دیکھتا رہا، پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ سرت ابھی سی اس کے قریب آئیں۔

”کس کیس کی بات کر رہا ہے حسن؟“

”آلوجوشت میں بنا دوں گی، آپ قورمہ دیکھ لجئے گا اور کھیر بھی، کیونکہ میں نہیں چاہتی، کسی کو کوئی شکایت ہو۔“ وہ اب مگن سی آلوجھیل رہی تھی۔

سرت گھری سانس لے کر سلیب صاف کرنے لگیں۔ وہ جانتی تھیں، اب وہ نہیں بتائے گی۔

اور وہ آلوجھیل نے اس عجیب بات کو سوچ رہی تھی، جو صحیح اس کو فرشتے نے کی تھی۔ جب وہ رشتے داروں اور قیمتوں کے ساتھ خُسن سلوک کی آیتیں پڑھ کر توبہ کی تھی اور پوچھا تھا کہ یہ جو لوگ قیمتوں کا مال کھاتے ہیں، ان کے لئے کیا سزا بتائی گئی ہے؟

”قیمتوں سے پہلے قرابت داروں کا ذکر ہے محمل!“

”میں اور میری ماں ان قرابت داروں کی جیسے خدمت کرتے ہیں، آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

”تو اس خدمت کا کبھی ان کو احساس بھی دلا یا؟“

”اماں تو ہر وقت جتنی رہتی ہیں، مگر میں ادھار رکھنے کی قابل نہیں ہوں۔ وہ ایک کہیں تو دس سناتی ہوں، ایک ایک آسٹم گنواتی ہوں جو بناوں۔“

اس نے فخر سے کہا اور پھر فرشتے کا سنجیدہ چہرہ دیکھا تو لگا کچھ غلط کہہ دیا ہے۔

”یعنی سب کیا کرایا ملیا میٹ کر دیتی ہو، یہ تو ان پر ظلم ہے۔“

”ظلم؟..... میں ظلم کرتی ہوں ان پر؟“ وہ شاکر رہ گئی۔

”ظلم کی تعریف کیا ہوتی ہے؟ کسی کے حق میں کی کرنا۔ ایک کی ایک سنانا برابر کا بدلہ ہے، مگر نو اور سنانا زیادتی ہے، اس کے حق میں کی ہے۔“

”وہ مجھے جو بول دیں اور میں آگے سے چپ کر جاؤں؟ ایک بھی نہ سناؤں؟“

”تم اگر سناؤ گی تو سب برابر کر دو گی، پھر تم ان کے کیسے کا ٹکوہ کسی سے کرنے کی حق دار نہیں ہو گی۔ معاف کر دیا کرو۔ اور جانتی ہو، معاف کرنا کیا ہوتا ہے؟“ اس کا سر خود بخونی میں مل گیا۔

”اس کو دکھ نہ دینا جس نے آپ کو دکھ دیا ہو، ان کو ان کے رویے کا احساس تک نہ دلانا۔ کچھ نہ بتانا۔ یہ معاف کرنا ہوتا ہے۔ تم معاف کر دیا کرو، صبر کیا کرو۔“

”ساری زندگی صبر ہی تو کیا ہے میں نے۔“

”وہ صبر نہیں ہوتا جو تم کرتی ہو۔ صبر وہ ہوتا ہے کہ اگر سر پر بھاری پھر بھی لگ جائے تو بلوں سے اف تک نہ لٹکے۔ صبر وہ ہوتا ہے جو تمہاری ماں کرتی ہے۔“

”اور احسان؟“

”صبر اور معاف کرنے کے بعد ان کے برے روئیے کے جواب میں بہت اچھا روئیہ دو۔“

”میں کیوں کروں یہ سب؟ وہ کیوں نہیں کرتے؟ رشتہ داروں کے ساتھ دیساںی روئیہ رکھنا چاہئے، جیسا وہ ہمارے ساتھ رکھتے ہوں۔“

”مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہا کرتے تھے کہ بد لے کی صدر حمی کرنے والا صلح حمی نہیں کرتا۔ محمل! اس پر تو آپ کو اجر ہی نہیں ملے گا۔ اجر تو حب ملے گا، جب آپ برے کے جواب میں اچھا کریں۔ تم انہیں معاف کرو اور اپنا حق اللہ سے مانگو۔“

”انہوں نے میری جائیداد کھائی ہے۔“ وہ حق پڑی تھی۔ ”ابا اپنی ساری پر اپری میرے نام کر کے گئے تھے۔“

”بہت غلط کر کے گئے تھے پھر۔ انہیں حق ہی نہیں تھا کہ ساری پر اپری دصیت کرتے۔ ان کا حق تو بس ایک تھائی پر تھا، اس کو بے شک کسی کے نام دصیت کر جاتے، مگر باقی کے دو تھائی حصے کی شرعاً تقسیم کی اجازت دے جاتے، تو شاید تمہارے پچالوگ اپنے حصے پر قناعت کر لیتے۔ وارث تو اللہ نے بنائے ہیں۔ جانے والے کو برا بھلانہیں کہہ رہی، مگر ایک غلط فیصلہ بہت سوں کی زندگیاں خراب کر دیتا ہے۔ محمل! تم کچھ لوگوں کے غلط فیصلوں کو بنیاد بنا کر اپنے رشتہ داروں پر ظلم کرو گی تو یہ مت بھولو کہ میں صراط پر رحم اور امانت کے کانٹے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر خائن اور قطع رحمی کرنے والے کو وہ میں سے نیچے جہنم میں گرائیں گے، اور ہر امانت دار اور صدر حمی کرنے والا میں پار کر جائے گا۔ تم وہ میں سے پار نہیں کرنا چاہتیں؟“

وہ سر جھٹک کر تیز تیز آلو چھیلنے لگی۔

”میڈم! مجھے ایک بات پوچھنا ہے۔“ اُس روز وہ کلاس کے بعد میڈم مصباح کے پاس گئی تھی۔

”جی ضرور پوچھئے۔“ میڈم بہت توجہ سے اس کی طرف پڑھی تھیں۔

”وہ میسم! مجھے سے نماز پڑھی نہیں جاتی، تو خیر ہے؟“

”ہاں، کیوں نہیں خیر ہے، اس اور کے، اگر آپ نہیں پڑھ سکتیں تو۔“ محمل کو لگا، منوں بوجھ اس کے کاندھوں سے اتر گیا ہو۔ وہ ایک دم کسی قید سے آزاد ہوئی تھی۔

”وہی تو میسم! میں باقی نیکیاں کر لوں، قرآن پڑھ لوں، ٹھیک ہے نا۔ نماز پڑھنا بہت ضروری تو نہیں ہے؟“

”نہیں، اتنا ضروری تو نہیں ہے۔ اگر آپ نہیں پڑھنا چاہتیں تو نہ پڑھیں۔“

”میسم! کوئی فرق تو نہیں پڑے گانا؟“

”قطعًا فرق نہیں پڑے گا۔ یہ بالکل آپ کی اپنی مرضی پڑے ہے۔“

”اوہ..... او کے؟“ وہ بے حد آسودہ سی مکرائی۔ مگر میڈم مصباح کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”یقین کریں محمل! کوئی فرق نہیں پڑے گا اسے۔ آپ بے شک نماز نہ پڑھیں، بے شک سجدہ نہ کریں۔ جو ہستیاں اس کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کریں۔ اگر آپ کر لیں، اسے کیا فرق پڑے گا۔ اس آسمان کا باشست بھر بھی حصہ خالی نہیں، جہاں کوئی فرشتہ سجدہ نہ کر رہا ہو۔ اور فرشتہ جانتی ہیں، کتنا بڑا ہو سکتا ہے؟ جب اس پہاڑی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام کے پکارنے پر پلٹ کر دیکھا تھا تو، جبرائیل علیہ السلام کا قد زمین سے آسمان تک تھا۔ اور ان کے پیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے ہوتے ہیں فرشتے۔ 70 ہزار فرشتے کعبہ کا روز طواف کرتے ہیں، یہ تعداد عام سی لگتی ہے۔ مگر جانتی ہو، جو 70 ہزار فرشتے روز طواف کرتے ہیں، ان کی باری بھر قیامت تک نہیں آئے گی۔ اس رب کے پاس اتنی لا تعداد ہستیاں ہیں عبادت کرنے کے لئے، آپ نماز نہ بھی پڑھیں تو اسے کیا فرق پڑے گا؟“

میڈم مصباح جا بھلی تھیں اور وہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ کتابیں بینے سے لگائے ساکتی کھڑی تھی۔ اس کو لگا، وہ اب کبھی نماز چھوڑنہیں سکے گی۔

شام میں اس نے بہت اہتمام سے عصر پڑھی۔ پڑھ کر لاونچ میں فون اسٹینڈ کے ساتھ بیٹھی ہی تھی کہ نادیہ کوفون کرنے۔ نعمہ چھی، معاذ کو کان سے پکڑے بے بسی ڈانٹ رہی تھیں اور وہ کان چھڑا کر جھپاک سے منہ چڑاتا بھاگ گیا تھا۔

”اتنا شیطان ہو گیا ہے یہ لڑکا۔ کیا کروں میں اس کا؟“ وہ کمرپہ ہاتھ رکھے پریشانی سے بولیں اور محمل کی فون نمبرز پر لیں کرتی انگلیاں ہتمی گئیں۔

”شیطان ہو گیا ہے یہ لڑکا۔“ اس نے زیر لب دہرا یا۔

لفظ شیطان کا روٹ درڈ کیا تھا؟ شین، طا، نون (شیطان) شطن۔ یعنی رحمت سے دور، اللہ کی رحمت سے دور، دھنکارا ہوا۔ اوه گاڑ! انہوں نے اپنے بچے کو اللہ کی رحمت سے دور ہوا کہہ دیا؟“

”چھی!“ اس نے ہولے سے انہیں پکارا۔ فون کا رسیور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”ہاں؟“ نعمہ چھی نے پریشانی سے چونک کر اسے دیکھا۔

”معاذ کو شیطان تو نہ کہیں۔ چھی! اللہ نہ کرے وہ شیطان ہو۔ شیطان تو اللہ کی رحمت سے دور ہونے کو کہتے ہیں۔“

”اچھا، اچھا۔ بس کرو۔ دوسی پارے کیا پڑھ لئے، اب ہمیں سکھائیں گی یہ۔ ہونہ، ان کا تو قبلہ ہی بدل گیا ہے۔“ وہ استہزا سیکھتی باہر نکل گئیں اور وہ جہاں تھی، وہیں سن سی بیٹھی رہ گئی۔ صح ہی تو دوسرے سیپارے کی چہلی آیت پڑھی تھی کہ ”عقریب وہ بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان کو ان کے قبلے سے کس نے پھیر دیا ہے۔“

”ان کا تو قبلہ ہی بدل گیا ہے۔“ وہ تکرار اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

بہت پہلے ملنے والی وہ سیاہ فام لڑکی ایک دم اسے یاد آئی تھی۔

”اس میں تمہارا ماضی ہے، حال ہے اور مستقبل لکھا ہے۔“ وہ ٹھیک کہتی تھی۔

وہ سر جھکائے خاموشی سے برتن دھو کر دیک میں لگا رہی تھی۔ ذہلی پیشوں سے پانی کے قطرے شپ شپ گردہ ہے تھے۔ اس کے ہاتھ ستر دوی سے کام کر رہے تھے۔ وہ پچن میں ایکلی تھی، اماں جانے کہاں تھیں۔ باقی لوگ تو کام کے وقت پچن میں آنا مزاج کے خلاف سمجھتے تھے، مگر خیر۔ اس نے سر جھکا۔ وہ اب کوشش کرتی تھی کہ ایسی سوچوں کو دل میں جگہ نہ دے۔ اب محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اپنے بد صورت روئیے سے اپنے اور ان کے درمیان فرق نہ رکھا تھا، پہلے وہ ہر چیز اسی دنیا میں برابر کرنے پہنچی، اب اس نے صبر کرنا شروع کر دیا تھا۔

زندگی دیسے بھی اب ٹھف ہو گئی تھی۔ اب مسجد کی ٹھپر زنے اسے دیر سے آنے پہاڑی میشم دے دیا تھا۔ وہ خود بھی اپنی تجوید درست کرنے فخر کے بعد آنا چاہتی تھی کہ تب لڑکیاں اکٹھی بیٹھ کر تجوید کی پریکش کرتی تھیں۔ صرف یہ مسئلہ تھا کہ فخر کے وقت فرج لاک ہوتا تھا، اس کے لاکھ کہنے پہ بھی کسی پا اثر نہ ہوتا تھا، اس کے پاس اپنے ناشتے کے پیسے نہ تھے، یا تو وہ ٹرانسپورٹ کا کرایہ ادا کرتی یا اپنا ناشتہ لا کر رکھتی، سونا شتہ قربان کر کے اس نے دین والے کو فیس دی۔ اور روز صبح تجھ پہ اٹھ کر، وہ آدھا گھنٹہ اپنا ہوم ورک کرتی، پھر فخر پڑھ کر نکل جاتی۔ عصر کے قریب اس کی واپسی ہوتی۔ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے، علم فقر و فاقہ کے بغیر نہیں آتا، ٹھیک ہی کہتے تھے۔

اس نے آخری پلیٹ ریک پہ رکھی، ٹونٹی بند کی اور ہاتھ خشک کرتی اپنے دھیان میں پیشی ہی تھی کہ پچن کے کھلے دروازے میں کسی کو کھڑا دیکھ کر ٹھکنگی اور پھر دوسرے ہی بل ساکت رہ گئی۔

”کیسی ہو؟“ فواد سینے پہ ہاتھ باندھے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ گنگ سی دننا پلک جھپکے اسے دیکھے گئی۔ یہ کب واپس آیا؟

”تم مجھے بہت یاد آئیں محمل! میں ایک بہت بڑی سازش کا نشانہ بناؤں۔“

”اماں!.....اماں!“ وہ ایک دم بلند آواز میں پکارنے لگی۔ خون اُبلنے لگا تھا، اسے محسوس ہوا، اس کا جسم کیپکا پار رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ مسرت بوکھلا کر اندر آئیں اور پھر فواد کو دیکھ کر چپ سی رہ گئیں۔

”فوا و بیثا! تم؟“

”چاچی!“ وہ ان کی طرف بے قراری سے پلٹا۔ ”میرے ساتھ بہت بڑی سازش ہوئی ہے۔ یہ سب اس اے ایس لپی کا کیا دھرا ہے۔ میں بھلا محمل کے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں؟..... محمل! تم.....“ وہ اب اس کی جانب مڑا۔ ”تم جانتی ہو، میں بے قصور ہوں۔ ریکارڈنگ جوانہوں نے تمہیں سنوائی، وہ ان کے کسی فناکار کی تھی۔ ہم ان پولیس والوں کو بھتہ نہیں دیتے، اس لئے انہوں نے ایسا کیا۔ تم یاد کرو، تم نے خود کہا تھا کہ تم سائنس کروانے پڑی جاتی ہو۔ میں نے اگر سودا کیا ہوتا تو میں تمہیں مجبور کرتا؟“

وہ ایک دم چونکی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر.....

”آپ نے..... آپ نے مجھ پر الزام لگایا کہ آپ نے مجھے رنگے ہاتھوں.....“ اس سے آگے بولانہیں گیا۔

وہ سب مجھے اے ایس لپی نے رات کو کہا تھا کہ میں تمہارے اور اس کے درمیان آنے کی کوشش نہ کروں۔ بھلا بتاؤ، میں ایسا کر سکتا ہوں؟ پھر مجھے یقین آہی گیا کہ تم جیسی باکردار اور پارسالڑی ایسا نہیں کر سکتی۔ میں پورے گھر کے سامنے تمہارے کردار کی قسم کھانے کو تیار ہوں چاچی! آپ میرا یقین کریں۔“

وہ بے بس سامت کے پاس جھکا اور ان کے دنوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”یقین کریں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ لیکن اگر آپ سمجھتی ہیں کہ محمل میری وجہ سے بدنام ہوئی ہے تو میں محمل سے شادی کرنے پر تیار ہو۔ آپ جب کہیں، آغا جان دھوم دھام سے محمل کو اپنی بہوبائیں گے۔ آپ ہاں تو کریں۔ ایک دفعہ محمل سے میری شادی ہو جائے، پھر ہو گی کسی کو پورے خاندان میں ہمت کہ وہ محمل پر انگلی اٹھا سکے؟ ہم ہر دو انگلی کاٹ دیں گے۔ اللہ گواہ ہے چجی! ہم ایسا کریں گے۔“

”فوا و تم مج کہہ رہے ہو.....؟“ فرط جذبات سے سرت کی آنکھوں سے آنسو اُتل پڑے۔

وہ جو ساکتی سلیب کا سہارا لئے کھڑی تھی، ایک دم بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا، بس سرمنہ لپیٹے پڑی رہی۔ باہر سے چہل چہل کی

آوازیں آرہی تھیں۔ نہی مذاق، باتیں، شور، قیچیے، دعوت کی طرح کا سماں تھا۔ اشتہا انگیز کھانوں کی مہک اس کے کمرے تک آرہی تھی، مگر اس کا کسی چیز کے لئے دل نہ چاہ رہا تھا۔

وہ چت لیٹی دیر تک چھپت پہ گھومتے چکھے کو دیکھتی رہی تھی۔ تینوں پر گول گول گھوم رہے تھے۔ بار بار ایک ہی مدار کے گرد چکر کاٹتے، آخر میں وہیں پہنچ جاتے جہاں سے چلے تھے۔ وہ بھی وہیں پہنچ گئی تھی۔



صحح پریز ہال کی کشادہ سفید سیر ہیاں وہ ننگے پاؤں سست روی سے اُتر رہی تھی۔ سفید شلوار قمیض کے اوپر پنک اسکاراف نفاست سے اوڑھے، ایک ہاتھ دریلنگ پر رکھے، وہ جیسے پانی پہ چلتی غائب دماغی سے نیچے آئی تھی۔

پریز ہال کے گلاں ڈورز بند تھے۔ شیشوں کے پار تازہ صحح اُتر رہی تھی۔ اس کو آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، وہ چپ چاپ اپنی جگہ پہ آئی۔ بیک ڈیک پر رکھا اور گرنے کے انداز میں بیٹھی۔

اگر کافی ہوتا تو یقیناً وہ آج نہ آتی۔ اتنی ڈپریسڈ ہو گئی تھی کہ وہ پڑھنے سکتی تھی۔ مگر وہ کافی نہ تھا، نہ ہی وہ پڑھنے آئی تھی۔ وہ تو سننے آئی تھی۔

بعض چیزیں اتنی حیرت انگیز ہوتی ہیں کہ انسان ان پر حیران ہونا ترک کر دیتا ہے۔ وہ مجہزانہ کتاب بھی ایسی ہی تھی۔ عاجز کر دینے والی، مبہوت کر دینے والی۔ وہ جو سوچتی تھی، اس کتاب میں لکھا آ جاتا تھا۔ اب محمل نے حیران ہونا ترک کر دیا تھا۔ اسے لگا، وہ اب بھی حیران نہ ہو سکے گی۔ مگر آج کی آیات پہ پھر وہ چونکی تھی۔

”اور لوگوں میں سے کوئی ہے، اچھی لگتی ہے تمہیں اس کی بات دنیا کی زندگی کے متعلق.....“ اس نے سرگھٹنوں پر رکھ دیا اور بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لئے۔

”اور وہ اپنی بات پر اللہ کو گواہ بنالاتا ہے، جبکہ حقیقت میں وہ سخت جھگڑا لو ہے۔“

اس نے سر اٹھایا، چہرہ دائیں جانب گھمایا، پنک اسکاراف میں لمبسوں لڑکیاں سر جھکائے تیزی سے قلم پیپر پہ چلا رہی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا

گزر رہی ہے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔
بس وہی جانتا تھا، جس نے یہ کتاب اس کے لئے ابھاری تھی۔ اسے کبھی کبھی لگتا تھا،
یہ بس اسی کی کہانی ہے، کسی اور کسی سمجھہ میں آہی نہیں سکتا۔

”اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے۔“

اس نے دونوں کنپیشور کو انگلیوں سے سہلا�ا۔

”اچھی لگتی ہے تمہیں۔“

وہ آہستہ سے اٹھی، سیپارہ بند کیا اور کچھ بھی لئے بغیر پیڑھیوں کی طرف بڑھی۔
”اس کی بات۔“

وہ دھیرے دھیرے زینے چڑھ رہی تھی۔

”دنیا کی زندگی کے متعلق۔“

وہ آخری زینہ عبور کر کے راہداری کی طرف بڑھی۔

”اور وہ اپنی بات پر اللہ کو گواہ بنالاتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ سخت جھگڑا لو ہے۔“

وہ تھکاوٹ سے باہر برآمدے کے اسٹپس پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہرا بھرا لان تھا۔ وہ ستون سے سرٹکائے لان کے بزرے کو خالی خالی آنکھوں سے دیکھے گئی۔

یہ تو اس نے اپنے دل سے بھی نہ کہا تھا کہ اسے فواد کی بات اچھی لگی تھی۔ اس کی آفر دلفریب تھی، دلکش تھی۔ وہ اپنے دل سے اقرار کرنے سے ڈرتی تھی، مگر وہ تو نگاہوں کی خیانت بھی جانتا ہے، اس سے کیسے چھپ سکتی تھی کوئی بات۔ مگر اس نے اسے ڈانٹا نہیں، ڈلیل نہیں کیا جیسے لوگ کرتے تھے۔ اس کا تماشا نہیں بنایا جیسے خاندان والے بناتے تھے۔ اس کی بات سنی ان سنی نہیں کی جیسے نادیہ کرتی تھی، کوئی ڈانٹ ڈپٹ، لعن طعن نہیں۔ بس وہی ایک نرم، مہربان انداز جس کی ترب میں وہ قرآن سننے آتی تھی۔ وہ ڈانٹا ہی تو نہیں تھا، اس کی طرح کوئی سمجھاتا ہی نہ تھا۔ کوئی اس کی طرح تھا ہی نہیں۔

وہ دیس بیٹھی تھی، جب ساتھ ہی وہ لڑکی آ بیٹھی۔ غالباً مذہبر یک تھی۔ اور لڑکیاں اس میں بھی بیٹھ کر تجوید کرتی تھیں۔

وہ ٹھوڑی ہتھی سترے رکھے، چھرہ موڑے یونہی اسے دیکھے گئی۔

وہ لڑکی گھنٹوں پر قرآن رکھے باسیں ہاتھ سے صفحے پلٹ رہی تھی، دایاں ہاتھ یونہی ایک طرف گرا پڑا تھا۔ مطلوبہ صفحہ کھول کر اس نے باسیں ہاتھ سے گرے ہوئے ہاتھ کو اٹھایا اور گود میں رکھا، پھر نھیک ہاتھ سے صفحے کا کنارہ پکڑے پڑھنے لگی۔

”ان المسلمين والمسلمات.....“

وہ رک رک کر، انک کر پڑھتی، بار بار آواز ثوٹ جاتی۔ وہ پھر سے شروع کرتی، مگر ہملا ہٹ زدہ زبان پھر ساتھ چھوڑنے لگتی۔ مخارج صحیح نہ نکل پاتے، وہ بہ وقت تمام ایک لفظ بولتی تو ساتھ ”گان گان“ کی آواز بھی آتی۔

یکدم محمل کو احساس ہوا، وہ روئے لگی تھی۔ اس کا مفلوج دایاں ہاتھ بار بار نیچے گر جاتا۔ وہ باسیں ہاتھ سے اسے اٹھاتی، پھر سے تجوید سے پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوئیں اور آنسو اُمل کر گال پر لڑھکنے لگے۔ وہ باسیں ہاتھ سے آنسو رگڑتی، دلبی دلبی سکیوں کے ساتھ پھر سے کوشش کرنے لگی۔

محمل گم مصممی اسے دیکھے گئی۔ وہ اپاچ لڑکی اپنے اللہ سے بات کر رہی تھی، وہ اس کا بہت ہمدرد تھا۔ اسے محمل کی ہمدردی کی اس وقت ضرورت نہ تھی، لمحے بھر کو بھی اسے اس پر ترس نہ آیا تھا، بلکہ رشک ہوا تھا۔ کوئی ایسے بھی تڑپ کر قرآن پڑھتا ہے جیسے وہ پڑھ رہی تھی؟ ”اور ایک ہم ہیں، برسوں اس مصحف کو لپیٹ کر سب سے اوپرے شیلف میں سجائے رکھتے ہیں اور بس سجائے ہی رکھتے ہیں۔“ وہ اسی طرح ہتھیلی خوڑی تلے جمائے گردن پوری اس کی طرف موڑے پلک جھپکے پنا اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ پھر سے ہملا تی زبان سے پڑھنے لگی، مگر نھیک پڑھانہ جا رہا تھا، آنسو شپ شپ اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ دلبی دلبی سکیوں کے درمیان وہ مسلسل استغفار اللہ کہتی جا رہی تھی۔ عامی شکل کی اپاچ لڑکی۔ اسے بے اختیار وہ سیاہ فام لٹکڑی لڑکی یاد آئی۔ وہ کتنوں کو سہارا دیجئے ہوئے تھا، اور وہ کتنے بد نصیب ہوتے ہیں جو حملادت کی آواز سن کر کان بند کر لیتے ہیں۔ کبھی میں بھی ان بد نصیبوں میں تھی۔

وہ آہستہ سے اٹھی اور سر جھکائے چل دی۔

برآمدے کی سیر چیزوں پر بیٹھی اپاچ لڑکی اسی طرح رو رہی تھی۔

وہ گیٹ بند کر کے اندر داخل ہوئی تو لان میں کریاں ڈالے تقریباً تمام کرزز بیٹھے تھے۔ فواد بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ وہ کسی بات پہ نہ رہا تھا۔ شرٹ کا اوپری بٹن کھولے، قیمتی رست داچ پہنے، اس کے پرفیوم کی مہک یہاں تک آ رہی تھی۔

وہ کرسیوں کا دائرہ بنا کر بیٹھے تھے۔ یہ نداہ تھی، جو اس کی بات دلچسپی سے سن رہی تھی۔ جبکہ آرزو بھی اس دائرے میں لا تعلق سی بیٹھی تھی اور فالقة بھی۔ رضیہ پھپھوکی فالقة۔ وہ بھی جیسے فواد سے احتراز بردارت رہی تھی۔ جیل جانے کے بعد بھلے تائی مہتاب جتنی تاویلیں پیش کرتیں، فواد کی اہمیت اب وہ نہ رہی تھی۔

وہ کتابیں سینے سے لگائے، سر جھکائے تیز تیز چلنے لگی۔

”محمل!“ وہ براہمے کے اسٹیپ پہ تھی، جب فواد نے بے اختیار پکارا۔ اس نے ایک پاؤں سیرھی پر کھے گردن موڑی۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ ”آؤ بیٹھو۔“ ”مجھے کام ہے۔“ روکھے تاثرات دے کر وہ براہمے کا دروازہ پار کر گئی۔ لان میں بہت سی معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔

”اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ یوں مجھے سب کے سامنے بلائے۔ مائی فٹ۔“ وہ جیر پیختی اندر آئی تھی۔ لاونچ میں حسن نظر آیا تو ایک دم ٹھنک کر رکی، پھر سر جھنک کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

”محمل!“ اس کے قدم رک گئے، مگر پلٹی نہیں۔

”تمہیں فواد کی ہر بات پہ یقین ہے؟“

”مجھے آپ پہ بھی یقین نہیں ہے۔“ اس کا گلا رندھ گیا تھا، تیزی سے کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور پھر دھڑام سے اپنے پیچھے بند کیا۔

حسن نے تاسف و بے بھی سے چند لمحے ادھر دیکھا، پھر سوت روی سے اوپر شرھیاں چڑھنے لگا۔



اس نے چچے ہلا کر چیل کا دھکن بند کیا، جھک کر چولہا قدرے آہستہ کیا، اور واپس کنگ بورڈ کی طرف آئی، جہاں سلااد کی سبزیوں کا ڈھیر تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے، سر جھکائے کھٹ کھٹ سبزیاں کاشنے لگی۔

”ادھر ہو محل؟“ رضیہ پھپھونے اندر رجھانا کا۔

محل نے سر اٹھایا۔ آج اس نے پونی نہیں باندھی تھی، اور بھورے لمبے بال شانوں پر گرد ہے تھے۔ جنہیں اس نے کانوں کے پیچے اڑس رکھا تھا۔

”جی پھپھو؟“ وہ آہستہ سے گویا ہوئی، یہ محل کے اندر ایک واضح تبدیلی تھی، وہ پہلے جیسی بدلخواز نہ رہی تھی، درنہ پہلے تو اسے مخاطب کرتے ہوئے ذر لگا کرتا تھا۔

”میں نے سوچا، ذرا تمہاری کوئی مدد کرنا دوں۔“ صرت کو تو بھابی نے دوسرے کاموں پر لگا رکھا ہے۔ کوئی تک ہے بھلا؟ جب دیکھو، بے چاری سے کام ہی کروانی رہتی ہیں۔“

”تو کوئی بات نہیں پھپھو! ہمارا فرض ہے۔“ وہ نری سے سکرا کر پھر سے بزری کاشنے لگی تھی۔

”یہ فوادر ہا کب ہوا؟“ پھپھو سامنے کا ونڈ سے ٹیک لگائے رازداری سے گویا ہوئیں۔

”معلوم نہیں۔“

”یک ہا.... برا خلیم کیا اس نے تمہارے ساتھ۔ میرا تو مانو، اس کی شکل دیکھنے کا
دل نہیں کرتا۔“

وہ سر جھکائے کھٹا کھٹ پیاز کاٹی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں سے آنسو گرنے لگے
تھے۔

”بزادل تھا میرا اپنی فائقة کے لئے۔ مگر دل ایسا ٹوٹا کہ ادھر آنے کو ہی نہیں چاہتا
تھا، کتنے چہرے نکلتے ہیں نالوگوں کے، محمل!“

”جانے دیں پھپھو! انا اللہ پڑھ لیں۔ فائقة بامی کوئی کم تھوڑی ہیں۔ وہ کسی اچھے
بندے کے قابل ہیں۔ اچھا ہی ہوا جو بھی ہوا۔“

اسے پھپھو کے آزر دہ چہرے کو دیکھ کر دکھ ہوا تھا، یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ
یوں بات کر رہی تھیں، درنہ پہلے تو درمیان میں محمل نے اتنی دیواریں کھڑی کر کی تھیں
کہ انہیں پاشنا مشکل تھا، وہ اس کے باپ کی ایک ہی بہن تھیں۔ وہ کیوں لوگوں سے
شکایت کرے؟ اس نے خود بھی تو کبھی بنا کر رکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔

”ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر.....“

اسی لمحے فواد نے کھن کا دروازہ مکھولا۔ ان دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا، محمل کے
لبخنی سے بھنج گئے۔ وہ تیز تیز بزری کا شنے لگی۔

”محمل! ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“

”یہ فارغ نہیں ہے۔ اپنی بہنوں سے کہہ دو۔ وہ فارغ ہی بیٹھی تھیں باہر۔“ پھپھو
نے نہایت بے رخی سے کہا، وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر واپس مڑ گیا۔

”ہونہے.... حکم دیکھو کیسے چلا رہا ہے۔ تم ذرا بھی اس کی نہ سنا کرو۔ میرے بھی کتنے
خواب تھے۔ ہمیں کوئی کمی تھوڑی ہے؟ فائقة کے پاپا کے بنس کا تو تمہیں پہتہ ہے،
کروڑوں میں کھلتے ہیں۔ ان کی طرح تیسوں کامال نہیں کھاتے۔“

”میں تیسم نہیں ہوں پھپھو! میں بالغ ہوں۔ اور بلوغت کے بعد تیسی نہیں ہوتی۔“
وہ اب سلااد میں یہوں نچوڑ رہی تھی۔

”ہاں ہاں، تمہیں پہتہ ہے، ابھی فائقة کے پاپا نے نیا گھر بنوایا ہے، دوسرا گھر تو پھر

سے فرش کر کے فالقة کو جیز میں دیں گے۔“

محمل کی لیموں نچوڑتی انگلیاں ٹھیمیں، ایک خیال کے پیش نظر اس نے چونک کسر اٹھایا۔

”پھپھو!“ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ”آپ کو مدد کی ضرورت ہوگی نا۔“
گھر شفت کیا ہے۔ آپ اکیلے کیسے کریں گی سب؟ نوکروں پہ بھروسہ کر ہی نہیں سکتے۔
میں آجائیں آپ کے پاس، ہیلپ کروادوں گی۔“

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔“ پھپھو تو نہال ہو گئیں۔ ”میں تم سے کہنے ہی لگی تھی، پھر سوچا تمہاری پڑھائی ہے۔“ (تو اسی لئے اتنا پیار جتار ہی تھیں، خیر)
”کوئی بات نہیں، ویک اینڈ ہے، پھر..... آپ کی ہیلپ بھی تو کرانی ہے نا۔“
اسے فواد سے دور رہنے کا سہی طریقہ نظر آیا تھا۔ پھپھو نے فوراً ہمی بھر لی۔ وہ جلدی سے اپنا بیگ تیار کرنے لگی۔

تیاری کیا تھی، دو جوڑے رکھے، چند ضروری چیزیں، اور پھر قرآن رکھتے رکھتے وہ رہ گئی۔

”قرآن تو وہاں ترجمے والا میں ہی جائے گا، وہ دون کی تو بات ہے، اب ساتھ کیا رکھوں؟ کوئی بات نہیں۔“ اس نے بیگ کی زپ بند کر دی۔



پھپھو کا سامان شفت ہو گیا تھا، بس ڈبوں میں بند تھا۔ وہ جاتے ہی کام میں لگ گئی۔ فالقة توٹی دی میں ہی مگن تھی۔ ڈش بھی لگ گئی تھی، اور وہ بہت شوق سے کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھپھو نے اس سے کچھ نہ کہا، محمل ہی ساری چیزیں نفاست سے بیٹ کرتی رہی۔

رات گیارہ نجع گئے، جب اس نے آج کے لئے بس کی۔ اور پھر نہا کر نیا سوت پہننا۔ پھر نئے سرے سے وضو کیا اور دوپٹہ سر پہ لپیٹے وہ پھپھو کے پاس چلی آئی۔

”پھپھو! آپ کے پاس ترجمے والا مصحف ہو گا؟“

”کیا، ترجمے والا؟“ وہ اپنے کپڑوں کی الماری سیٹ کر رہی تھیں۔

”قرآن.....قرآن ہوگا۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

”ترجمے والا تو.....فالقہ کی دادی کا تھا پچھلے گھر میں۔ مگر وہ کسی نے مانگ لیا تھا، ترجمے بغیر والا ہوگا۔“

”اچھا.....چلیں، وہی دے دیں۔“

”کتابوں کے ذبیبے سے نہیں نکلا؟“

”نہیں تو۔ میں نے خود ساری کتابیں ادھر رکھی ہیں۔“

”پھر شاید کہیں مسٹلیں ہو گیا ہو۔ فالقہ سے پوچھ لو۔“ وہ پھر سے کام میں مگن ہو گئیں۔

وہ بے دلی سے فالقہ کے پاس آئی۔

”فالقہ بائی! آپ کے پاس قرآن ہوگا؟“

”میرے پاس؟ مجھے کیا کرتا ہے؟“ وہ اکٹا جر ان ہوئی۔ ”ماں سے پوچھو، ان کوئی پتہ ہوگا۔“

وہ ماہیوس سی خود بھی ڈھونڈنے لگی۔ کتابوں کے رویک کو پھر سے دیکھا، ایک ایک چیز چھان ماری، مگر قرآن نہ تھا، نہ طلا۔

وہ اپنے کمرے میں آئی اور اپنا بیک پھر سے کھولا۔ شاید کوئی مجرزہ ہو جائے اور شاید اس نے قرآن رکھ دیا ہو، سارے کپڑے اوپر نیچے کئے۔ مگر وہ ہوتا تو ملت۔ وہ پھر سے لا دُنج میں گئی۔

”فالقہ بائی! آپ کے پاس کوئی کیست ہوگی تلاوت کی؟“

”نہیں۔“ فالقہ نے لاپرواں سے شانے جھکلکے۔

”کوئی چینل ہوگا، جس پر تلاوت آتی ہو؟“

”تھنگ مت کر دھمل! میں مودی دیکھ رہی ہوں۔“ وہ اکتا کر رخ پوراٹی دی کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی۔

دھمل تھنگ تھنگے قدموں سے واپس آئی اور پھر بیٹھ پڑ کر نہ جانے کیوں رونے لگی تھی۔

رات وہ بے چین سی نیند سوئی۔ اگلا سارا دن کام کرواتے وہ مغموم، بے چین رہی۔
کھانے کے بھی چند لقے لے سکی۔ اس سے کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔

ہفتے اور اتوار کے دو دن اس کی زندگی کے جیسے بدر تین دن تھے۔ اس کا بس نہیں
چلتا تھا، وہ اڑ کر گھر پہنچ جائے اور اپنا قرآن تھام لے۔ کوئی ایسا اتفاق تھا کہ رضیہ پھپھو کا
ڈرائیور چھٹی پہ چلا گیا، وہ اب ان کے میاں نہیں انگل سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ گھر سے
بھی کوئی نہیں دے کر جائے گا، وہ جانتی تھی۔

اللہ اللہ کر کے اتوار کی رات گھر سے گاڑی اسے لینے آئی۔

پھر جس لمحے وہ گھر میں داخل ہوئی، بجائے کہیں اور جانے کے، بجائے کسی سے
ملنے کے وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گئی، شیلف پہ بیک ایک طرف ڈالا اور شیلف پر
سے قرآن اٹھا کر سینے سے لگایا۔ اسے لگا، اب وہ زندگی بھر قرآن کے بغیر کہیں نہیں جا
سکے گی۔ لوگ چاہی، بُوہ اور موباکل کے لئے آتے ہیں، قرآن کے لئے کوئی واپس نہیں
آتا۔ نہ جانے کیوں۔

”محمٰل؟“ اماں پکارتی ہوئی آئیں، تو اس نے آنسو خشک کئے اور اپنے مصحف کو
احتیاط سے شیلف پر رکھا۔

”محمٰل! یہ لو۔“ اماں نے دروازہ کھولا اور ایک خط کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔
”تمہاری ڈاک آئی تھی کل۔“

”میری ڈاک؟“ اس نے حیرت سے لفافہ تھاما۔ مسرت جلدی میں تھیں، لفافہ دے
کر پلٹ گئیں۔

اس نے انجھتے ہوئے لفافہ چاک کیا اور اندر موجود کاغذات نکالے۔
وہ اسکارشپ تھا، جو اس کو دیا گیا تھا۔ انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم کا اسکارشپ۔
وہ بے قیمتی سے اسے دیکھ رہی تھی۔



”محمٰل! تمہاری ڈاک آئی تھی۔ کیا یہ وہ اسکارشپ تھا؟“
کھانے کی میز پہ آغا جان نے پوچھا تو یکدم سنائا چھا گیا۔ محمٰل نے جھکا ہوا سر

انھایا۔ سب ہاتھ روکے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”جی۔“ اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔ خوش یا جوش سے خالی آواز۔

”ہوں۔ تو کاسز کب اشارت ہوں گی؟“ آغا جان بات کرنے کے ساتھ ساتھ چیچپ کا نشاپلیٹ میں کھڑکا رہے تھے۔ باقی سب دم سادھے محمل کو دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک بڑی خبر تھی۔

”ستمبر میں۔“

”تمام اخراجات وہی انھائیں گے؟“

”جی۔“ وہ بھی جواب دینے کے ساتھ ساتھ کھانے لگی تھی۔ ڈائنسنگ ہال میں اب اس کے چمچے کی آواز بھی آرہی تھی۔

”ویری گڈ۔“

”انگلینڈ میں؟“

”اسکالر شپ؟“

”محمل انگلینڈ پہنچ جائے گی؟“

سرگوشیاں، چکوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس نے سر جھکائے خاموشی سے کھانا ختم کیا، پھر کری دھکیل کر انھی اور بنا پکھ کہے ڈائنسنگ ہال سے چلی گئی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ خوش تھی یا ناخوش۔ اسے ایک نئی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا تھا، اسے خوش ہونا چاہئے۔ لیکن پھر یہ ناخوشی؟ دل ڈوبنے کا یہ احساس؟ شاید یہ اس لئے تھا کہ اس صورت میں اسے علم الکتاب اور مسجد چھوڑنی پڑے گی۔ قرآن کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ لیکن وہ تو میں بعد میں بھی کر سکتی ہوں۔ انگلینڈ جانے کا موقع بعد میں نہیں ملے گا۔

ان ہی سوچوں میں گم نیند نے اسے آیا۔



صحیح کلاس میں سیپارہ کھولتے وقت اسے امید تھی کہ آج کے سبق میں اس کے اسکالر شپ کے بعد کے خیالات کے متعلق آیات ضرور آ جائیں گی، لیکن آج کی آیات سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے کسی قدیم قصے کی تھیں۔

یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ اسے اس کا جواب نہیں مل رہا تھا، اور وہ واقعہ جو بیان کیا جا رہا تھا، وہ بھی قدرے ناقابل فہم تھا۔ بلکہ تھا نہیں، اسے لگا تھا۔ وہ اسکالر شپ بھلا کر اس داقعے میں ہی الجھ گئی۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ جب طالوت کا شکر جالوت سے مقابلے کے لئے لکا توراتے میں آئے والی ایک نہر میں ان کے لئے آزمائش ڈال دی گئی۔ اللہ نے اس نہر کے پانی کو سوائے ایک چلو کے، پینے سے منع کیا، تو جو لوگ پانی پینے کئے، وہ نہر پر بیٹھے رہ گئے اور جنہوں نے چلو سے پانی نہ پیا، وہ آگے نکل گئے، اور انہی میں حضرت داؤد علیہ السلام تھے جنہوں نے جالوت کو قتل کر کے اس کو اپنے انعام تک پہنچایا۔

پوری تفسیر سن کر بھی اسے نہ سمجھ آیا کہ بھلانہر کا پانی کیوں نہیں پینا تھا؟ پانی تو حرام نہیں ہوتا، پھر کیوں؟

وہ پورا دون یہی سوچتی رہ گئی، یہاں تک کہ رات جب شما لینے کھن میں آئی تو بھی یہی سوچ رہی تھی۔

کچن خالی تھا، اس نے فریزر کا ڈھکن کھولا، سویٹ ڈش کے ڈوٹھے نکالے، ٹرے

میں رکھے اور ٹرے اٹھائے پاہر آئی۔ تلاوت کی آواز اس کی سماعت میں یونہی گونج رہی تھی۔

”پھر جب طالوت اپنے لشکروں کے ساتھ جدا ہوا۔“

وہ ٹرے اٹھائے ڈائنگ ہال میں آئی۔ اوپنجی پونی بھکر سر سے اور اٹھ جاتی تھی۔ کندھوں پہ پھیلایا دوپٹہ اور شفاف چہرے پہ سنجیدگی لئے، اس نے ٹرے نیبل پر رکھی۔ سب و قلنے و قلنے سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ متاثر، جلن زده نگاہیں۔

”اس نے کہا، بے شک اللہ تم کو آزمانے والا ہے ایک نہر کے ساتھ۔“

وہ خاموشی سے ٹرے سے ڈونگے نکال رہی تھی۔ پہلا ڈونگا اس نے آغا جان کے سامنے رکھا۔

”تو جو کوئی اس نہر سے پینے گا، وہ مجھ سے نہیں ہے۔“

دوسرا ڈونگا دونوں ہاتھوں میں ہی اٹھا کر اس نے نیبل کے وسط میں رکھا۔

”اور جو کوئی اس نہر سے نہ پینے گا، سوائے اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر پینے کے، وہ بے شک مجھ میں سے ہے۔“

اس نے آخری ڈونگا نیبل کے آخری سرے پر رکھا اور واپس اپنی کری پا آئی۔

”تو سوائے چند ایک کے، انہوں نے اس (نہر میں) سے پی لیا۔“

سب سویٹ ڈش شروع کر چکے تھے۔ شیشے کے پیالوں اور چھپوں کے ٹکرانے کی آوازیں و قلنے و قلنے سے آرہی تھیں۔ ان آوازوں کے درمیان وہ مدھم مہربان آواز بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی، اور وہ تو ابھی تک دور کہیں اس آواز میں کھوئی تھی۔

”تو سوائے چند ایک کے، انہوں نے اس میں سے پی لیا۔“

اس نے پیالہ آگئے کیا، اور تھوڑی سی کھیرا پنے پیالے میں ڈالی۔

”تو سوائے چند ایک کے، انہوں نے اس میں سے پی لیا۔“

وہ اب آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے ٹیچ لے رہی تھی۔

”تو تمہیں کب تک جانا ہو گا محمل؟“

آغا جان نے پوچھا تو یکدم پھر سے ہال میں سنائا چھایا۔ چھپوں کی آواز رک گئی۔

بہت سی گردنیں اس کی طرف مڑیں۔ اس نے سراٹھایا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے۔
اگست کے اینڈ تک۔“

یعنی تم تمبر سے پہلے تک نہیں ہو گی۔“
”نہیں!“

”کیا مطلب؟“ آغا جان چونکے۔

”میں نہیں جا رہی۔“ اس نے چیخ واپس پیالے میں رکھا اور نیپکن سے لب صاف
کئے۔

”کیا مطلب؟“

”تم اتنا بڑا اسکار شپ چھوڑ دو گی؟“ فضہ چبی نے تمبر سے کہا تھا۔

”میں چھوڑ چکی ہوں۔“

”مگر..... مگر کیوں؟“

وہ نیپکن ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیونکہ ہر جگہ رکنے کے لئے نہیں ہوتی۔ اگر میں نے اس نہر سے پانی پی لیا، تو میں
ساری عمر اسی پہنچی رہ جاؤں گی، اور طالوت کا لشکر دور نکل جائے گا۔ بعض حلال چیزیں
کسی خاص وقت میں حرام ہو جاتی ہیں، اگر اس وقت آپ اپنے نفس کو ترجیح دیں، تو خر
کا کام کرنے والے لوگ دور نکل جاتے ہیں۔ میں نہر پر ساری عمر پہنچی نہیں رہنا چاہتی۔
مجھے وہ داد دبننا ہے جو جالوت کو مار سکے۔“

وہ سوچ کر رہ گئی، اور کہا تو بس اتنا۔

”مجھے ابھی قرآن پڑھنا ہے۔“ اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

⊗⊗⊗

شام کی سختی ہوا اپنی لے پ پہنچی۔ وہ چائے کا کپ لئے ٹیرس پر کری
ڈالے دور آسمان کو دیکھ رہی تھی، جہاں شام کے پرندے اپنے گھروں کو اڑتے جا رہے
تھے۔

ٹیرس سے سامنے والوں کا گھر نظر آتا تھا۔ ان ہی بریکیڈ یور صاحب کا گھر جن کی

قرآن خوانی ایک روز اس نے دیکھی تھی۔ قرآن کو بھی پڑھنہیں تھا، ہم لوگوں نے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

اس نے کسی خیال کے تحت کپ سائیڈ پر رکھا اور اٹھی۔ ابھی مڑی ہی تھی کہ سامنے فواد کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔

وہ اندر کھلنے والے دروازے میں کھڑا تھا، سینے پر ہاتھ باندھے، لب پیچھے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم مجھ سے کتراتی پھر رہی ہو۔ حالانکہ تم جانتی ہو، میرا قصور نہیں ہے۔“ وہ چپ رہی۔

”کل دوپہر تین بجے میں اسٹاپ پر تھارا انتظار کروں گا، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ آئی ہو پ کہ تم ضرور میری بات سننے آؤ گی۔“ وہ کہہ کر ایک طرف ہو گیا۔ حمل کا رستہ کھل گیا۔ وہ دنا اسے دیکھے تیزی سے دہلیز پار کر گئی۔

ایک قسم تھی، جو اس نے کھالی تھی، وہ اسے توڑنہیں سکتی تھی، اور اس لمحے، میرھیاں اُرتے اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ اس قسم کے بوجھ سے اب نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اب اس سے وہ قسم بھائی نہیں جا رہی۔ بس ایک دفعہ وہ فواد سے باہر مل لے تو کیا ہو جائے گا؟ بس ایک دفعہ..... کل دوپہر تین بجے۔ نہیں، میں قسم نہیں توڑوں گی۔ اس نے گھبرا کر سر جھٹکا۔ اس کے اندر کی سوچیں اسے دھشت زدہ کرنے لگی تھیں۔ پھر اسے یاد آیا، وہ میرس سے بھلا کیوں نیچے آنے لگی تھی؟ اور ہاں، وہ قرآن خوانی والا گھر۔ وہ کچھ سوچ کر گھر سے باہر آئی۔

ساتھ والا بندگی بیلوں سے ڈھکا، خوب صورت بندگہ تھا۔ اس نے گیٹ کے ساتھ نصب نیل پر ہاتھ رکھا، دوپٹہ شال کی طرح کندھوں کے گرد لپیٹی، اوپنی کسی ہوتی پونی نیل ادھر ادھر جعلاتی وہ اور گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر گیٹ کھلا۔ اسی ملازم کی شکل سامنے آئی۔

”جی؟“

”بر گیڈیز صاحب گھر ہے ہیں؟“

”نبیں، پر آپ کون؟“

”میں محمل ابراہیم ہوں، ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں، آغا ہاؤس میں۔ یہ کچھ پمفلش ہیں، بریکیڈر صاحب کو دے دینا، وہ پڑھ کر مجھے واپس کر دیں۔ میں ان سے واپس لینے ضرور آؤں گی۔ یہ ذمہ داری میں تمہیں دے رہی ہوں، اور ذمہ داری امانت ہوتی ہے۔ اگر امانت میں خیانت کی تو میں صراط پار نہیں کر سکو گے۔ سمجھئے؟“

چند پمفلش اور کارڈز سے تھا کہ اس نے تنبیہ کی تو ملازم نے گھبرا کر ”اچھا جی“ کہہ کر سر اندر کر لیا۔



وہ شام، وہ رات اور وہ اگلی صبح بہت کٹھن تھی۔ وہ لمحے بھر کو بھی سونہ سکی تھی۔ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزری۔ مستقبل بہت سے اندیشوں کی دھنڈ میں لپٹا نظر آتا تھا۔ وہ کیا کرے، کس سے مشورہ کرے، کس سے پوچھئے؟

اور جواب تو اسے سوچنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب صبح کے قریب اس نے قسم توڑنے کا سوچا تو بستر سے نکلی اور معاملہ اللہ پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

کل ان کی کلاس میں سورۃ بقرہ ختم ہوئی تھی، اور آج آل عمران شروع ہونا تھی۔ غالباً پہلی گیارہ آیات پڑھنی تھیں۔ اسے پکا یقین تھا کہ کوئی حل آج کے سبق میں موجود ہو گا۔ سوا اس نے آج کی آیات کھولیں۔

پھر ان تمام آیات کو اس نے دو تین دفعہ پڑھا۔ دل میں عجیب سی بے چینی پیدا ہوئی۔ وہاں کوئی ذکر نہ تھا۔ نہ قسم کا، نہ قسم توڑنے کے کفارہ کا۔

”کفارہ؟“ وہ چونکی ”تو کیا میں قسم توڑنا چاہتی ہوں؟“

”ہاں!“ دل نے واضح جواب دیا تو اس نے خود سے نگاہیں چڑا کر مصحف بند کیا اور اوپر رکھ دیا۔

فرشتے ایک فائل پر سری نگاہ ڈالتے کاریڈور میں سے گزر رہی تھی، جب وہ پھولی سانس کے تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے سامنے آئی۔

”فرشتے! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔“

فائل کے صفحے کا کنارہ فرشتے کی الگیوں کے درمیان تھا، اس نے سراٹھایا۔

”السلام علیکم! کیا بات ہے؟“

”علیکم السلام۔“ وہ پھولی سانسوں کے درمیان تیز تیز بول رہی تھی۔ ”وہ ایک فتویٰ لینا ہے۔“

”میں مفتی نہیں ہوں۔“

”مگر..... بس ایک فقہی مسئلہ ہے۔“

”ضرور پوچھنا، مگر آج کی تفسیر سن لو، اس میں ہے تمہارا مسئلہ۔“ محل کو جھکانا لگا۔

”آپ کو میرے مسئلے کا پتہ ہے؟“

”ارے نہیں، مجھے تو آج کی آیات کا بھی نہیں پتہ۔ میڈم مصباح لیتی ہیں تا آج کل آپ کی کلاسز؟“

”پھر آپ کو کیسے پتہ کہ.....“

”کیونکہ یہی ہمیشہ ہوتا ہے۔ تفسیر کا دیکھ کر لو، تمہارا مسئلہ کلیئر کٹ لفظوں میں آجائے گا۔“ اس نے فائل کا صفحہ پلٹا اور سرسری سا اور پنجے دیکھنے لگی۔

”مگر میں نے آج کی آیات پڑھ لی ہیں، ان میں میرا مسئلہ نہیں ہے، مجھے پتہ ہے۔“

”صبر لو کی! علم حبر کے ساتھ آتا ہے، تفسیر کے بعد پوچھ لینا۔ مگر اس کی یقیناً نوبت نہیں آئے گی۔“ وہ ہلکا سا اس کا گال تھپٹا کر فائل دیکھتی آگے بڑھ گئی۔ محل نے اپنے گال کو چھوا، پھر سر جھک کر کار یڈور میں آگے بھاگ گئی۔

یہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ جو سوچے، وہ قرآن میں لکھا ہوانہ آئے۔ لوگ اس کی بات نہیں سنتے تھے۔ سنتے تھے تو توجہ نہیں کرتے، اگر توجہ بھی کرتے تو سمجھتے نہیں۔ اور ایک قرآن تھا، اسے کہنا بھی نہ پڑتا اور وہ دل کی بات دھیان سے سنتا، توجہ کرتا، سمجھتا اور پھر داتا۔ اور حکمت سے اسے سمجھاتا تھا، اور اس جیسا کوئی نہ سمجھاتا تھا۔

مگر اسے لگا، آج کی آیات میں ایسی کوئی بات نہ تھی، جو اس سے متعلق ہو۔

بہت بے دلی اور رنج سے اس نے سیپارہ کھولا۔ وہ سفید چادر پر دوز انو ہو کر بیٹھی

تحتی، سامنے ڈیک پہ سیپارہ کھلا پڑا تھا، ایک طرف رجسٹر تھا، جس پر جملی وہ تیز تیز لکھ رہی تھی۔

اب میڈم مصباح محکم آیات اور قشاہہ آیات کا مطلب سمجھا رہی تھیں۔

”محکمات وہ آیات ہیں، جن کا مطلب ہم سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً احکامات، اس دنیا کی باتیں، دنیا کے کسی باغ کی مثال، تاریخی واقعات، اور قشاہہات وہ آیات ہیں، جو ہم تصور نہیں کر سکتے۔ مگر ان پر ایمان بالغیب لانا ضروری ہے۔ مثلاً جنت، دوزخ، اللہ کا ہاتھ، فرشتوں کی ہیئت۔ قشاہہات کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔ اور جو پڑے، اس سے دور رہنا چاہئے۔“ میڈم مصباح یہی سمجھا رہی تھیں۔ ست روی سے تمام پوائنٹس رجسٹر پر لکھ رہی تھی۔

”قشاہہات پر ایمان بالغیب ایسا ہونا چاہئے جیسے.....“ میڈم کی آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ ”جیسے اُگلی آیات میں ذکر ہے کہ راسخون فی العلم ان پر ایمان لاتے ہیں۔ اب راسخون فی العلم کون ہوتے ہیں؟ ایک ہوتا ہے طالب علم، ایک صاحب علم۔ اور اس سے بڑا درجہ رائج علم والے کو ہوتا ہے۔ یہ کون لوگ ہوتے ہیں؟ ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ راسخون فی العلم کون ہوتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔“

محمد کے ہاتھ سے پین گرا۔ سیاہی کے چند پھیٹے چادر کو بھگو گئے۔
میڈم آگے بھی کہہ رہی تھیں۔ ”جن کے دل مستقیم ہوں۔“

مگر وہ یک نیک پھیٹی نگاہوں سے سپارے پر لکھے ”راسخون فی العلم“ کے الفاظ کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایک ہی تکرار اس کے کانوں میں بار بار گونج رہی تھی۔
”وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔“

وہ بس سکتہ کی کیفیت میں سیپارے کو دیکھ رہی تھی۔

”راسخون فی العلم“ سیپارے کے الفاظ ڈھنڈ لے گئے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔

صدیوں پہلے عرب کے صحراؤں میں کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ پختہ علم والے کون ہوتے ہیں۔ اورتب انہوں نے بتایا تھا کہ وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔ اسے لگا، صدیوں پہلے کی کہی گئی بات کسی اور کے لئے نہیں، صرف اس کے لئے تھی۔ وہ انگلیوں کے پوروں سے ان تین الفاظ کو بار بار چھورہی تھی، انہیں محسوس کر رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں سے لڑک کر گردن پر پھسل رہے تھے۔ یہ الفاظ آج کی آیات میں تھے، اس نے بھلا کیسے سمجھ لیا کہ مسئلے کا حل آج کی آیات میں نہیں لے گا؟

”ہم نے سا اور ہم نے اطاعت کی۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ قسم کھانا پسندیدہ تھا، لیکن اب وہ اسے ہمیشہ بھائی تھی۔ اور جانتی تھی کہ یہی اس کے لئے بہتر تھا۔ اس روز وہ تین بیجے سے پہلے ہی گھر آگئی تھی۔



وہ صبح بہت زردی طلوع ہوئی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی۔ آج اس نے اوپنی پونی کے بجائے سادہ سی چوٹی بنائی تھی۔ شفاف چہرے پر ذرا سی پژمردگی چھائی تھی۔ وہ چند لمحے خود کو دیکھتی رہی، پھر سیاہ چادر سر پر رکھی اور ٹھوڑی تک لپیٹ کر بکل دوسرے کندھے پر ڈالی۔ آج اسے گواہی دینی تھی۔ فواد کے خلاف یا اپنے خلاف۔ لاڈنخ میں تینوں چیچا انتظار کر رہے تھے۔ کلف لگے سفید شلوار قمیص میں آغا جان کمر پہ ہاتھ باندھے ادھر ادھر بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اسے راہداری سے آتے دیکھا تو رک گئے۔

”چلیں۔“ وہ سپاٹ چہرہ لئے ان کو دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر باہر نکلی۔ وہ سب اکٹھے باہر نکلے۔

گیٹ کھلا، یکے بعد دیگرے دونوں گاڑیاں پورچ سے باہر سڑک پر روائی دوائی تھیں۔ اس اونچے گھر کی بہت سی کھڑکیوں میں بہت سی عورتیں ان کو جانتے دیکھ رہی تھیں۔ گاڑیاں گم ہو گئیں تو لڑکیوں نے پردے چھوڑ دیے۔

زردی راہداری میں وہ سکٹی سٹوائی، نگاہیں پنچی کئے آغا جان کے ساتھ ساتھ چل

رہی تھی۔ ادھر ادھر پولیس والے، دکاء اور کتنے ہی لوگ گزر رہے تھے۔ بہت وحشت تاک سی جگہ تھی وہ۔ اس سے سرنہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ بس لمحے بھر کو اس نے چہرہ اور پر کیا تو کاریڈور کے اختتام پر وہ کھڑا تھا، اپنے کسی سپاہی کو اکھڑتے تیور لئے غصے سے پکھ کہتا، یونیفارم میں ملبوس، سر پر کیپ۔ وہ بہت وجیہ تھا۔ اور زندگی میں پہلی دفعہ محمل کو اس پر غصہ نہیں آیا تھا۔ اسے ان تمام لوگوں میں ایک وہی اپنا ہمدرد لگا تھا۔

اس نے نگاہیں جھکالیں۔ کاریڈور کے موڑ کے قریب ہی تھی، جب ہمایوں کی نگاہ اس پر پڑی اور وہ ٹھہر گیا۔ آغا کریم کے بائیں کندھے کے پیچھے چھپی ہوئی، گردن جھکائے آئی، سیاہ چادر میں لپٹی لڑکی جس کے چہرے پر زمانوں کی تھکن رقم تھی۔ اس نے سرنہیں اٹھایا، وہ اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ اس کے قریب سے سر جھکائے گزر گئی۔

ہاں، آغا کریم نے ایک تنفس نگاہ اس پر ضرور ڈالی تھی۔

وہ اب گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کی آنکھیں دیکھنا چاہتا تھا، انہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ کاریڈور کے درمیان میں یکدم اس کا لی چادر والی لڑکی نے گردن پیچھے کو موڑی۔ دونوں کی نگاہیں لمحے بھر کو ملیں، اسے محمل کی آنکھوں میں زمانوں کی تھکن نظر آئی۔ پھر اس نے چہرہ موڑ لیا اور اسی طرح سر جھکائے اپنے پچاؤں کے زندگی میں آگے چلتی گئی۔

کمرہ عدالت میں وہ قطار کی بائیں نشست پر سب سے پیچھے بیٹھی تھی۔ آغا جان اس کے دائیں طرف تھے، اس کے بائیں جانب پکھ نہ تھا، قطار خالی تھی۔ وہ سر جھکائے ساری کارروائی خنی رہی۔ اس سے نظر تک نہ اٹھائی جاتی تھی۔ یوں جیسے ہر کوئی اسے ہی دیکھ رہا ہو۔

اور پھر ایک ساعت کو جیسے ہی اس نے سر اٹھایا، وہ دوسرے اسٹینڈ میں بیٹھا، گردن ترچھی کئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہمایوں کی نگاہوں میں سال تھے۔ چھپتے ہوئے، پریشان گن سوال۔ اس سے زیادہ دیر دیکھا نہ گیا۔ وہ گردن موڑ کر آغا جان کو دیکھنے لگی، جو لب بھینچے دکاء کے دلائل سن

رہے تھے۔ نگاہوں کے ارتکاز پر چونکہ محمل کو دیکھا۔

”کیا؟“ وہ جس طرح انہیں دیکھ رہی تھی، وہ ذرا سے انجھے۔

”جائیداد میں میرا حصہ مجھے مل جائے گا؟“ اس نے سرگوشی کی، نگاہیں ان پر سے ہٹائے بغیر۔

”ہاں، کیوں نہیں؟“

”یہی اگر میں پوچھتی کہ کیوں نہیں تو؟“

”کیا مطلب؟“

”میں ابھی جا کر ہمایوں داؤد کے خلاف بیان دوں تو، کیا گارنٹی ہے کہ آپ مُنگر نہیں جائیں گے؟“

”تمہیں مجھے پہ شک ہے؟“

”اگر ہے تو؟“

آغا جان کے ماتھے پر غصے کی لکیر اُبمری، جسے وہ ضبط کر گئے۔ ”تم اب کیا چاہتی ہو؟“

”یہ؟“ اس نے کالی چادر میں سے بیک نکالا، زپ کھولی اور ایک کاغذ اور پین نکال کر ان کی طرف بوٹھایا۔

”میری صرف فیکٹری میں شیئرز کی قیمت نو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ باقی کا حساب میں ابھی نہیں مانگ رہی۔ یہ آپ کی چیک بک کا چیک ہے۔ رقم میں نے بھر دی ہے، اسے سائنس کر دیں۔“ اس نے پین ان کے سامنے کیا۔ وہ کبھی اس کو دیکھتے، کبھی پین کو۔

”آغا جان! محمل بھی نہیں ہے۔ آپ مجھ سے میری آخرت خرید رہے ہیں۔ اگر میں نے جھوٹی گواہی دی، تو میں پل صراط پار کرنے سے پہلے ہی گرجاؤں گی۔ اگر گناہ ہے تو کچھ در تھہ تو ہونا چاہئے نا، آپ یہ سائنس کریں۔ میں ابھی جا کر جھوٹی گواہی دیتی ہوں۔“

اس نے پین اور چیک ان کے ہاتھ پر رکھا۔

”اس ہال میں کوئی میرے اشارے کا منتظر ہے، میں یہ چیک سائنس کروں اگر ابھی

اس کو بینک بھیجتی ہوں، جیسے ہی یہ چیک کیش ہوگا، وہ مجھے سکنل کرے گا، تب میں گواہی دے دوں گی، ورنہ نہیں۔“

انہوں نے چیک کو ایک نظر دیکھا اور پھر پین کو۔

دوسری طرف محمل کا نام پکارا گیا۔ وہ انہیں متبرہ نگاہوں سے دیکھتی اٹھی اور سر اٹھائے پورے اعتماد سے کٹھرے کی طرف بڑھی۔

آغا کریم بھی چیک کو دیکھتے اور بھی اسے، جو کٹھرے میں کھڑی تھی اور اس کے سامنے خلاف میں لپٹا قرآن لاایا گیا تھا، وہ نگاہیں ان پر جمائے پلک جھکے بغیر قرآن پر ہاتھ رکھ کر چند فقرے دہرا رہی تھی۔

انہوں نے آخری بار چیک کو دیکھا، اور پھر طیش میں آ کر اسے مردڑ کر دو ٹکڑے کئے۔

محمل تختی سے مکرائی، سر جھکا اور وکیل کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔



فواد کی ضمانت منسوخ ہو گئی۔ اس کے خلاف ثبوت بہت سے تھے۔ وہ واپس جیل بھیج دیا گیا۔

واپسی کا سفر بہت خاموشی سے کیا۔ وہ آغا جان کی لینڈ کروزر کی چھپلی سیٹ پر بہت خاموشی سے سارا راستہ باہر دیکھتی آئی تھی۔ جب کار پورچ میں رکی تو وہ سب سے پہلے اُتری۔

لان میں بہت سی عورتیں تیزی سے ان کی طرف بڑھی تھیں۔

”کیا ہوا؟“

وہ کسی کو دیکھنے بغیر تیزی سے اندر چل گئی۔

”اس احسان فراموش لڑکی نے فواد کے خلاف گواہی دے دی۔“

”ذلیل نہ ہوتا۔“

”مگر فلکر کی بات نہیں ہے، وہ جلد ہی باہر آ جائے گا۔ کیس اتنا مفبوط نہیں ہے۔“

غفران بچا اور اسد بچا انہیں تسلی دینے لگے، مگر تائی مہتاب کا چہرہ سفید پڑتا گیا۔
 ”ہائے میرا فواد۔“ وہ سینے پپے دو ہتھ مار کر اوپنچا اونچا رونے لگیں۔ روٹے روٹے وہ
 لاڑکنے کو تھیں کہ فضہ اور ناعمہ نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ پل بھر میں لان میں کہرام بج
 گیا۔ اپنے کمرے میں پردے کو ہاتھ میں پکڑ کر ذرا سی جھری سے دیکھتی وہ پُرسکون کھڑی
 تھی۔ کالی چادر سر سے پھسل کر چھپے گردن پپڑے بالوں پپھسل گئی تھی۔ بھورے بال
 چہرے کے اطراف میں گرے تھے۔ وہ کانچ سی سنہری آنکھیں سکیڑے پُرسوچ نگاہوں
 سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔



وہ ستون سے شیک لگائے نگے پاؤں گھاس پر رکھے بیٹھی تھی۔ جوتے ساتھ اترے پڑے تھے۔ سفید شلوار قمیض اور سر پر ٹکالی اسکارف کس کر باندھے وہ گردن جھکائے دونوں ہاتھوں میں چھوٹا قرآن لئے پڑھ رہی تھی۔ چھٹی ہو چکی تھی اور لڑکیاں ادھر ادھر گزرتی باہر جا رہی تھیں۔ اسے سورۃ کہف پڑھنی تھی۔ آج جمعہ تھا۔

”السلام علیکم!“ سارہ آہستہ سے آئی اور اس کے ساتھ پاؤں لٹکا کر سیرہ پیٹھی۔ اس نے صفحے کا کنارہ پکڑے سر کے اثبات سے جواب دیا اور صفحہ پلٹا۔

سارہ اپنی گود میں رکھی اس آئینتھ حل کرنے لگی۔ گیٹ کے قریب فرشتے کھڑی ایک لڑکی سے بات کر رہی تھی۔ وہ لڑکی منمناتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی، مگر فرشتے نبی میں سر ہلا رہی تھی۔ اُس کا اذلی پڑا عتماد، مضبوط اور دٹوک مگر زم انداز۔

”کیا کر رہی ہو سارہ؟“

”فرشتے بامی کی اس آئینتھ حل کر رہی ہوں، فرشتے بامی نے دی ہے۔“ انجھ کر سر اٹھایا۔ ”یہ دین اور مذہب میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

”دین، religion کو کہتے ہیں، جیسے اسلام۔ اور مذہب کسی بھی دین کے کسی اسکول آف تھاٹ کو کہتے ہیں۔ جیسے اسلام میں دو مذاہب ہیں۔ اہل السنہ والجماعۃ اور اہل تشیع۔ مسلک کسی مذہب کے اندر کسی طریقے کا نام ہوتا ہے، مثلاً فتنی مسالک جیسا کہ شافعی، حنفی وغیرہ۔ آئی سمجھو؟“

”ہوں۔ تمہارا فہم اچھا ہے محمل!“

”فرشته نے سمجھایا تھا اس دن۔“ اس نے ذرا سی گردن موڑی۔ فرشته اسی طرح اس سے بات کر رہی تھی۔ سارہ بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اسے دیکھنے لگی۔

”فرشته کی آئیز (آنکھیں) مجھے بہت پسند ہیں۔“ محل کے لوں سے چھلا۔

”ہاں، بہت مشاہبت ہے۔ آئی نو۔“ وہ بڑی طرح چونکی۔

”مشاہبت؟“ وہ ایک دم بہت پُر جوش ہو کر اس کی طرف مڑی۔ ”مشاہبت ہے تو سارہ! مجھے ہمیشہ فرشته کی آنکھیں دیکھ کر لگا ہے کہ یہ کسی سے بہت ملتی ہیں۔ تمہیں پڑتے ہے کس سے ملتی ہیں؟“

”تو تمہیں نہیں پڑتا؟“ ربیعہ حیران ہوئی۔

”کیا ان کے کزن سے؟“

”کزن کون؟“

”چھوڑو، تم بتاؤ، کس کس سے ملتی ہیں؟“

ربیعہ کچھ دیر حیرت سے اسے دیکھتی رہی، پھر خس پڑی۔

”تم سے ملتی ہیں محل! بالکل تمہارے جیسی ہیں۔ کیا تم آئینہ نہیں دیکھتیں؟“

”مجھ سے“ محل ساکت رہ گئی۔ اپنا چہرہ ہر وقت نگاہوں کے سامنے نہیں رہتا، شاید اس لئے وہ اتنے عرصے میں اندازہ نہ کر سکی۔

اس لڑکی کی کسی بات پر فرشته ذرا سی مسکرائی۔ اس کی آنکھیں مسکراتے ہوئے کناروں سے ذرا سی چھوٹی ہو گئیں۔ بلکہ اس کی اپنی طرح ہو ہو۔ وہ پلک جھپکے ہنا اسے دیکھے گئی۔

وہ بیڈ کراون سے ٹیک لگائے، گشنوں پر کتاب رکھے سوچ میں گم تھی۔ بھورے بال کھلے شانوں پر گرے تھے۔ سرت اندر داخل ہو گئی تو وہ اسی طرح خلا میں گھور رہی تھی۔ آہٹ پر چوکی۔

”آماں!..... بات سنیں۔“

”ہاں بولو۔“ سرت الماری کھول کر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

”آپ ماہوں لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملیں؟“

”نہیں۔“ ان کے ہاتھ لمحہ بھر کو تھے، پھر دوبارہ کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگے۔

”ماموں کی ایک ہی بیٹی ہے تو؟“

”ہاں شاید۔“

”اس کا نام کیا ہے؟“

”پہنچنے، وہ میری شادی کے بعد ہوئی تھی۔“ وہ مطلوبہ کپڑا انکال کر کھلنے دروازے سے باہر پڑی گئیں۔

اور یہ تو وہ جانتی تھی کہ اماں شادی کے ماموں سے کبھی نہیں ملیں۔ نہ ہی وہ خود کبھی ان سے ملی تھی۔ اس نے تو ان کو دیکھا تک نہ تھا، اماں اور ابا کی پسند کی شادی تھی۔ اور اماں کے خاندان والوں نے پھر کبھی کوئی رابطہ نہ رکھا تھا۔ آج فرشتے کی آنکھیں دیکھ کر اسے یونہی کچھ لگا تھا کہ شاید..... مگر خیر.....

”ہم نے فیصلہ کر دیا ہے۔“ باہر تائی کے زور سے بولنے کی آواز پر یکدم اس کا دل دھڑکا۔ وہ کتاب بند کئے لحاف اتار کر تیزی سے نشگے پاؤں باہر آئی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔

آغا جان اور مہتاب تائی بڑے صوفے پر رعنوت بھرے انداز میں بیٹھے تھے اور سرت ان کے سامنے جیسے بے بس سی کھڑی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر سرت نے اسے دیکھا۔ بے بسی، آنکھوں میں آنسو۔

”اپنی بیٹی کو بھی بتا دینا۔“ تائی نے ایک تفاخر بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ ”ہم اس کو بھوپال میں، ہمارا احسان ساری زندگی بھی تم دونوں چاہو تو تو نہیں اتار سکتیں۔“

وہ جہاں تھی، وہیں کھڑی رہ گئی۔ تو کیا فواد واقعی جیل سے باہر آجائے گا؟

”مگر بھاولی.....؟“ سرت کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز آئی۔ ”محل..... محمل کبھی نہیں مانے گی، وسیم کے لئے۔“

”وسیم؟“ وہ جھلکے سے دو قدم پیچھے ہٹی۔

اور یہ چند روز پرانی ہی تو بات تھی، جب فریدہ پھپھونے گھر آ کر، خوب حرے لے کر وسیم کے چند ”آنکھوں دیکھے تھے“ سنائے تھے۔ فریدہ پھپھو محمل کے ابا کی کزن تھیں

اور ہر خبر سارے خاندان میں سب سے پہلے ان کے پاس پہنچتی تھی۔ گھر میں تو چلوان کو تائی نے چپ کر دیا، مگر ہفتے بعد ہی ایک شادی کی تقریب میں انہوں نے وہی قصے چھیڑ دیئے، ابھی فواد کی گرفتاری کے چچے پرانے نہیں ہوئے تھے کہ خاندان والوں کے ہاتھ ایک اور شوشه لگ گیا۔

پوری تقریب گویا اکھاڑہ بن گئی۔ تائی مہتاب ان عورتوں کو جتنا لعن طعن کر سکتی تھیں، کیا مگر وہ اکیلی تھیں اور مقابل پورا جھتا تھا۔ معنی خنزٹا ہیں اور ہٹڑیہ انداز۔

”برانہ ماننا مہتاب بھابی! مگر وسیم کو میرے سمع نے ہی نشے کی حالت میں رات کے دو بجے سڑک سے اٹھا کر تمہارے گھر پہنچایا تھا۔“

”ہاں تو سمع خود اس وقت ادھر کیا کر رہا تھا؟“ تائی ہاتھ نپاتے ہوئے غصے سے بے قابو ہو کر بولی تھیں۔

وسیم کی بات بچپن سے آغا جان کے پچاڑا آغا سکندر کی بیٹی کے ساتھ ملے تھی۔ کچھ عرصے سے آغا سکندر کی فیملی کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی۔ اور جب یہ باتیں منظر عام پر آئیں تو انہوں نے فون پہ ہی دوٹوک رشتہ ختم کر دیا۔

”گزرے برسوں کی ایک نادانی تھی، وہ مہتاب بھابی! بھلا کس طرح ہم اپنی بیٹی کو اس لڑکے سے بیاہ دیں جسے پورے خاندان میں کوئی رشتہ دینے کو تیار نہیں؟“

”اور میں بھی آپ کو خاندان کی سب سے خوب صورت لڑکی وسیم کی دہن بنا کر دکھاؤں گی۔“ تائی نے بھی کھولتے ہوئے فون پہنچا تھا۔

محل کو قابو کرنے، اس کی جائیداد حاصل کرنے اور وسیم کو بیاہ کر خاندان میں گردن اوپنجی کرنے کا بہترین حل تائی کو نظر آہی گیا تھا۔ انہوں نے ایک تیر سے تین شکار کر لئے تھے۔



وہ سر جھکائے تیز تیز سڑک کے کنارے چلتی چاہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو شپ شپ گردہ ہے تھے۔ لمبے سیدھے بھورے بال شانوں پر پھسل کر کمرپ گردہ ہے تھے۔ کہاں کہہ، اسے کچھ پتہ نہ تھا۔

زندگی اس کے ساتھ یوں بھی کر سکتی ہے، اس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ ایک ٹنگ پھندا تھا، جو اسے اپنی گردن کے گرد کتا محسوس ہو رہا تھا۔
اواس درختوں کی گھنی باڑ آج بھی دیے ہی کھڑی تھی۔ شام کے پرندے شاخوں پر لوٹ آئے تھے۔ وہ راستہ جانا پچھانا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی، جب اس کی سماں توں نے وہ آواز سنی۔

”محمل!..... رکو۔“

مگر وہ نہیں رکی، اسے رکنا نہیں تھا، وہ رکنے والا راستہ تھا بھی نہیں۔

”محمل!“ وہ تیز دوڑتا اس کے ساتھ آملا۔ ”بات تو سنو۔“

پھولی سانسوں سے اس کے بائیں طرف اس کی رفتار سے بمشکل مل پاتا وہ ہمایوں تھا۔ ٹریک سوٹ میں لمبوس، وہ شاید جاگنگ سے آ رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے محمل؟ مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟“

اس کے قدم تھے۔ بہت آہستہ سے اس نے گردن اٹھائی، بھیگی سنہری آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔

”میرا اور آپ کا کیا رشتہ ہے جو میں آپ کو بتاؤں؟“

”کیا انسانیت کا رشتہ کچھ نہیں ہوتا؟“

”کچھ نہیں ہوتا۔“ وہ تیزی سے چلنے لگی تھی۔

”مگر ہوا کیا ہے؟“

”میری تائی نے میرا رشتہ اپنے آوارہ بیٹے سے طے کر دیا ہے۔“

”تو تم روکیوں رہی ہو؟“

”پھر کیا خوشی مناؤں؟“ وہ پوری اس کی طرف گھومی۔ غصہ بہت شدت سے اُبلا تھا۔ یہی شخص تھا اس کی ہر مشکل کا ذمہ دار۔

”ٹھیک ہے، تم صاف انکار کر دو۔ کچھ اور کرو، لیکن اگر یوں اپنے آپ پر ظلم سنتی روئی رہو گی تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گی۔“ اس نے بھیگی آنکھوں سے ہمایوں کا چہرہ دیکھا۔ مغرب در، مگر فکر مند چہرہ۔

”میں مروں یا جیوں، آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟“

اس کے اندر پہ وہ چند لمحے بھیجے خاموش کھڑا رہا، پھر گہری سانس اندر کو کھینچی۔

”ہاں، مجھے نہیں فرق پڑتا۔“ وہ واپس پلٹ گیا۔

”ہونہہ!“ محل نے استہزا سے سر جھکا۔ ”آپ وہ ہی ہیں تا، نجی راہ میں چھوڑ دینے والے۔“ وہ جیسے چونک کر پلٹا۔

ای میں ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تھا۔ اس کے بھیکے چہرے کے اطراف میں گرے بال بھیچے کو اڑنے لگے تھے۔

”اور آپ کو پتہ ہے ہمایوں! اسی لئے آپ سے میں نے کبھی امید ہی نہیں لگائی تھی، پھر کیا میں نہ روؤں؟“ وہ کہہ کر واپس پلٹ گئی۔ ہوا بھی پلٹ گئی، شام کے پرندے بھی پلٹ گئے۔

وہ ساکت سا ہارکول کی دریان سڑک پر کھڑا رہ گیا۔
درختوں کی باڑا ببھی اُداسی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔



اس نے اشاف روم کے دروازے پر بلکل سی دستک دی۔ چند لمحے منتظری کھڑی رہی، پھر جواب نہ پا کر اندر جمانکا۔ اشاف روم خالی تھا۔

وہ کتابیں سینے سے لگائے متذبذب سی واپس پلٹ گئی۔ اسی میں سامنے سے ایک گردب پ انچارج آتی دکھائی دی۔

”السلام علیکم، میسم! فرشتے کو دھریں؟“

”فرشتے باجی ہائل میں لا بیری میں ہوں گی، ان کو کچھ کام تھا، اسی لئے وہ آج آنہیں سکھیں۔“

”اچھا۔“ وہ تیزی سے سر جیاں پھلانگنے لگی۔

لا بیری کا گلاں ذور کھلا تھا۔ اس نے قدرے جھکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔

کتابوں کے اوپرے ریکس اور دیوار سیکر فرنچ وندوز، لا بیری کا مخصوص خاموش ماحول۔

”فرشته؟“ اس نے ہولے سے پکارا۔ خاموش لاہری کا تقدس زخمی ہوا تو وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔

”ادھر۔“ لاہری کسی کونے سے نکل کر آئی اور ایک طرف اشارہ کیا، وہ شرمندہ کی ادھر لپکی۔

چند ریکس سے گزر کر اس نے دوسری طرف جہانکا۔

وہ کتاب اٹھائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، ملکے گلابی شلوار قمیض پر گردے دوپٹہ شانوں کے گرد لپیٹے، فرشتے کی اس کی طرف پشت تھی۔ محمل کو اس کی کمر پر گرتے سید ہے بھورے بال دکھائی دیتے تھے۔

وہ ذرا سی حیران ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ جاپ میں لمبیں فرشتے کو دیکھا تھا۔ سر ڈھکے بغیر تو وہ قطعاً مختلف لگ رہی تھی۔

”فرشته؟“ وہ جیسے چونک کرڑی۔ اسے دیکھا تو مسکرا دی۔ ”ارے ماشاء اللہ! آج تو لوگ لاہری آئے ہیں۔“

”مگر صرف آپ سے ملتے۔“

”بیٹھو۔“ وہ کھڑکی سے گلی کری پا آئی، جس کے سامنے میز تھی۔ میز کے اس طرف ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ وہ محمل نے سنبھال لی اور کتابیں میز پر رکھ دیں۔

”مجھے ہمایوں نے کچھ بتایا تھا۔“ وہ کہنے لگی تو محمل خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

لبے سید ہے بھورے بال جو اس نے کانوں کے بیچے کر رکھے تھے۔ دمکتی رنگت والا چہرہ اور کافی سی سہری آنکھیں، اس کے نقش مختلف تھے، مگر آنکھیں اور بال یوں تھے جیسے وہ آئینہ دیکھ رہی ہو۔

”تو تمہارا رشتہ انہوں نے اپنے بیٹے سے ملے کر دیا ہے؟“

محمل نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلاایا۔

”تو تم انکار کر دو۔“

”کس کے لئے انکار کروں؟ اس کے لئے جو حق راہ میں چھوڑ جاتا ہے؟“ وہ کہنا چاہتی تھی، مگر کہہ نہ سکی۔ یہ تو ابھی اس نے اپنے دل سے بھی نہ کہا تھا، فرشتے سے کیسے

کہتی؟

”میں کیوں انکار کروں؟ کیا میں صبر کر کے اجر نہ لوں؟“

”محمل! مظلومیت اور صبر میں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق احتجاج کرنے کا حق رکھنے کا ہوتا ہے، بجائے اپنی زندگی خراب کرنے کے۔ تم ایک بہتر راستہ چن لو، صاف صاف انکار کر دو۔“

”مجھے ان کے سی ایکشن سے ڈر لگتا ہے۔“

”اس پر تم صبر کر لیجئے۔“ وہ بہلی سی مسکرائی۔ ”رشتہ داروں کے ساتھ بہت صبر سے گزارا کرنا پڑتا ہے لڑکی!“

”آپ کرتی ہیں صبر؟“

”کیا مطلب؟“

”آپ کے رشتہ دار ہیں فرشتے؟ آپ کے پیرش؟ اور ہمایوں کے پیرش....؟“
اس نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔ جانتی تھی، فرشتے کو ادھورے سوال پڑھنے آتے تھے۔

”میری امی کی ایک بھی بہن تھیں، ہمایوں ان کا بیٹا ہے۔ ان کی ڈی-تھہ کے بعد اسی نے ہمایوں کو گود لے لیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے، ڈیڑھ سال پہلے میری امی کی ڈی-تھہ ہو گئی۔ پھر میں نے اور ہمایوں نے فیصلہ کیا کہ گھر میں ہمایوں رہے اور میں ہائل میں رہوں۔“

”اوہ آپ کے ابو؟“

”میں میرز کی میں تھی، جب ان کی ڈی-تھہ ہوئی۔“

”آپ کے ابو کی کوئی بہن تو ہوں گی؟“ اس نے اندر میرے میں تیر چلایا۔

”ہاں۔ ایک بہن ہیں۔“ فرشتے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”کھڑر رہتی ہیں؟“

”بیٹکی، اسی شہر میں۔“

”وہ آپ سے ملتی ہیں؟“

”نہیں، کچھ پر الجزر کی وجہ سے وہ لوگ مجھ سے نہیں ملتے۔“

”اور آپ؟“

”میں کوشش تو کرتی ہوں کہ ہر عید پر ان کے گھر ہواؤں، لیکن وہ میرے اوپر دروازے بند کر دیتے ہیں۔“

”پھر؟“ وہ ناپلک جھپکے اسے دیکھتی آگے کو ہوئی۔

”پھر میں کیک اور پھول دے کر واپس آ جاتی ہوں۔ میری اتنی ہی استطاعت ہے، آگے کیا کر سکتی ہوں؟“ وہ سادگی سے مسکراتی۔

(کیک اور پھول؟ عیدوں پر بہت جگہوں سے مشہدی اور کیک، پھول وغیرہ آتے تھے، کیا وہ بھی بھیجتی تھی؟)

”آپ کی پچھوکے کتنے بچے ہیں؟“

”ایک ہی بیٹی ہے۔“ اور اسے پتہ تھا، فرشتے جھوٹ نہیں بولتی۔ اس کا تجسس تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”کیا عمر ہو گی اس کی؟“

”مجھ سے تو چند سال چھوٹی ہی ہے۔“

”نام کیا ہے؟“

”یہ ضروری تو نہیں ہے محمل!“ فرشتے جیسے ذرا سی مضطرب ہوئی تھی۔

”ہو سکتا ہے میں آپ کی فیملیز کو ملانے میں کچھ مدد کر سکوں؟“

”نہیں۔“ فرشتے نے بغور اسے دیکھتے نہیں میں سر ہلاایا۔ ”تم میری پچھوکی بیٹی کو نہیں جانتیں۔“

”پھر بھی.....“

”کیا ہم ٹاپک چینچ کر سکتے ہیں؟“

اس کے از لی خhos اور قطعی انداز پر وہ گھری سانس لے کر رہ گئی۔

”یہ کھڑکیاں بہت خوب صورت ہیں۔“ وہ کہہ کر پر سوچ انداز میں کھڑکی کے باہر اتری صبح کو دیکھنے لگی۔

رات کھانے کے بعد اس نے سب کے کمروں میں چلے جانے کا انتظار کیا، یہاں تک کہ لاڈنگ میں تی وی کے آگے جم کر بیٹھی لو کیاں بھی اُنھوں نے لگیں اور لاڈنگ خالی رہ گیا تو وہ دبے قدموں سے باہر نکلی۔ آج اسے آغا جان کو صاف انکار کرنا تھا۔ لاڈنگ اندر ہرے میں ڈوبتا تھا۔ آغا جان کے بیڈ رومن کے دروازے سے روشنی کی لکیر آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے تک آئی۔ قریب تھا کہ وہ دستک دے ڈالتی کہ اندر سے آتی آوازوں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

”اس لڑکی سے کوئی بعید نہیں۔ آج پھر وہی آفس آگئی تھی۔“ آغا جان کی سوچ میں ڈوبی آواز آئی۔

”کون، فرشتے؟“ تائی کا حیران کن لہجہ۔ ”پھر وہی پرانی بات کرنے کے محمل کی جائیداد میں اس کا بھی حصہ نکالیں؟“

محمل کو لگا، پوری چھت اس پر آن گری ہے۔

”ہاں، آج وہ آفس آئی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اگر ہم نے دسمبر سے محمل کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو....“

تایا جان پچھے کہہ رہے تھے اور چند دن پہلے کی پڑھی گئی ایک حدیث اس کے کان میں گوئی، جس کا فہم پچھے اس طرح تھا کہ اگر کوئی تھارے گھر میں جھانکے اور تم پتھر مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دو، تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔

نہیں..... وہ گھبرا کر اٹھی۔ اسے نہیں دیکھنا چاہئے۔ وہ غلط کر رہی ہے۔ وہ کسی کی پرائیویٹسی میں جھانک رہی ہے۔

اگلے ہی لمحے وہ واپس کرے کی طرف بھاگی تھی۔ دروازے کی کندھی لگا کر وہ پھولی سانس کو قابو کرتی بیٹھ پر گرسی گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

”محمل کی جائیداد میں فرشتے کا حصہ؟“

گوکر اسے شک تھا کہ فرشتے کا اس سے تعلق ضرور ہے اور شاید بلکہ یقیناً وہ اس کے ان قطع کے ہوئے، نہیں ای رشتہ داروں میں سے ہے، لیکن پھر بھی تائی کے منہ سے اس کا نام سن کر اسے بہت بڑا جھٹکا لگا تھا۔ اس سے بھی بڑا جھٹکا، فرشتے کا مطالبہ جان

کر کیا فرشتے نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ محمل کے حصے میں سے اسے بھی کچھ دیا جائے؟..... مگر کیوں؟ فرشتے ایسا کیوں کرے گی؟
اس کی نگاہوں میں ایک سراپا لہرایا۔

سیاہ عبایا میں ملبوس، گرے اسکارف میں ملامِ چہرے کو مقید کئے شہری آنکھیں جھکائے دونوں ہاتھوں میں چھوٹا قرآن پکڑے، بال پوائنٹ سے صفحے پر کچھ مارک کرتی فرشتے۔

وہ کون تھی؟ اس کا پورا نام کیا تھا؟ وہ ہمایوں سے زیادہ ملتی نہ تھی، لیکن محمل کے متعلق ہر خبر اس کے پاس ہوتی تھی۔ وہ کیوں اس کی خبر رکھتی تھی؟ اور وہ کیوں آغا جان سے ملتی تھی؟

بہت سی انجھنوں کے سرے وہ سلجنچانہ پارہی تھی، لیکن ایک بات طے تھی، فرشتے کا عظمت بھرا وہ تصور جو اس نے ذہن میں بنا رکھا تھا، گر کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔



وہ چینی کی پلٹیں اختیاط سے یکبنت سے نکال کر کاؤنٹر پر رکھ رہی تھی، جب آہٹ پہ چونکہ کر پڑی۔

پکن کے کھلے دروازے میں فضہ چمچی کھڑی اس کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

”جی چمچی؟“ وہ قدرے اُبھی۔ پھر ایک نظر خود پڑا۔ سادہ سی گلابی شلوار قمیص پر سیاہ دو پٹہ کندھوں کے گرد لپیٹے سلکی بالوں کو اوپنجی پونی ٹیل میں مقید کئے وہ ہر دن کی طرح ہی لگ رہی تھی، پھر چمچی کو کیا ہوا تھا؟

”کچھ چاہئے چمچی؟“ اس نے پھر پوچھا۔ ان کی نظریں اب اس کو پریشان کرنے لگی تھیں۔

”ہوں، نہیں۔“ فضہ چمچی نے سر جھکا، اور واپس چلی گئیں۔ جاتے کے اسے ان کے چہرے پر ہلکا سا شفیر نظر آیا تھا۔

”ان کو کیا ہوا ہے؟“ وہ پلٹیں کپڑے سے صاف کرتے ہوئے سوچنے لگی، پھر شانے اچکا کر کام میں مصروف ہو گئی۔ ڈزر کا نائم ہونے والا تھا اور اسے میز لگانی تھی۔ سب آتے ہی ہوں گے۔

”میں نے اور مسرت نے وسیم اور محمل کار شترے طے کر دیا ہے، آپ سب کو یقیناً علم ہو گا۔“ وہ رائستہ کا ڈونگہ میز پر رکھ رہی تھی، جب آغا جان نے سب کو مخاطب کیا۔

ڈائنسنگ ہال میں سنائا سا چھا گیا۔ گو کہ سب کو معلوم ہی تھا، پھر بھی سب چپ تھے۔ وہ سر جھکائے اپنی آخری کرسی پر آبیٹھی اور پلیٹ اپنی جانب کھسکائی۔

”یہ فیصلہ آپ نے بالا ہی بالا کر لیا یا مرت پچی سے پوچھنے کی زحمت بھی کی؟“
حسن کے طرزیہ لجھ نے سب کو چونکایا تھا۔ وہ بھی بے اختیار سراٹھا کرائے دیکھنے لگی، جو
اکثرے تیوروں کے ساتھ آغا جان کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا مطلب؟ مرت کی مرضی سے ہوا ہے رشتہ؟“ آغا جان براہم بھی ہوئے اور
حیران بھی۔

”کیوں چھی؟“ اس نے خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی مرت کو مخاطب کیا۔ ”آپ
کو اس دسمبر کا رشتہ منظور ہے، جسے خاندان میں کوئی بیٹی دینے کو تیار نہیں؟“
مرت کا جھکا سر مزید جھک گیا۔ فضہ نے ناگواری سے پہلو بدلا۔

”باتیے چھی! اگر آپ خاموش رہیں تو اس کا مطلب ہے، آپ کے ساتھ آغا جان
نے زبردستی کی ہے۔“

”کیا بکواس ہے یہ حسن؟“
”آغا جان! مجھے مرت پچی سے بات کرنے دیں۔“ حسن کی آواز بلند ہونے لگی
تھی۔ سب دم بخود اس کو دیکھ رہے تھے۔

”باتیے چھی! آپ کو یہ رشتہ منظور ہے؟“
”نہیں.....“ محمل نے قطعی انداز میں کہا۔ اسے معلوم تھا، اس کی ماں کچھ نہیں بول
سکے گی۔

سب نے چونک کرائے دیکھا۔ خود حسن بھی قدرے ٹھٹکا۔

”تم بیچ میں مت بولو۔“ آغا جان براہم ہوئے۔

”ابھی نہیں بولی تو نیا حکم کے وقت انکار کر دوں گی۔ یہ حق مجھے میرے دین نے دیا
ہے، آپ نے میرے ساتھ زبردستی کی تو میں کورٹ تک چلی جاؤں گی۔“

”مگر تمہیں کیا مسئلہ ہے دسمبر سے؟“ غفران چچا جھنجلائے۔ ایسی ہی جھنجلاہٹ فضہ
کے چہرے پر بھی تھی۔

”اگر دسمبر اتنا ہی اچھا ہے تو غفران چچا! آپ نہ ایسا سامیہ باجی کا رشتہ اس کے ساتھ
کیوں نہیں کر دیتے؟“

بہت دنوں بعد پورے گھر نے پرانی محمل دیکھی تھی۔

”شٹ اپ!“

”میں انکار کر چکی ہوں، اگر آپ لوگوں کو مزید اپنی بے عزتی کروانے کا شوق ہے تو میں نکاح کے موقع پر اس سے بھی زور دار انکار کروں گی۔“

”ارے شکر کرو کہ ہم تمہیں بہو بنارہے ہیں۔“ بہت دیر سے خاموش بیٹھی تائی مہتاب ضبط نہ کر پائیں۔ ”جو لڑکی ایک رات گھر سے باہر رہ چکی ہو، اسے کوئی نہیں قبول کرتا، ہم بہونہ بنائیں تو کون قبول کرے گا تمہیں؟“

”میں!“ حسن جیسے بھڑک کر بولا تھا۔ ”میں قبول کروں گا محمل کو۔ وہ دسم سے شادی نہیں کرنا چاہتی، میں اپنا نام سرت چینی کے سامنے رکھ رہا ہوں اور چینی! میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔“

”ہرگز نہیں۔“ فضہ پھٹ پڑیں۔ ”میں اس لڑکی کو کبھی قبول نہیں کروں گی، جو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

”مجی!“ وہ زور سے چینا تھا۔

اس سے مزید سنا نہیں گیا، وہ کرسی دھکیل کر بھاگتی ہوئی ڈائنس ہال سے نکل گئی۔



بریگیڈیر فرقان کا بغلہ، جس کے ٹیرس پر بوگن ویلیا کی بیلوں کا راجح تھا، آج بھی اسے دیساں ہی اداس اور ویران لگا تھا، بلکہ وہ شاید ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ لکھن کے خود قرآن پڑھنے اور مکان کو محض سنوانے میں بہر حال فرق تو ہوتا ہے۔

آج پھر وہ چند بیکلش ہاتھ میں پکڑے ان کے گیٹ پر کھڑی تھی۔

تل پہ طازم نے بھاگ کر چھوٹا دروازہ کھولا۔

”جی بی بی؟“ اس نے سر باہر نکلا۔

”مجھے بریگیڈیر فرقان سے ملتا ہے، وہ اندر ہیں؟“

”جی، وہ کام کر رہے ہیں۔“

”ان سے کہو، محمل آئی ہے۔“ قدرے تھکم سے کہہ کر وہ سینے پر پازو پاندھے دیں

کھڑی ہو گئی۔ فوراً ملازم اندر کو دوڑا۔ چند لمحے بعد ہی اس کی واپسی ہو گئی۔
”صاحب کہہ رہے ہیں، آپ اپنے کاغذ لے لیں۔“ اس نے پرانے پمپلٹس اس
کی طرف بڑھائے۔

”انہوں نے پڑھ لئے ہیں؟“

”نبیل جی، وہ مصروف ہیں۔“

”اپنے صاحب کو کہو، یہ ان پر میری امانت تھی، جب انہوں نے لئے تھے تو میری
سوپنی گئی ذمہ داری بھی انہیں نہ ہاتھی تھی، ورنہ لینے سے ہی انکار کر دیتے۔ انہوں نے
خیانت کر کے یہ لوٹائے ہیں۔ اور اگر میں نے معاف نہیں کیا تو ان کو معافی نہیں ملے
گی۔“

ملازم ہونتوں کی طرح اسے دیکھنے لگا، پھر اندر لپکا۔

”صاحب آپ کو اندر بلارہ ہے ہیں۔“ وہ پیغام دے کر جلد ہی واپس آیا تھا۔
”شکر یہ۔“ وہ پورے اعتماد سے اندر چلی آئی۔

اسٹری کا دروازہ کھلا تھا۔ محمل نے چوکھٹ میں کھڑے کھڑے دروازہ انگلی کی پشت
سے بجا یا۔

اسٹری نیبل کے پیچے ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بریکیڈ یز فرقان نے کتاب پر جھکا سر
اٹھایا اور عینک کے پیچے سے اسے دیکھا، جو دروازے کے نیچے کھڑی تھی۔

یونیفارم کی سفید شلوار قمیش اور چہرے کے گرد نفاست سے لپٹا تردد تازہ گلابی
اسکارف جو پیچے سے اوپری پونی کے باعث ذرا سا اٹھ گیا تھا۔ ہاتھ میں چند پمپلٹس
پکڑے وہ دراز قد، سبھری آنکھوں والی لڑکی ختنتری کھڑی تھی۔

”دسم ان۔“ بریکیڈ یز فرقان نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا، کتاب بند کی اور کرسی پر
قدرے پیچے کو نیک لگائی۔

”میں کچھ پمپلٹس دے کر گئی تھی۔“

”اور میں نے واپس کر دیئے تھے، اور کچھ؟“ ان کے بارہ بجھے پر قدرے
ناگواری تھی۔

”جی، یہ کچھ اور ہیں۔“ وہ آگے بڑھی اور چند پھفٹس ان کی میز پر رکھے۔ ”یہ آپ پڑھ کر مجھے واپس کر دیجئے گا۔“
”مگر مجھے یہ نہیں چاہئیں۔“ وہ بے زار سے بولے۔

”میں نے آپ کو چوائیں تو نہیں دی سرا! آپ کو یہ لینے پڑیں گے۔ میں کچھ عرصہ بعد آ کر واپس لے لوں گی۔ پڑھ کر سن جاں لیجئے گا، ان پر اللہ کا نام لکھا ہے۔ امید ہے آپ پھینکیں گے نہیں۔“ وہ کھڑی کھڑی کہہ کر تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

بریگیڈیر فرقان نے تملک کر ایک نظر ان پھفٹس کو دیکھا، پھر دراز میں ڈال کر اپنی یمنک اٹھائی اور کچھ بڑھاتے ہوئے کتاب کھول لی۔



وہ اپنی ذہن میں راہ داری میں چلتی جا رہی تھی کہ اچانک دوسری طرف سے آتی فرشتے پر نگاہ پڑی، اس کے لب پھیج گئے، بے اختیار ہی وہ چیچپے ہوئی تھی۔

فرشتے نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ چلتی شیرخ سے فکر مندی سے کچھ کہتی چلی آرہی تھی۔ محمل اُلٹے قدموں واپس ہوئی اور برآمدے میں رخ موڑ کر کھڑا ہو گئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق فرشتے نے اس کی موجودگی نوٹ نہیں کی۔ ساتھی شیرخ کے ہمراہ پیچے پریزہاں کی سیر حیاں اترتی گئی تھی۔

پریزہاں میں ملک کے نامور دینی اسکالر، ڈاکٹر سرور مرزا کے پیغمبر کا انعقاد تھا۔ وہ بھی سست روی سے چلتی ہوئی ایک درمیانی صفت کی نشست پر آئی۔ ابھی پیغمبر شروع نہیں ہوا تھا۔ محمل نے ہاتھ میں پکڑا پاکٹ سائز قرآن کھولا اور یوں ہی پڑھنے کے لئے صفحے پلٹنے لگی۔

”فرشتے نے ایسا کیوں کیا؟“ یہ سوال مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

اس نے آغا جان سے محمل کی جائیداد میں سے حصہ کیوں مانگا؟ فرشتے جیسی لڑکی اتنی مادہ پرست ہو سکتی ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس نے مطلوبہ صفحہ پلٹا اور وہ آیات نکالیں جو آج پڑھائی جانے والی تھیں، مگر ڈاکٹر سرور کے باعث آج تفسیر کی کلاس نہیں ہوتا تھی۔

”اور ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔“

”اوہ!“ گھری سانس لے کر محمل نے قرآن بند کیا۔ ”میرا کچھ بھی پرائیوریٹ نہیں ہے۔“ اس نے آہستہ سے گردن اوپر کو اٹھائی اور پھر اوپر دیکھتے ہوئے مکرا کر رجھ لگا۔ جب بھی ایسا کچھ ہوتا، اسے قرآن پہ بے حد پیار آتا تھا۔ اسے لگتا تھا، دنیا میں اس سے تیز کوئی کیونکیشن موڈ ایجاد نہیں ہوا تھا۔

”مگر ایسا کیا ہے جو مجھے اس سوال کا جواب برا لگے گا؟“
وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پھر سے سوچنے لگی تھی۔

ڈاکٹر سر در پچھر شروع کر چکے تھے۔ پورا ہال کھچا کھج بھرا تھا۔ دور دور تک پنک اسکارف میں ڈھکے سر دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹچ کے قریب چیز رز پر اشاف موجود تھا۔ فرشتے بھی وہیں ایک کرسی پہ بیٹھی، ڈائری پر تیز تیز پچھر نوٹ کر رہی تھی۔ اسے نوش لیتے دیکھ کر وہ خود بھی چوک کر ڈاکٹر سر در کی طرف متوجہ ہوئی، جو روشنیم پر کھڑے تھے۔ سر پر جنارج کیپ، سفید داڑھی، شلووار قمیض اور داسکٹ میں ملبوس وہ خاصے منجھے ہوئے ہے اسکا لر تھے۔ وہ اکثر ان کوئی وی پر دیکھتی رہتی تھی۔

اپنی سوچوں کو جھلک کر وہ بغور پچھر سننے لگی۔

”بعض لوگ قرآن پڑھ کر بھلتتے ہیں، واقعی ایسا ہوتا ہے۔“ وہ اپنے خصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔ ”اس لئے بہتر ہے کہ قرآن کسی اچھے غیر متعصب عالم سے زندگی میں ایک دفعہ ضرور پڑھ لینا چاہئے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی کا ”دامن“ پکڑنا ضروری ہے۔ نہیں، بلکہ کسی غیر متعصب تفسیر کو پڑھ کر بھی کسی حد تک قرآن کی کچھ بوجہ پیدا کی جاسکتی ہے۔ قرآن کو پڑھ کر ہم ہر آیت کے اپنے حالات کے مطابق کئی مطالب نکالیں، وہ مطلب نکالتا غلط نہیں ہے، مگر ظاہر کو باطن سے تشبیہ دینا قطعاً غلط ہے۔ مثلاً نبی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا جو حکم اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مویٰ علیہ السلام کے ذریعے دیا تھا، وہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس واقعہ سے ہم یہ سبق تو نکال سکتے ہیں کہ سوال سے حکم مشتبہ ہو جاتے ہیں، مگر اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلا کہ وہاں ”گائے“ سے مراد

ایک صحابیہ ہیں۔ نعوذ باللہ بعض لوگوں نے واقعیت یہاں ”گائے“ سے مراد ایک صحابیہ کو لیا ہے۔ ایک اور مثال، سورہ حجر کی آخری آیات میں ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرو، یہاں تک کہ تمہارے پاس یقین آجائے۔“

اب یہاں ”یقین“ سے مراد ”موت“ ہے۔ یعنی موت آنے تک عبادت کرتے رہو۔ مگر بعض لوگ یہاں ”یقین“ سے مراد *belief* لے کر، اپنی عبادت کو کافی سمجھ کر بس کر دیتے ہیں کہ جی، ہمیں اپنی عبادت پر یقین آگیا ہے تو سب عبادتیں بس، ختم۔“ سورہ حجر کہاں تھی بحلا؟ اس نے آہستہ سے اپنا چھوٹا قرآن کھولا اور صفحے پڑھنے لگی۔ سورہ حجر می تو اس نے اس کی آخری آیات کھولیں۔ آیت وہی تھی، جو وہ کہہ رہے تھے۔ مگر آخری تین الفاظ عربی میں ”حتیٰ یا تی الیقین“ تھے۔ (تحتی کہ یقین آجائے) ”یقین...؟“ اس نے ”الیقین“ پر انگلی پھیری، پھر انگلہ کر ڈاکٹر سرور کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”یہاں پر یقین سے مراد یقین نہیں بلکہ موت ہے۔“ سو اس طرح کے الفاظ کا من چاہا مطلب نکالنا انسان کو بھٹکا سکتا ہے۔ اینی کوئی؟“ انہوں نے رک کر ایک مگری نگاہ ہال پر ڈالی۔

محمد نے ہاتھ فضا میں بلند کیا۔

”لیں؟“ انہوں نے سر کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ ہاتھ میں قرآن پڑے اپنی نشست سے اٹھی۔

”سر! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے پاس بغیر ترجمے والا مصحف ہے۔ اس میں ذکورہ آیت میں واقعی ”یقین“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سو اس کا مطلب ”موت“ کیسے ہوا؟ دونوں الفاظ میں خاصاً فرق ہے۔“

”اس کا مطلب موت ایسے ہے کہ۔“ وہ ذرا دیر کوڑ کے اور بغور اسے دیکھا۔ ”میں نے اس کا مطلب موت نکالا ہے۔“

”جی سر! میرا یہی سوال ہے کہ کیسے؟ اس کی دلیل کیا ہے؟“

”دلیل یہ ہے کہ میں نے، یعنی ڈاکٹر سرور مرزا نے اس کا مطلب موت لیا ہے۔“

میں اس ملک کا سب سے بڑا اسلامک اسکالر ہوں۔ آپ میرے کریڈنسلز اٹھا کر دیکھیں، میری ذُگریز دیکھیں۔ کیا میری بات بطور ایک ثہوس دلیل کے کافی نہیں؟“
اگلی صفحوں میں بیٹھی لوکیاں گرد نہیں موز کرائے دیکھنے لگی تھیں جو ہاتھ میں چھوٹا قرآن پکڑے کھڑی تھی۔

”سر! آپ کی بات یقیناً اہم ہے، مگر قرآن کا بعض اس کے بعض کی تفسیر کرتا ہے، حدیث بھی یہ کرتی ہے۔ کیا قرآن یا حدیث میں کہیں یہ ذکر ہے کہ یہاں ”یقین“ سے مراد ”موت“ ہے؟“ وہ بہت شاشکنی و لحاظ سے مودب سی پوچھ رہی تھی۔ ڈاکٹر سرور کے چہرے پر واضح ناگواری اُبھری۔

”یعنی کہ اگر میں آپ کو اس مطلب کی دلیل نہ دوں تو اسے محض میری بات سمجھ کر آپ جھٹلا دیں گی؟ یعنی آپ کو میری بات کے اوپر مزید کوئی دلیل چاہئے؟“
”جی!“ اس نے ہولے سے سر ہلا دیا۔

پورے ہال میں ایک افطراب کی لہر دوڑ گئی۔ لوکیاں قدر سے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”یعنی آپ ایک دینی اسکالر کو چیخنے کر رہی ہیں؟“

”سر! میں بہت ادب سے صرف دلیل مانگ رہی ہوں۔“

”اگر اس کی دلیل قرآن و حدیث میں نہ ہو، تو کیا آپ ”یقین“ کا مطلب ”موت“ تسلیم کر لیں گی؟“
”نہیں سر! کبھی بھی نہیں۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر سرور نے گھری سانس لے کر ہال پر ایک نظر دوڑائی۔ ”کیا کوئی اور بھی ہے جو اپنی عمر سے زیادہ طویل تجربے کے حامل ایک اسکالر کو چیخ کرے؟ کسی اور کو بھی دلیل چاہئے؟“

بہت سے سرنگی میں مل گئے۔ وہ اکیلی کھڑی تھی۔

”یعنی تین سو لاکیوں میں سے ایک لاکی کو دلیل چاہئے؟ یہی پڑھا رہے ہیں آپ لوگ اس مسجد میں؟ کون ہیں آپ کی کلاس انچارج؟“

میڈم مصباح کھڑی ہوئیں۔

”کیا آپ اس ناکام کلاس روپورٹ کی ذمہ داری لیتی ہیں؟ ون آؤٹ آف تحری ہندروٹ کی؟“

”جی سر!“ میڈم مصباح کا سر قدرے جھک گیا۔ ڈاکٹر سرور نے محمل کو دیکھا۔

”کیا آپ کو ابھی بھی دلیل چاہئے؟“

”جی سر!“

وہ پچھہ دری خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے، پھر بلکے سے مکارے۔

”الدڑ، آیت 13-17 میں یقین کا لفظ موت کے لئے استعمال ہے، وہاں سے ہم دلیل لیتے ہیں کہ یہاں بھی یقین سے مراد موت ہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے رجوب ہوئے بغیر ادب کے دائرے میں رہ کر مجھ سے دلیل مانگی، اور مجھے افسوس ہے کہ صرف ایک بھی نئے یہ جرأت کی۔ باقی سب خاموش رہیں۔ دوسو ننانوے لوگوں میں یقیناً ابھی یہ کسی موجود ہے جو کہ ایک قرآن کلاس کی ناکام کارکردگی کا ثبوت ہے۔ کیا کوئی شخص ذمہ داروں کا پلندہ لے کر آپ کے سامنے آئے، خود کو سب سے بڑا نہیں اسکا لہائے تو آپ اس کی بات کو بطور دلیل مان لیں گے؟ کیا آپ کو پہلے دن ہی نہیں بتایا گیا تھا کہ دلیل صرف قرآن یا حدیث ہوتی ہے؟ کسی عالم کی بات دلیل نہیں ہوتی، پھر؟“

بہت سے گالی اسکارف میں لپٹے سر جھک گئے۔ محمل سرخوں کی اپنی نشست پر بیٹھی۔ ڈاکٹر سرور اور بھی بہت پچھے کہہ رہے تھے، مگر وہ سورہ الدڑ کھول کر اس آیت کو کاؤنٹر چیک کر رہی تھی۔

(سورہ الدڑ کی 13-17 تک کا ترجمہ ڈاکٹر سرور کی تصدیق کر رہا تھا)

”محمل!“

پچھے کے بعد وہ کاریڈور میں سے گزر رہی تھی، جب فرشتے نے اسے پیچھے پکارا۔ اس کے قدم وہیں تھم گئے مگر وہ مڑی نہیں۔ فرشتے تیز تیز چلتی اس کے قریب آئی۔

”آئی ایم پراؤ آف نو، محمل!“ وہ یقیناً بہت خوش تھی۔ گرے اسکارف میں مقید اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

محمل اجنبی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”ڈاکٹر سرور تم سے بہت خوش ہیں۔ انہوں نے ایک سیمیار کے لئے تمہارا نام دے دیا ہے، اور تم میرے ساتھ ادھر جا کر آپسچ کر دیں۔“

”آپ کے ساتھ....؟“ وہ بولی تو اس کی آواز میں خزانوں کی سی خنگی تھی۔ ”بھر مجھے نہیں جاتا۔“

”کیا مطلب.....؟“ فرشتے کی مکراہٹ پہلے دمم ہوئی، اور پھر آنکھوں میں حیرت اُبھری۔

”مجھے جھوٹے لوگ سخت ناپسند ہیں۔“

”محمل!“ وہ ششدڑ رہ گئی۔ ”میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟“

”یہ سوال آپ خود سے کیوں نہیں کر سیں؟“

”تم سے کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”میں بھی نہیں ہوں فرشتے!“ وہ گویا پھٹ پڑی تھی۔ اندر آئنے لاوے کو باہر کا راستہ نظر آگیا تھا۔

”آپ کیوں گئیں میرے آغا جان کے پاس؟ کیا لگتے ہیں وہ آپ کے؟ میں ایک یتیم لڑکی ہوں، کیا آپ کو یتیم کے مال میں سے حصہ چاہئے؟ کیوں کی آپ نے اسکی حرکت؟ آپ کو جانے کس اوپنجی مندر پر بخمار کھاتھا میں نے، بہت بڑی طرح خود کو گرایا ہے آپ نے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ ایسے کریں گی، کیا رشتہ ہے آپ کا مجھ سے، آپ جھوٹ نہیں بولتیں مگر صحیح چھپانا بھی تو جھوٹ ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا، آپ کی پچھوکی بیٹی کا کیا نام ہے، آپ نے نہیں بتایا۔ کیوں؟..... آخر کیوں؟“

فرشتے کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ جذبات سے عاری، بالکل ساکت، جاد۔ وہ ناپلک جھپکے خمل کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی ہی درودہ کچھ کہہ نہ سکی، پھر آہستہ سے لب کھولے۔

”کونکے میری پچھوکی بیٹی کا نام قائلہ ہے۔“

”جی؟“ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”میں نے کہا تھا ناکہ تم نہیں جانتیں۔ میری پچھوکی بیٹی کا نام فائقہ ہے۔ میں فرشتے ابراہیم ہوں، آغا ابراہیم کی بیٹی۔ جاؤ، اپنے گھر میں کسی سے پوچھو۔ مگر وہ کیوں بتائیں گے؟ وہ میری حیثیت تسلیم نہیں کرتے تو کیسے بتائیں گے؟“

وہ تھکے تھکے انداز میں کہہ کر اس کے ایک طرف سے نکل کر چل گئی۔ محمل ٹرکر اس کو جاتا بھی نہ دیکھ سکی۔ اسے تو جیسے کسی نے ادھر ہی برف کا بنا دیا تھا۔ وہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بیخ کا ریڈور میں بت بنی کھڑی تھی۔

”فرشتے ابراہیم۔“

”آغا ابراہیم کی بیٹی۔“

اسے پوری مسجد میں ان چند الفاظ کی گونج پلٹ کر سنائی دے رہی تھی۔



اسے نہیں معلوم وہ کن قدموں پہ چل کر مسجد کے گیٹ تک آئی تھی۔ بس وہ پتھر کا بت بنی خود کو گھسیتی ہر شے سے غافل چلتی جا رہی تھی۔ اس کا بیگ اور کتابیں کلاس میں رہ گئے تھے۔ اس نے انہیں ساتھ نہیں لیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا بہت کچھ مسجد میں کھو گیا ہے، وہ کیا کیا سمجھتی؟

برابر والے بیگلے کی دیوار کے ساتھ نصب بیخ پہ وہ گرسی گئی۔

”آغا ابراہیم کی بیٹی..... فرشتے ابراہیم۔“

اس کا دماغ انہی دو جملوں پہ مخدود ہو گیا تھا۔ آگے بڑھتا تھا، نہ چھپے ہتا تھا۔

ڈور کہیں یاد کے پردے پہ آغا جان کی آواز لہرائی۔

”اس لڑکی سے کچھ بعید نہیں۔ آج پھر میرے آپس آگئی تھی۔“

”پھر آگئی تھی۔“ اس کا ذہن جیسے چوک کر بیدار ہونے لگا تھا۔ پھر کا مطلب تھا، وہ پہلے بھی ادھر جاتی رہتی تھی۔ وہ سب اس کو جانتے تھے۔ اور شاید اس سے خائف بھی تھے۔ تو کیا وہ واقعی آغا ابراہیم کی بیٹی تھی؟

”نہیں....!“ اس نے تنفس سے سر جھٹکا۔ آغا ابراہیم کی صرف ایک بیٹی ہے، اور وہ

ہے محمل ابراہیم۔ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ میں نہیں مانتی۔
وہ زور زور سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، آج اس کے دماغ کی رگ
پھٹ جائے گی۔ غصہ تھا کہ اندر ہی اندر ابلا جا رہا تھا۔

کیا واقعی وہ ابا کی بیٹی ہے؟..... مگر اس کی ماں کون ہے؟..... میری ماں؟.....
نہیں۔ مگر مجھے کون بتائے گا؟ آغا جان اور تائی تو کبھی نہیں..... اماں کو شاید پتہ بھی نہ
ہو۔ پھر کس سے پوچھوں؟

وہ چکرا کر رہ گئی اور سر دنوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے جیسے جھٹکے سے سر
اٹھایا۔

”ہمایوں!“ اور پھر اس نے کچھ نہیں سوچا اور گیٹ کی طرف پکی۔



”صاحب اندر ہیں؟..... مجھے اندر جانا ہے۔“

”مجی، آپ چلی جاؤ۔“ چوکیدار فوراً سامنے سے ہٹا۔ وہ اندر کی طرف دوڑی۔ شاہانہ طرز کا لاڈنخ خالی تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھی، پھر کچن کے کھلے دروازے کو دیکھ کر رکی۔ کچھ سوچ کر وہ کچن میں آئی۔

ماربل فکور کا چمکتا صاف سترہ اکچن خالی پڑا تھا۔ چھوٹوں کا اشینڈ سامنے ہی تھا۔ اس نے لپک کر ایک بڑی چھری نکالی اور آستین میں چھپا کر باہر آئی۔

”ہمایوں....!“ لاڈنخ میں کھڑے، گردان اوپر کر کے اس نے پکارا۔ آواز گونخ کر لوٹ آئی۔ اس کا کرہ اوپر تھا، یہ تو اسے یاد تھا۔ وہ تیز تیز سیرھیاں چڑھنے لگی۔ سیاہ ماربل کی چمکتی سیرھیاں گولائی میں اوپر جا رہی تھیں۔ وہ بالائی منزل پر رکی، ادھر ادھر جھانکا، پھر تیری منزل کی سیرھیوں کی طرف جانے لگی۔ دفعتہ سامنے والے کمرے سے اس کی آواز آئی۔

”بلقیس....!“ وہ اندر سے غالباً ملازمہ کو آواز دے رہا تھا۔
وہ دوڑ کر اس کمرے کے دروازے پر ٹک آئی۔

”دروازہ کھولیں!“ اس نے دروازہ زور سے بجايا اور پھر دھڑ ادھڑ بجا تی چلی گئی۔
”کون....?“ ہمایوں نے حیران سا ہو کر دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا تھا۔

”تم؟..... خیریت؟“

”مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے، ٹھیک ٹھیک بتائیے گا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“

وہ اتنے جارحانہ انداز میں غرائی تھی کہ وہ پریشان ہی ہو گیا۔

”کیا ہوا ہے محمل؟“

”میری بات کا جواب دیں۔“

”اچھا اندر آ جاؤ۔“ وہ اسے راستہ دیتے ہوئے پیچے ہوا۔ بلیک ٹراؤزر پر گرے آدھے بازوؤں والی شرت پہنے، ہاتھ میں تو یہ کپڑے وہ غالباً ابھی نہا کر لکھا تھا۔ ماتھے پر بھرے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

وہ دو قدم اندر آئی، یوں کہ اب دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

”آپ فرشتے کے کزن ہیں؟“

”ہاں، کیوں؟“

”فرشتے کس کی بیٹی ہے؟ اس کا باپ کون ہے؟“

”باپ؟“ وہ ذرا سا چونکا۔ ”اس نے تم سے کچھ کہا ہے؟“

”میں نے پوچھا ہے، فرشتے کس کی بیٹی ہے؟“ وہ دلبی دلبی سے غرائی تھی۔

”ادھر بیٹھو، آرام مے بات کرتے ہیں۔“ وہ اس کو راستہ دیتا اس کے بائیں طرف سے قریب آیا۔

”میں بیٹھنے نہیں آئی، مجھے جواب چاہئے۔“

”ادھر بیٹھو تو سکی، شہنشاہے دماغ سے میری بات سنو۔“ وہ بچوں کی طرح اسے بہلاتے ہوئے آگے بڑھا اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

”ہاتھ مت لگائیں مجھے۔“ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

”محمل! ادھر آؤ۔“ وہ دو قدم آگے اس کے قریب آیا ہی تھا کہ محمل نے اچانک آستین میں چپی چپری نکال لی۔

”مجھے آپ پڑرا بھروسہ نہیں ہے۔ ذور رہیں۔“ وہ چپری کی نوک اس کی طرف کئے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”چپری کیوں لائی ہو؟..... مجھے مارنے؟“ اس کے ماتھے پہ مل پڑے، اور آنکھوں میں غصے کی لہر ابھری۔ وہ تیزی سے بڑھا اور محمل کا چپری والا ہاتھ کلائی سے کڑ

کر مردڑا۔

”چھوڑیں مجھے۔ ورنہ میں آپ کو مار دوں گی۔“ وہ اس کی مضبوط گرفت کے باوجود کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے کندھے کو پیچے دھکیلنا چاہا۔ ہمایوں اس کے چھری والے ہاتھ کا رخ دوسری طرف موڑ رہا تھا، اور پھر اسے پتہ بھی نہیں چلا اور چھری کی تیز دعاڑ گوشت میں گھستی چلی گئی۔

محمل کو لگا، وہ مرنے والی ہے۔ اس نے خون ابلجتے ہوئے دیکھا اور پھر اپنی صحیحی۔ مگر نہیں، اسے چھری نہیں لگی تھی۔ پھر....؟

وہ کراہ کر پیچھے ہٹا تو محمل کی کلائی آزاد ہو گئی۔ ہمایوں کے دامیں پہلو میں سے خون اُمل رہا تھا۔ وہ چھری پہ ہاتھ رکھ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

”اوہ میرے اللہ! یہ میں نے کیا کر دیا؟“ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ چھری پر رکھا ہمایوں کا ہاتھ خون سے سرخ پڑنے لگا تھا۔ وہ درد کی شدت سے آنکھیں بند کئے دیوار کے ساتھ بیٹھتا چلا گیا۔

وہ دہشت زده سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پورا جسم کا یعنیہ لگا تھا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اس نے کیا ہے۔ خدا یا! یہ اس نے کیا کر دیا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھتی قدم قدم ہٹنے لگی، اور پھر ایک دم مڑی اور تیزی سے پیڑھیاں پھلاکتی گئی۔ پوری قوت سے لا دُنخ کا دروازہ کھول کر وہ پاہر بھاگی تھی۔ چوکیدار گیٹ پہ نہیں تھا۔ کہاں تھا؟ اسے پرواہ تھی۔ وہ تیز دوڑتی ہوئی مسجد میں داخل ہوئی تھی۔

”فرشتبے..... فرشتبے کو ہر ہیں؟“ پھولی سانسوں کے درمیان پوچھتی وہ ذرا دیر کو رسیپشن پر رکی تھی۔

”فرشتبے بامی لا بھری ہیں ہوں گی، یا.....“

اس نے پوری بات نہیں سنی اور راہداری میں دوڑتی گئی۔

لا بھری کے اسی کونے میں کری ڈالے وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ بد حواس سی بھاگتی ہوئی اس کے سامنے چارکی۔

آہٹ پر فرشتے نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے، اسے دیکھ کر اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

”میں جانتی ہوں، تم ہرث ہوئی ہو۔“ ایک گہری سانس لے کر وہ اپنی روشن کرنے لگی تھی۔ ”اور میں اسی ڈر سے تمہیں یہ پہلے نہیں بتا۔۔۔“ کہتے کہتے فرشتے نے نگاہیں اٹھائیں۔ اور پھر انگلے الفاظ میں اس کے لبوب پر دم توڑ گئے۔

محمل کے چہرے پر ہوا یاں اُڑ رہی تھیں۔

”محمل! کیا ہوا؟“ وہ پریشان سی کھڑی ہوئی۔

”فرشتے..... فرشتے..... وہ ہمایوں وہ رو دینے کو تھی۔

”کیا ہوا ہمایوں کو؟ بتاؤ محمل!“ اس نے فکر مندی سے محمل کو دونوں شانوں سے تمام کر پوچھا۔

”وہ..... وہ ہمایوں ہمایوں مر گیا۔“

محمل کے شانوں پر اس کی گرفت ڈھیل پڑ گئی۔ اسے لگا، وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں نے جان..... جان بوجھ کر نہیں..... ہمایوں وہ اسے چھری لگ گئی۔

میں نے غلطی سے..... اسے میری.....“

”وہ کدم ہے ابھی؟“ فرشتے نے تیزی سے بات کاٹی۔

”کہنے کمر..... بیڈ روم میں.....“

فرشتے نے اگلا لفظ نہیں سنا اور تیزی سے باہر کی طرف بھاگ گئی تھی۔ وہ کہیں بھی جاتی، تو ہمیشہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ آج اس نے اس کا ہاتھ نہیں تھاماتھا۔ آج وہ اکیلی بھاگ گئی تھی۔

اسے خود بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس وہ بھی فرشتے کے پیچے پلکی تھی۔

”ہمایوں..... ہمایوں.....!“ وہ محمل کے آگے بھاگتی ہوئی ہمایوں کے لاڈنچ میں داخل ہوئی تھی اور اسے آوازیں دیتی بیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

”ہایوں!“

وہ آگے پیچھے گول سیرھیوں کے دہانے پر رکی تھی۔ ہایوں کمرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگاڑ میں پر بیٹھا تھا۔ خون آلو و چھری اس کے ایک طرف رکھی تھی۔
”ہایوں! تم نحیک ہو؟“ وہ پریشان سی گھنٹوں کے مل اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے جیسے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

”تم ادھر.....؟“ اپنے سامنے گھنٹوں کے مل بیٹھی فرشتے سے ہوتی ہوئی اس کی نظر اس کے پیچھے کھڑی محمل پر جا رکی۔

”مجھے محمل نے بتایا کہ.....؟“

”فرشتے! تم جاؤ اور اس بے وقوف لڑکی کو بھی لے جاؤ۔“

”مگر ہایوں!“

”میں نے اختر کو کال کر دیا ہے، پولیس چینچنے والی ہے۔ تم دونوں کی ادھر موجودگی نحیک نہیں ہے۔ جاؤ۔“ وہ درد کی شدت سے بہ وقت بول پارتا تھا۔

”مگر.....“ فرشتے نے تذبذب سے گردن موڑ کر محمل کو دیکھا جو سفید پرستا چہرہ لئے ادھر کھڑی تھی۔ اس کی سمجھے میں نہیں آ رہا تھا، وہ اس وقت کیا کرے۔

”میں نے کہانا۔ جاؤ!“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلا یا تھا۔

”اچھا۔“ وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

”نہیں..... میں نہیں جاؤں گی۔ بے شک مجھے پولیس پکڑ لے، مگر میں.....“

”محمل! جاؤ.....“ وہ زور سے چینا تھا۔

”چلو محمل!“ فرشتے نے جیسے فیصلہ کر کے اس کا ہاتھ پکڑا اور سیرھیاں اٹرنے لگی۔

”ہایوں! میں نے جان بوجھ کرنہیں کیا۔ آئی ایم سوری..... آئی ایم رسائلی.....“

فرشتے اس سے آگے اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی سیرھیاں اٹر رہی تھی، مگر وہ اسی طرح گردن موڑ کر ہایوں کو دیکھتی روپا نسی سی کہے جا رہی تھی۔

”جسٹ گوا“ وہ وہیں سے جھنجلا کر بولا تھا۔ اور اب سیرھیوں کے درمیان میں تھیں، وہاں سے اسے ہایوں کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اُبل

پڑے تھے۔ فرشتے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے باہر لے آئی تھی۔

”تم کیوں گئیں اس کے گھرِ محل؟ مجھے بتاؤ، ادھر کیا ہوا تھا؟“ مسجد کے گیٹ پر

فرشتے نے پوچھا تو اس نے اپنا ہاتھ زور سے چھڑایا اور رخ پھیر لیا۔

”محل! ناراضِ مت ہو۔ ابھی وہاں میری اور تمہاری موجودگی ٹھیک نہیں ہے۔“

”وہ ادھر مر رہا ہے اور آپ.....“ اس کی آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے۔

”وہ ابھی اسے ہسپتال لے جائیں گے۔ ذمہ بہت زیادہ نہیں تھا، وہ ٹھیک ہو جائے

گا۔ مگر تم نے کیوں مارا اسے؟“

”میں بھلا یوں ہمایوں کو مار سکتی ہوں؟ میں کر سکتی ہوں ایسا؟“ وہ ایک دم بخوبث بخوبث کرو نے لگی تھی۔ فرشتے بری طرح سے چونگی تھی۔ محل کے چہرے پر چھایا حزن، ملاں اور وہ آنسو... وہ عام آنسو تو نہ تھے۔ ”میں نے جان بوجھ کرنے میں کیا ایسا۔ آئی سوئیر۔“

”اچھا اندر آؤ، آرام سے بات کرتے ہیں۔“ اس نے خود کو سنبھال کر کہتا چاہا مگر وہ کچھ سنبھل کو تیار ہی نہ تھی۔

”انہوں نے بھی یہی کہا تھا، میرا قصور نہیں تھا۔“ وہ اسی طرح گیٹ پر کھڑی روئے چلی جا رہی تھی۔ ”وہ ٹھیک تو ہو جائیں گے فرشتے؟“

”ہوں۔“ فرشتے نے شاید اس کی بات نہیں سنی تھی، بس گمِ صہم سی اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی عام آنسو نہ تھے۔

”میں گھر جا رہی ہوں، پلیز! آپ مجھے ہمایوں کے بارے میں بتائی رہیے گا۔“

”اچھا۔“ اس نے غائبِ دماغی سے سر ہلا دیا۔

محل اب درختوں کی باڑ کے ساتھ دوڑتی ہوئی ڈور جا رہی تھی۔ وہ جیسے ٹھہرائی، گیٹ سے گئی، یک شک اسے دیکھئے گئی۔

ہاں، وہ آنسو بہت خاص تھے۔



ہسپتال کا نائلز سے چمکتا کاریڈور خاموش پڑا تھا۔ کاریڈور کے اختتام پر وہ فتح پر

جھکائے بیٹھی تھی۔ محمل جو دوڑتی ہوئی ادھر آ رہی تھی، اسے بیٹھے دیکھ کر لمحہ بھر کو بھی، رکی، پھر بھاگتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

”فرشتے!..... فرشتے!“

فرشتے نے ہاتھوں میں گراسرا انھایا۔

”وہ کیسا ہے؟“ محمل اس کے سامنے بیجوں کے مل بیٹھی اور دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے۔

”باتیں نا، وہ کیسا ہے؟“ وہ بے قراری سے اس کی شہری آنکھوں میں دیکھتی، جواب تلاش کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ زخم زیادہ گرا نہیں ہے۔“ وہ بھی محمل کی بھوری آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”میں اس سے مل سکتی ہوں؟“

”ابھی وہ ہوش میں نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ وہ تڑپ کر بولی تھی۔ وہ فخر کا وقت تھا، اور جیسے ہی فرشتے نے اسے اطلاع دی تھی، وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

”ڈاکٹر نے خودا سے سُلا رکھا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا محمل! تم پریشان نہ ہو۔“

”میں کیسے پریشان نہ ہوں؟ میں نے ان کو چھری ماری ہے..... میں.....“

”ایسا کیا ہوا تھا محمل؟ تم نے کیوں کیا ایسے؟“

”میں نے جان بوجھ کرنہیں کیا۔ میں ان سے پوچھنے کی تھی کہ.....“ وہ لب کچلتی، ڈبڈبائی آنکھوں سے کہتی چلی گئی۔ فرشتے اسی تھکے تھکے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم مجھ سے پوچھ لیتیں محمل! اس کو..... خیر چھوڑو، کوئی بات نہیں۔“

چند لمحے یونہی سرک گئے۔ وہ اسی طرح فرشتے کے سامنے فرش پر دوزا نو بیٹھی تھی۔

اس کے ہاتھ ابھی تک فرشتے کے گھٹنوں پر تھے۔ بہت در بعد اس نے خاموشی کو چر دیا۔

”آپ نے کہا، آپ آغا ابراہیم کی بیٹی ہیں؟“

”ہاں۔ میں آغا ابراہیم کی بیٹی ہوں۔“

”میرے ابا کی.....؟“ اس کا گلزار نہ گیا۔

”تمہیں یہ انہوں کیوں لگتی ہے؟ سوائے تمہارے، تمہارے سب بڑوں کو علم ہے۔

تمہاری امی کو بھی۔“

”امی کو بھی.....؟“ اسے جھٹکا لگا تھا۔

”ہاں..... ابا مجھ سے ملتے تھے۔ میری امی ان کی فرست والف تھیں۔ ڈائیورس کے بعد امی اور ابا الگ ہو گئے تھے، پھر انہوں نے تمہاری امی سے شادی کی۔ دونوں ان کی پسند کی شادیاں تھیں، ہے نا عجیب بات؟ خیر، مجھ سے وہ ہر دیکھ اینڈ پ ملنے آتے تھے، میں اپنے چھاؤں سے متعارف تو نہ تھی، مگر وہ سب جانتے تھے کہ میں کون ہوں، کہ ہر رہتی ہوں۔ مگر ابا کی ڈیتھ کے بعد انہوں نے مجھے تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ میں بہت دفعہ اپنا حق مانگنے کی، مگر وہ نہیں دیتے۔ ابا کی پہلی شادی خفیہ تھی، سوائے ہمارے بڑوں کے، خاندان میں کسی کو علم نہ تھا۔ تم سے بھی چھپا کر رکھا گیا کہ کہیں تم میرے ساتھ مل کر حصہ نہ مانگنے کھڑی ہو جاؤ۔“

”آپ نے کیس کیوں نہیں کیا ان پر؟“ بہت دیر بعد وہ بول پائی تھی۔

”مجھے جائیداد سے حق نہیں، رشتہوں سے حق چاہئے محمل! میں بہت دفعہ تمہارے گھر پہنچی ہوں، مگر اندر واخٹھ..... خیر، یہ لمبی کہانی ہے۔ میں کافی برسوں سے اپنے حق کی جنگ لڑ رہی ہوں۔ دارث اللہ نے بنائے ہیں، میں ابا کی دارث ہوں۔ یہ ہی سوچ کر اب میں جائیداد میں سے حصہ مانگتی ہوں، مگر.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔

”آپ کو پتہ تھا، میں آپ کے بارے میں نہیں جانتی؟“

”ہاں، مجھ پتہ تھا۔ میں نے جب بھی تم سے ملنے کی کوشش کی، کریم نایا نے یہ ہی کہہ کر روک دیا کہ محمل ذہنی طور پر ڈشرب ہو جائے گی، اور ابا سے نفرت کرے گی۔ پھر میں نے مبرکر لیا۔ میں جانتی تھی جورب، بن یامین کو یوسف علیہ السلام کے پاس لاسکتا ہے، وہ محمل کو بھی میرے پاس لے آئے گا۔“ وہ ہلکا سما سکرائی تھی۔ محمل کو لگا، اس کی سنہری آنکھیں بھیکنے لگی تھیں۔

”فواد بھائی، ان کا کیس۔“

”ہمایوں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے کزن فواد نے اس کے ساتھ کسی لڑکی محل کا معاملہ طے کیا ہے۔ کم عمر ہے اور خوب صورت بھی۔ میرا دل تب ہی سے کھٹک گیا تھا۔ مگر ہمایوں ماننے کو تیار ہی نہ تھا کہ فواد تمہارے ساتھ یہ کر سکتا ہے۔ اسے گان تھا، وہ کوئی اور لڑکی ہو گی مگر جس لمحے میں نے مسجد کی چھت پر تمہیں دیکھا، میں تمہیں پہچان گئی تھی۔“

”آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا، پھر.....؟“

”دیکھا تھا۔ ایک دفعہ تمہارے اسکول آئی تھی تم سے ملنے۔ نج پر بیٹھی تمہیں دیکھتی ہی رہی، تم ابھی ابھی، چڑپتی سی لگ رہی تھیں۔ پھر مجھ سے تمہیں مزید ڈھنی اذیت نہیں دی گئی، سو واپس پلٹ گئی۔“

فرشتے تھک کر چپ ہو گئی۔ شاید اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ وہ یا سیتے سے دیکھے گئی، جو بہت تھکی تھکی نظر آ رہی تھی۔ بہت دیر بعد اس نے پھر لب کھولے۔

”تم خوش قسمت ہو محل! کہ تم رشتتوں کے درمیان رہی ہو۔ تم یقیناً نہیں رہی ہو۔ تمہیں والی زندگی تو میں نے گزاری ہے۔ اس کے باوجود میں نے کبھی تمی کا لیبل خود پر نہیں لگایا۔ میری خالہ اور ہمایوں۔ یہ ہی تھے میرے رشتے۔ اور اب میرے پاس کھونے کو مزید رشتے نہیں پچے۔ ایک چیز مانگوں تم سے؟ کبھی مجھے اس آزمائش میں مت ڈالنا، میں مزید رشتے کھونا.....؟“

”اے ایس پلی صاحب کے ساتھ آپ ہیں؟“ آواز پر ان دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے یونیفارم میں ملبوس نر کھڑی تھی۔

”مجی۔“ محل اس کے گھشوں سے ہاتھ ہٹاتی بے چینی سے اٹھی۔

”ان کو ہوش آگیا ہے، اب خطرے سے باہر ہیں۔ آپ ان کی.....؟“

”میں..... میں ان کی فریبند ہوں۔“ اس نے جلدی سے فرشتے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ ”اور یہ ہمایوں صاحب کی بہن ہیں۔“

”بہن؟“ اس نے چونک کر محل کو دیکھا، مگر وہ نر کی طرف متوجہ تھی۔ ”بہن؟“ وہ ہو لے سے زیر لب بڑھا۔ پھر ہلاکا سانچی میں سر ہلاایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر محل نر

کے پیچے جا رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ سنا۔
وہ خالی ہاتھ پیشی رہ گئی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں شام اتر آئی تھی۔ محمل وہ شام نہ دیکھ سکی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر ہمایوں کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔
وہ بیٹھ پ آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ اوپر چادر پڑی تھی۔ آہٹ پے قدرے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ اسے دیکھ کر جیران رہ گیا۔
”محمل!“

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے سامنے جا رکی۔
بھورے سلکی بالوں کی اوپنجی پونی ٹیل بنائے، فیر دزی شلوار قمیض، ہم رنگ دوپٹہ
شانوں پے پھیلائے وہ بھیک آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”آئی ایم سوری، ہمایوں!“ آنسو آنکھوں سے پھسل پڑے تھے۔ وہ بہ وقت مکرا یا۔
”ادھر آؤ۔“

وہ چند قدم آگے بڑھی۔
”اتی غصے میں کیوں تھیں؟“
”مجھے معاف کر دیں پلیز!“ اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ہمایوں
نے بایاں ہاتھ اٹھایا اور اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔
”تم نے کیوں کہا، تمہیں مجھ سے کوئی امید نہیں؟“
”تو کیا رکھتی؟“ اس کے دونوں ہاتھ اور ہمایوں کا ہاتھ اوپر تلے ایک دوسرے میں
بندھ گئے تھے۔

”تمہیں لگتا ہے، میں نیچ راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے ہوں؟“
”کیا نہیں ہیں؟“ آنسو اسی طرح اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔
”کیوں اتنی بدگمان رہتی ہو مجھ سے؟“
”بدگمان تو نہیں۔ بس.....“
”پھر چھری کیوں لائی تھیں؟ تمہیں لگتا تھا، تم میرے گھر میں غیر محفوظ ہو گی؟“ وہ
نزی سے کہہ رہا تھا۔

”آپ مجھے معاف کر دیں، پلیز! آپ نے معاف کر دیا تو اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔“ کہہ کر وہ لمحے بھر کو خود بھی چونک گئی۔ آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے دل میں عجیب سا احساس ہوا تھا۔ ایک دم اس نے اپنے ہاتھ چھڑائے تھے۔ یہ سب صحیک نہیں تھا۔

”آپ آرام کریں، مجھے مسجد بھی جانا ہے۔“ وہ دروازے کی طرف لپکی تھی۔

”مت جاؤ۔“ وہ بے اختیار پکارا تھا تھا۔

”میں کھر سے مسجد کا کہہ کر نکلی تھی، اگر نہ گئی تو یہ خیانت ہو گی اور میں صراط پر خیانت کے کانٹے ہوں گے، مجھے وہ پل پار کرنا ہے۔“

”تحوڑی دیر ک جاؤ گی تو کیا ہو جائے گا؟“ وہ جھنجلا یا تھا۔

”یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے اور.....“

”صحیک ہے، صحیک ہے مادام! آپ جاسکتی ہیں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا تو اسے لگا، وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے۔

”سوری۔“ ایک لفظ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

فرشتے اسی نئی پیٹھی تھی۔ آہٹ پر اٹھایا۔

”میں چلتی ہوں فرشتے! مجھے مسجد جانا ہے۔“ تائوس انداز میں اس نے اپنا ہاتھ دوپٹے کے اندر کیا کہ کہیں وہ اس پر کسی کالس نہ دیکھ لے۔

”مل لیں ہمایوں سے؟“ اس کی آواز بہت پست تھی۔

”ہاں۔“ اس نے بے اختیار نگاہیں چڑائیں۔ فرشتے اسی طرح گردن اٹھائے اسے دیکھتی جانے اس کے چہرے پر کیا کھوج رہی تھی۔ وہ جیسے بے گمرا کر جانے کو پڑی۔

”محل! سنو۔“ وہ جیسے بے چینی سے پکارا ٹھی اور اس سے پہلے کہ وہ چلتی، اس نے نفی میں سر ہلاتے دیمرے سے کہا۔ ”نہیں، کچھ نہیں۔ جاؤ۔“

”خریت؟“

”جاو، تمہیں دیر ہو رہی ہے۔“

”اوے کے، السلام علیکم!“ وہ راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتی دور ہوتی گئی۔ فرشتے نے پھر سے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

اس کا دل بہت بوجمل سا ہو رہا تھا۔ مسجد آ کر بھی اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ اسے تھوڑی دیر ہو گئی تھی اور تفسیر کی کلاس وہ میں کر چکی تھی۔ سارا دن وہ یوں ہی مضمحل سی پھرتی رہی۔ بریک میں سارہ نے اسے جالیا۔ وہ برآمدے کے اشپیس پر بیٹھی تھی۔ گود میں کتابیں رکھے، چہرے پر بے زاری سجائے۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ سارہ دھپ کے ساتھ آ بیٹھی۔

”پست نہیں۔“ وہ جھنجراتے ہوئے گود میں رکھی کتاب کھولنے لگی۔

”پھر بھی، کوئی مسئلہ ہے؟“

”ہاں، ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“

”اللہ تعالیٰ..... بس.....“ وہ رجھک کر صفحے پلٹنے لگی۔

”بناوٹا۔“

”اللہ تعالیٰ ناراض ہیں۔ دیش اٹ!“ زور سے اس نے کتاب بند کی۔

”اوہ، تم خوانخواہ قتوطی ہو رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ کیوں ناراض ہوں گے بھلا؟“

”بس ہیں نا!“

”اتی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔ تمہیں کیسے پتہ کہ وہ ناراض ہیں؟“

”ایک بات بتاؤ!“ وہ جیسے کوفت زدہ سی اس کی طرف گھوی۔ ”اگر تم کسی کے ساتھ چونہیں گھٹتے ایک ہی گھر میں رہو، تو گھر میں داخل ہوتے ہی تمہیں اس شخص کا موڈ دیکھ کر پتہ نہیں چل جاتا کہ وہ ناراض ہے؟ بھلے وہ منہ سے کچھ نہ کہے، بھلے تمہیں اپنی غلطی بھی سمجھ میں نہ آ رہی ہو، مگر تم جان لیتی ہو نا کہ ماحول میں تناوٰ ہے۔ اور پھر تم دوسروں سے پوچھتی پھرتی ہو کہ ”اسے کیا ہوا ہے؟“ اور پھر تم اپنی غلطی سوچتی ہو۔ میں بھی اس وقت سمجھ کر رہی ہوں، سو مجھے کرنے دو!“

”مگر محمل؟“

”تمہیں پتہ ہے، اتنے عرصے سے میں روز ادھر آ کر قرآن سنتی تھی۔ آج میری تفسیر

کی کلاس سس ہوئی ہے۔ آج میں قرآن نہیں سن سکی۔ تمہیں پڑھے ہے کیوں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں، وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ سوا بھی پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

سارہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کتابیں سنجاہاتی اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی اندر آگئی۔

پریز ہال خالی تھا۔ بتیاں بھی تمیں۔ وہ کھڑکی کے ساتھ آئیں۔ کھڑکی کے شیشے سے روشنی چھپن کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے۔

”اللہ تعالیٰ! پلیز.....“ الفاظ بیوں پر ثوٹ گئے۔ آنسو شپ ٹپ گالوں پر گرنے لگے۔ اس نے دعا کے لئے اٹھے ہاتھوں کو دیکھا۔ یہ ہاتھ چند گھنٹے قبل ہمایوں کے ہاتھ میں تھے۔ لڑکے لڑکی کا ہاتھ پکڑنا تو اب عام سی بات بن گئی تھی، مگر قرآن کی طالبہ کے لئے وہ عام سی بات نہ تھی۔ وہ کیسے جذبات کے ریلے میں بہہ گئی کہ خیال ہی نہ آیا کہ اسے یوں تھا کسی کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ ہمایوں نے خود کو کیوں نہ روکا؟ مگر نہیں، وہ ہمایوں کو کیوں الزام دے؟ وہ تو قرآن کا طالب علم نہ تھا، طالبہ تو وہ تھی۔ سمعنا و اطعنا (ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی) کا وعدہ تو اس نے کر رکھا تھا۔ پھر؟

آنسوای طرح اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے آج کا سبق کھولنے لگی۔

”اللہ تعالیٰ! پلیز مجھے معاف کر دے۔ مجھے ہدایت پر قائم رکھئے۔

اس نے دل سے دعا مانگتے ہوئے مطلوبہ صفحہ کھولا۔

”کس طرح اللہ اس قوم کو ہدایت دے سکتا ہے، جو اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کریں؟“

اس کے آنسو پھر سے گرنے لگے۔ اس کا رب اس سے بہت ناراض تھا۔ اس کی معافی کافی نہ تھی۔ وہ سکیوں کے درمیان پھر سے استغفار کرنے لگی۔

”اور انہوں نے رسول کے برحق ہونے کی گواہی دی تھی، اور ان کے پاس روشن نشانیاں آئی تھیں، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

وہ جیسے جیسے پڑھتی جا رہی تھی، اس کا روای رواں کاپنے لگا تھا۔ قرآن وہ آئینہ تھا، جو بہت شفاف تھا۔ اس میں سب کچھ صاف نظر آتا تھا۔ اتنا صاف کہ کبھی کبھی دیکھنے والے کو خود سے نفرت ہونے لگتی تھی۔

”ان لوگوں کی جزا یہ ہے کہ بے شک ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور فرشتوں کی اور سب کے سب لوگوں کی (العنت ہے)، ہمیشہ رہنے والے ہیں اس میں۔ نہ ان سے عذاب پہلا کیا جائے گا، اور نہ ہی وہ مہلت دیجئے جائیں گے۔“
اس نے قرآن بند کر دیا۔ یہ خالی زبانی استغفار کافی نہ تھا۔

اس نے نوافل کی نیت باندھی، اور پھر کتنی ہی دیر وہ سجدے میں گر کر روتی رہی۔ جس کے ساتھ ہر پل رہو، جو رُگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہو، اس کی ناراضی محسوس ہو ہی جاتی ہے۔ اور انسان اس کی ناراضی دور کرنے کے لئے اتنا ہی کوشش کرتا ہے، جتنی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

جب دل کو کچھ سکون آیا تو اس نے اٹھ کر آنسو پوچھے، اور قرآن اٹھا کر نجیک اسی آیت سے کھولا، جہاں سے چھوڑا تھا۔ آیت روزِ اول کی طرح روشن تھی۔

”مگر اس کے بعد جن لوگوں نے توبہ کر لی.....“ (اس کا دل زور سے دھڑکا) ”اور انہوں نے اصلاح کر لی، تو بے شک اللہ تعالیٰ بخششے والا مہربان ہے۔“

بہت دیر سے روتے دل کو ذرا امید بندھی، ذرا قرار آیا۔

یہ توبہ کی قبولیت کی نوید تو نہ تھی، مگر امید ضرور تھی۔

اس نے آہستہ سے قرآن بند کیا۔ میڈم مصباح کہتی تھیں، اگر قرآن کی آیات میں آپ کے لئے ناراضی کا اظہار ہو، تو بھی بخشش کی امید رکھا کریں۔ کم از کم اللہ آپ سے بات تو کر رہا ہے۔

”وہ نجیک ہی کہتی تھیں۔“ مجمل نے اشتبہ ہوئے سوچا تھا۔



مہتاب تائی نے کرے کے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔
 ”محل سے کبو، شاپنگ کے لئے چلے۔ اس کے جو تے کاٹاپ لینا ہے۔ ورنہ بعد
 میں خود کہے گی کہ پورا نہیں آتا۔“
 وہ بیڈ پر کتابیں کھولے بیٹھی تھیں، جبکہ سرت الماری سے کچھ نکال رہی تھیں۔ تائی
 کی آواز پر دونوں نے بڑی طرح چوک کر انہیں دیکھا تھا جو اسے نظر انداز کئے سرت
 سے مخاطب تھیں۔

(تو دیسم والا قصہ ابھی تک باقی ہے؟) اس نے کوفت سے سوچا تھا۔ جچھلے کچھ دونوں
 میں پے درپے ہونے والے واقعات نے وقتی طور پر اسے وہ معاملہ بھلا دیا تھا۔ یہ بھی کہ
 حسن کی مخالفت ابھی برقرار رہی۔

”مگر تائی اماں! میں انکار کر جگی ہوں۔“

”لوک! میں تمہاری ماں سے پات کر رہی ہوں۔“

”مگر میں آپ سے پات کر رہی ہوں۔“ اس کا لچید زم مگر مغبوط تھا۔

”سرت! اس سے کھو تیار ہو جائے۔ میں گاڑی میں اس کا دیہٹ کر رہی ہوں۔“
 وہ کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئیں۔ اس نے بے بی سے ماں کو دیکھا۔ وہ اس سے
 بھی زیادہ بے بس نظر آ رہی تھیں۔

”اماں! آپ.....“

”ابھی چلی جاؤ محمل! ورنہ وہ ہنگامہ کر دیں گی۔“
”یہ بھتی کیوں نہیں ہیں؟“ وہ سوچ کی ہو کر کتاب میں رکھنے لگی۔

”شاید حسن پکھ کر سکے۔ مجھے حسن سے بہت امید ہے۔“

”اور مجھے اللہ سے ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر عبا یا پینٹنے لگی۔ پھر سیاہ حجاب چہرے کے گرد لپٹنا اور پن لگائی۔ خواخواہ ہنگامہ کرنے کا فائدہ نہ تھا۔ چلی عی جائے تو بہتر ہے۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔

لاڈنگ میں سڑھیوں کے پاس لگئے آئینے کے سامنے وہ رکی۔ ایک نظر اپنے عکس کو دیکھا، سیاہ حجاب میں سنہری چہرہ دمک رہا تھا۔ اوپری پونی ٹیل سے حجاب پیچھے سے انھ سا گیا تھا اور وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

وہ یونہی خود کو دیکھتی پڑی ہی تھی کہ آخری سڑھی اترتے حسن پر نظر پڑی۔

”کہہ جا رہی ہو؟“

”تالی اماں کے ساتھ، شادی کی شانگ پر۔“

”تم راضی ہو محمل؟“ وہ بھونچ کا سا اس کے قریب آیا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔

”اس کمر میں، مجھے اپنی رضا سے اس فیصلے کا اختیار نہیں ملا حسن بھائی!“
وہ کتنے ہی لمحے خاموش کمرا سے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے لب دا کئے۔

”ہم کوٹ میرج کر لیتے ہیں۔“

اور محمل کو لگا، اس نے تھپر دے مارا ہے۔

”آپ کو پڑتے ہے، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ بمشکل ضبط کر پائی تھی۔

”ہاں، میں تمہیں اس دلدل سے نکالنے کی بات کر رہا ہوں۔“

”آپ کوٹ میرج کی بات؟..... انا اللہ وَا اَنَا عَلِيٌّ رَاجِعُون۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ مجھ سے بات کریں گے۔“

”تمہیں اعتراض کیوں ہے محمل! یہ تمہاری شادی زبردستی وہم سے کر دیں گے اور تم۔“

”حسن بھائی! پلیز، آپ کو پتہ ہے، کوئٹہ میرج کیا ہوتی ہے؟ سرکاری شادی، کاغذوں کی شادی۔ میں ایسی شادی کو نہیں مانتی، جس میں لاکی کے ولی کی مرضی شامل نہ ہو۔

اور میں کیوں یوں چھپ کر شادی کروں گی؟ نہ آپ سے، نہ ویکم سے۔ میرا راستہ چھوڑ دیں۔“ وہ بے بس سامانے سے ہٹا تو وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی مہتاب تائی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ اندر بیٹھی اور دروازہ ذرا زدہ سے بند کیا۔

اسی پل ڈرائیور نگ سیٹ کا دروازہ کھول کر کوئی اندر بیٹھا۔ اس نے ڈرائیور سمجھ کر یونہی بیک دیو میں دیکھا تو جھٹکا سا لگا۔ وہ ویکم تھا۔ اپنے ازلی معنی خیز انداز میں مسکراتے، وہ گاڑی اشارہ کر چکا تھا۔ اسے لگا، اس سے غلطی ہو چکی ہے۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا؟ لب کچلتی وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

تائی مہتاب منگنی کی شاپنگ کر رہی تھیں یا شادی کی، وہ پچھہ نہ سمجھ سکی۔ بس چپ چاپ ان کے ساتھ میڑو میں چلی آئی۔ وہ جہاں بیٹھیں، ان کے ساتھ بیٹھنے لگی۔ ”سنا ہے، تم نے بڑا شورڈ الا تھا۔“ تائی اٹھ کر ایک شوکیس کے قریب گئیں تو وہ اس کے ساتھ صوفے میں دھنس کر بیٹھا۔ محمل بدک کر اٹھی۔

”ارے بیٹھو بیٹھو! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

شاپ کی تیز چیلی روشنیاں ویکم کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ گرباں کے کھلے بٹن، گردن سے لپٹی چین اور شوخ رنگ کی شرت۔ اف! اسے اس سے کراہت آتی تھی۔ ”کیا بات کرنی ہے؟“

”تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کس سے کرنا چاہتی ہو؟“ وہ استہزا سے مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر ایک چہرہ سا اُبھرا۔ ایک اندر ونی خواہش۔ ایک دہتی، دبائی محبت کی اوہوری داستان۔ اس نے بے اختیار سر جھٹکا۔

”نہ آپ سے، نہ کسی اور سے۔ آپ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“
 ”ایسے نہیں محمل ڈیز! ابھی تو ہم نے بہت وقت ساتھ گزارنا ہے۔“ وہ کھڑے ہو کر
 اس کے قریب آیا۔ وہ پھر دو قدم پیچھے ہٹی۔ دکان لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی محمل
 کو اس کے بے باک انداز سے خوف آتا تھا۔ نہ معلوم وہ کیا کر ڈالے۔

”اچھا ادھر آؤ، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ قدم اٹھاتا اس کے نزدیک آ رہا
 تھا۔ ”ادھر آئیں کریم پارلر میں بینچہ کربات کرتے ہیں۔“

”تائی.... تائی اماں۔“ بے بس سی وہ بھیڑ میں تائی مہتاب کی تلاش میں ادھر ادھر
 دیکھنے لگی۔

”تمہاری تائی کو ان کی کوئی فریڈمل گئی ہے۔ وہ ابھی نہیں آئیں گی۔“ تم ادھر قریب
 تو آؤ محمل ڈیز!“ ویسیم نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھامنا چاہی۔ اس کی انگلیاں اس
 کی کلائی سے ذرا سی مس ہوئیں۔ محمل کو جیسے کرنٹ سا لگا۔ ہاتھ میں کچڑا ہینڈ بیک اس
 نے پوری قوت سے ویسیم کے منہ پر دے مارا۔

”مگھیا آدمی! پیچھے ہو۔“ وہ چلا کی تھی۔

بیک اس کی ناک پر زور سے لگا تھا۔ وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا۔ شور کی آواز پر بہت سے
 لوگ ادھر متوجہ ہوئے۔ میلز بوائز کام چھوڑ کر ان کی طرف لپکے۔

”یو..... یونگ.....“ ویسیم تو غصے سے پاگل ہی ہو گیا ناک پر ہاتھ رکھے، وہ
 چار جانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک لڑکے نے اسے پیچھے سے کچڑا لیا۔
 ”کیا تماشا ہے؟ کیوں پنجی کو ٹنک کر رہے ہو؟“

”میڈم! کیا ہوا ہے؟..... یہ بندہ ٹنک کر رہا تھا آپ کو؟“

بہت سی آوازیں آس پاس اُبھریں۔ کچھ لڑکوں نے ویسیم کو بازوؤں سے پکڑ رکھا
 تھا۔

”یہ مجھے ٹنک کر رہا تھا۔ اکیلی لڑکی جان کر۔“ اس نے بمشکل خود کو سنپھالا اور کہہ کر
 پیچھے ہٹ گئی۔ اسے معلوم تھا، اب کیا ہو گا۔ اور واقعی وہی ہوا، اگلے ہی لمحے وہ لڑکے ویسیم
 پر پڑے۔ وہ گالیاں بکتا خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ سب بہت زیادہ

تھے۔

”مارو اسے اور مارو شریف لڑکوں کو چھیڑتا ہے۔“ ایک عمر رسیدہ صاحب ہجوم کے پاس کھڑے غصے سے کہہ رہے تھے۔
 ”زور سے مارو اسے عبرت کی مثال بناؤ۔“
 ”اپنے گھر مان بہن نہیں ہے کیا؟“

اور وہ ماں جب تک دکان میں لگے ہجوم تک پہنچی، وہ وسیم کو مار مار کر ادھ موادر کر کچے تھے۔ تائی اس کی طرف لپکیں۔ تھوڑی ہی دور صوفے پر محمل پیٹھی تھی، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، مطمئن سی وسیم کو پشتے دیکھ رہی تھی۔

”محمل! یہ اسے کیوں مار رہے ہیں؟“

”کیونکہ اس کے باپ کے کہنے پر مجھے بھی ایسے ہی مارا گیا تھا۔“

”بکواس مت کرو۔“

”بڑی دلچسپ بکواس ہے یہ۔ آپ بھی انجوائے کریں نا۔“ وہ محفوظی، وسیم کو پشتے دیکھ رہی تھی۔ شاپ کا بوکھلا یا ہوا فیجر اور سیلز بوائز، مشتعل نوجوانوں کو چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”سر پلیز! دیکھیں۔“ سیلز بوائز کی منت کے باوجود وہ لڑکے ان کو دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کر رہے تھے۔ حواس پاختہ کی تائی مہتاب ان کی طرف دوڑیں۔

”میرے بیٹے کو چھوڑ د۔ پرے ہٹو مردو دو!“ وہ چلا چلا کر ان لڑکوں کو ہٹانے کی سعی کر رہی تھیں۔

صوفے پر پیٹھی محمل مسکراتے ہوئے چیپ کا پیکٹ کھول رہی تھی۔

اُب یہ مرتبے دم تک مجھے ساتھ نہیں لاییں گی۔ ساری صورت حال سے لطف انداز ہوتی وہ چیپ نکال کر کرنے لگی۔



اس نے دروازہ ہولے سے بجا یا۔ مدھم دشک نے خاموشی میں ارتعاش سا پیدا

کیا۔

”آ جاؤ محمل!“ اندر سے فرشتے کی تھکن زدہ مسکراتی آواز آئی۔ اس نے حیرت سے دروازہ کھولا۔

”السلام علیکم! اور آپ کو کیسے پتہ چلا کہ یہ میں ہوں؟“

”میں تمہاری چاپ پہچانتی ہوں۔“ وہ بیٹھ پہ بیٹھی تھی، گھسنوں پر لحاف پڑا تھا۔ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ بھورے سیاہ بال شانوں پر تھے اور چہرے پر ذرا سی تکان تھی۔ محمل اندر داخل ہوئی تو فرشتے نے کتاب سائیڈ نیبل پر ڈال دی اور ذرا سا کھسک کر جگہ بنائی۔ آؤ بیٹھو۔“

”ناکس روم۔ فرست نائم آئی ہوں آپ کے ہاں۔“ محمل ستائشی نہ ہیں اطراف میں ذاتی بیٹھ کی پائینتی کے قریب بیٹھی۔ وہ اسکول یونیفارم میں لمبوں تھی، جبکہ فرشتے بالکل مختلف، گھروالے حلیے میں تھی۔

”پھر کیسا لگا ہاں؟“

”بہت اچھا۔ اور آپ آج اسکول کیوں نہیں آئیں؟“

”یونہی۔ طبیعت ذرا مضطہل سی تھی۔“ وہ تکان سے مسکراتی۔ اس کا چہرہ محمل کو بہت زرد سالگا تھا۔ شاید وہ بیمار تھی۔

”اپنا خیال رکھا کریں۔“ پھر قدر سے توقف سے گویا ہوئی۔ ”آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر چل کر کیوں نہیں رہتیں؟ وہ آپ کا بھی گھر ہے، آپ کا حق ہے اس پر۔ آپ کو اس گھر سے اپنا حصہ مانگنا چاہئے۔“

”مجھے منی کے مکان کا کیا کرتا ہے؟ وہ تو میں ایک دن خود بھی بن جاؤں گی۔ مجھے تو رشتہوں میں سے حق چاہئے۔“

”تو ان پر زور دیں نا۔“

”کوئی اور بات کر دیں محمل!“

”اُف!“ وہ بخندی سانس لے کر رہ گئی۔ ”مجھے علم ہی نہ تھا کہ میری ایک بہن بھی ہے اور ساری عمر میں بہن کے لئے ترسی رہی۔“

”ہم لوگوں کے ساتھ کے لئے نہیں ترستے محمل! ہم لوگوں کے ساتھ کی ”پاہ“ کے

لئے تھے ہیں، اور اسی چاہ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ لوگ مل جاتے ہیں تو پھر یوں لگتا ہے کہ وہ تو سچھ نہ تھے، سب سچھ تو وہ چاہ تھی، جس کی ہم نے صد یوں پرستش کی تھی۔“

”آپ بیمار ہو کر کافی فلسفی ہو گئی ہیں، سو پلیز!..... اچھائیں، ایک بات بتاؤ؟“ وہ پُر جوش سی بتانے لگی۔ ”کل تائی اماں مجھے دسم کے ساتھ شانگ پلے گئیں، اور میں نے اسے شاپ میں لوگوں سے پڑایا۔“

”بری بات۔ قرآن کی طالبہ ایسی ہوتی ہے کیا؟“

”ارے اس نے میرے ساتھ بد تمیزی کی تھی، اور اسے سجن سکھانے کے لئے یہ ضروری تھا۔ مُونو، سیلف ڈینفس۔ ہمایوں کیا ہے؟“ ایک دم اس نے پوچھا اور خود بھی حیران رہ گئی۔

”اب بہتر ہے۔“

”اوہ، شکر الحمد للہ!“ وہ فرشتے خوش ہوئی تھی۔ چہرہ جیسے کھل اٹھا تھا۔ فرشتے بغور اس کے تاثرات جانچ رہی تھی۔

”تم اسے پسند کرتی ہو، راست؟“

اس کی نگاہیں بے اختیار جھک گئیں۔ رخسار گلابی پڑ گئے۔ اسے توقع نہ تھی کہ فرشتے اتنے آرام سے پوچھ لے گی۔

”بتابا۔“ فرشتے نیک چھوڑ کر سیدھی ہوئی اور غور سے اس کا جھکا چہرہ دیکھا۔

”پستہ نہیں۔“

”مجھے سچ بولنے والی محمل پسند ہے۔“

”ہاں، شاید۔“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے بیل بھر کو نگاہیں اٹھائیں۔ فرشتے ہنوز سنجیدہ تھی۔

”اور ہمایوں؟“

”ہمایوں؟“ اس کے لب مسکرا دیئے۔ ”وہ کہتا ہے، وہ نجع راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے نہیں ہے۔“ وہ سر جھکائے مسکراتی ہوئی بیڈ شیٹ پر انگلی پھیر رہی تھی۔ دوسرا طرف دیر تک خاموشی چھائی رہی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

فرشته بالکل خاموش تھی۔ اس کے دل کو یونہی شک سا ہوا۔ کہیں فرشتے تو ہمایوں سے....؟ آخر وہ دونوں ساتھ پلے بڑے تھے۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”یہی کہ جب میں ہمایوں کے لئے تمہارا رشتہ لینے جاؤں گی تو کریم پچا مجھے شوٹ تو نہیں کر دیں گے؟ آخر میں ہمایوں کی بہن ہوئی تا۔“

اور محمل کھلکھلا کر ہنس دی۔ سارے وہم، شک و بشے ہوا ہو گئے۔ فرشتے بھلا ایسی فیلنگر کیسے رکھ سکتی تھی؟ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔

”اچھا یہ دیکھو۔“ اس نے کتاب میں سے ایک لفافہ نکالا۔ ”ایک لمحہ انوی ٹیشن ہے۔ مجھے انوائٹ کیا ہے نیم آنٹی نے۔ وہ اماں کی ایک پرانی فریڈ ہیں، ان ہی کے لکب میں ہے اس سنڈے کو۔ تم چلو گی؟“

”مگر ادھر کیا ہو گا؟“

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔ صرف لمحہ ہے۔ آنٹی نے کہا، اگر میں آ جاؤں تو اچھا ہے۔ اماں کی کچھ پرانی فریڈز سے بھی لوں گی۔ تم چلو گی؟“

”شیورا!“ وہ پورے دل سے مگرائی اور پھر کچھ دری پیٹھ کر واپس چلی آئی۔



اتوار کی دوپہر وہ مقررہ وقت پہ مسجد کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ سیاہ عبایا میں لمبیں، سیاہ جواب چہرے کے گرد لپیٹیے وہ کھڑی بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی تھی۔ عبایا وہ اب بھی کبھی کبھی باہر پہنچتی تھی، ہاں نقاب نہیں کرتی تھی، صرف جواب کر لیتی۔

دفعہ اور پیڑھیوں پہ آہٹ ہوئی۔ محمل نے سراٹھا یا۔

فرشتے تیزی سے زینے اتر رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں چاپی پکڑے، دوسرے سے وہ پس میں کچھ کھنکال رہی تھی۔

”السلام علیکم، تم پہنچ گئیں۔ چلو!“ عجلت میں کہتے ہوئے اس نے پس بند کیا اور برآمدے کی پیڑھیاں اتر گئیں۔ محمل اس کے پیچے ہوئی۔

”ہمایوں گھر میں ہی ہو گا۔ مل نہ لیں؟“ وہ گیٹ کے باہر رک کر بولی تو محمل مسکرا

وی۔

”شیور!“

وہ لاونچ میں ہی تھا صوفے پہ بیٹھے، پاؤں میز پر رکھے، چند فائلز کا سرسری سے مطالعہ کر رہا تھا۔ انہیں آتے دیکھا تو فائلز رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”خوش آمدید؟“ فرشتے کے پیچے آتی محمل کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے قدرے کمزور لگ رہا تھا، مگر ہسپتال میں پڑے ہمایوں سے وہ خاصاً بہتر تھا۔

”میں ہمایوں کو اتنے سالوں میں بھی السلام علیکم کہنا نہیں سکتا سکی، محمل! اور کبھی تو مجھے لگتا ہے، میں اسے کچھ بھی نہ سکھا سکوں گی۔“ فرشتے نے تھکی ہوئی سانس لے کر محمل کو بتایا تھا۔

”اچھا بھی۔ السلام علیکم!“ وہ نہ دیا تھا۔ ”بیٹھو“
وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ مگر فرشتے کھڑی رہی۔

”نہیں ہمایوں! ہمارے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔“
”مگر تمہاری بہن تو بیٹھ گئی ہے۔“

فرشتے نے مڑ کر محمل کو دیکھا، جو آرام سے صوفے پہ بیٹھی تھی۔

”بہن! اٹھو۔ ہم بیٹھنے نہیں آئے۔“
محمل ایک دم گز بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

فرشتے، ہمایوں کی طرف بیٹھی۔

”اہم بس تمہارا حال پوچھنے آئے تھے۔ تم اب ٹھیک ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ مگر بیٹھو تو سکی۔“

”نہیں۔ ہمیں لنج پہ جانا ہے، نیم آنٹی کی طرف۔ اماں کی کچھ فریڈز سے بھی مل لیں گے۔“

”اور محمل؟“ اس نے سوالیہ ابر و اٹھائی۔

”محمل ظاہر ہے، میری بہن ہے تو میرے ساتھ ہی رہے گی نا۔“

وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ عبا یا میں لمبوں وہ دونوں دراز قد لڑکیاں اس کے سامنے

کھڑی تھیں، سیاہ جاپ چہرے کے گرد لپیٹے۔ دونوں کی ایک جیسی سنبری آنکھیں تھیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون زیادہ خوب صورت تھی۔ ہاں، فرشتے دو انج زیادہ بھی ضرور تھی۔ اس کے چہرے پر ذرا سبجدگی تھی، جبکہ محمل کے چہرے پر کم عمری کی معصومیت برقرار تھی۔ اور یہ وہ محمل تو نہ تھی جس سے وہ پہلی بار اسی لاوَنخ میں ملا تھا۔ سیاہ مقیش کی سازھی، چھوٹی آستینیوں سے جھلکتے گداز بازو اور اونچے جوڑے سے نکلتی گھنگریاں لشوں والی۔ اسے اس کا ایک ایک نقش یاد تھا۔ وہ کوئی اور محمل تھی۔ اور یہ عباً اور جاپ والی کوئی اور تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”یہی کہ تم نے محمل کو اپنے رنگ میں رنگ لایا ہے۔“

”یہ میرا رنگ نہیں ہے، یہ صبغت اللہ ہے، اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سارا رنگ ہو سکتا ہے؟ چلو محمل!..... اوسکے ہابوں! اپنا خیال رکھنا۔ السلام علیکم۔“ وہ محمل کا بازو تھاے مژی عی تھی کہ وہ پکارا تھا۔

”سنوفرشتے!“

”ہاں!“ وہ دونوں ساتھی ٹپٹیں۔

”تم بہت بولتی ہو۔ اور تم نے محمل کو ایک لفظ بھی بولنے نہیں دیا۔ تمہیں معلوم ہے؟“

”مجھے معلوم ہے۔ اور تم نے ساری عمر تو اسی کو سننا ہے، یہ کم ہے کہ میں نے تمہیں اس سے ملوا دیا ہے؟..... مگر نہیں، انسان بہت ناشکرا ہے۔ چلو محمل!“ وہ محمل کو بازو سے تھاے اسی طرح عجلت میں واپس لے گئی اور وہ حیرتوں میں کھرا کھڑا رہ گیا۔ پھر سر جھنک کر مسکرا دیا تھا۔

”یہ فرشتے کو کس نے بتایا؟“



اس گول میز کے گرد دونوں اپنی نشتوں پر بوری بیٹھی تھیں۔

باتی کرسیوں پر آئی ٹائپ چند خواتین جلوہ افروز تھیں۔ محمل بار بار کلائی پر بندگی گھڑی کو دیکھتی۔ وہ واقعی بہت بور ہو رہی تھی۔

فرشتے ہی تھی جوان پنے ساتھ بیٹھی نہیں آئی سے کوئی نہ کوئی بات کر لیتی، ورنہ وہ تو مسلسل جما ہی روکتی، بے زاری سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”اس ملک میں عورتوں کو وہ حقوق حاصل نہیں جو مردوں کو ہیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوز رضی کی طرف متوجہ ہو گئی، جو ناک چڑھائے اپنا انگوٹھیوں سے ہرین ہاتھ بلا کر کہہ رہی تھیں۔

”اور یہ اس صدی کی سب سے بے وقوفانہ بات ہے، اگر کوئی کہے کہ مرد عورت سے برتر ہے۔ میں تو نہیں مانتی ایسی کسی بات کو۔“

”بالکل!“ وہ سب غرور و تفاخر میں ڈوبی عورتیں ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ محمل کا پس میز پر رکھا تھا۔ اس نے اس کو واٹا کر گز میں رکھا، پھر اندر سے اپنا سفید کور والاقرآن نکالا جو وہ ہمیشہ ساتھ رکھتی تھیں۔

”یہ سب جہالت کی باتیں ہیں سوز رضی! جب تک اس ملک میں تعلیم عام نہیں ہو گی، لوگ عورت اور مرد کے برابر حقوق تعلیم نہ کر سکیں گے۔“

”اور نہیں تو کیا اسی قدامت پرستی کی وجہ سے ہم آج یہاں ہیں اور دنیا چاوند پر پہنچنے کی وجہ سے ہم آج یہاں ہیں۔“

گئی ہے۔“

اس نے سراٹھایا اور ذرا سا کھنکاری۔

”مجھے آپ لوگوں سے اتفاق نہیں ہے۔“

تمام خواتین چونک کرائے دیکھنے لگیں۔

”اور میرے پاس اس کے لئے دلیل بھی ہے۔ یہ دیکھیں۔“ اس نے گود میں رکھا
قرآن اوپر کیا۔ ”ادھر سورہ نساء میں۔“

”نہیں، پلیز!“

”آف، نہیں..... ناٹ آگین۔“

”oh, please don't open it“

ملی جلی نا گوار، مضطرب سی آوازوں پر وہ رک کر، ناجھی کے عالم میں انہیں دیکھنے
لگی۔

”جی؟“

”خدا کے لئے اس کو مت کھولیں۔“

وہ کہہ رہی تھیں اور وہ حق دق پیشی رہ گئی۔

یہ مسلمان عورتیں تھیں؟..... یہ واقعی مسلمان عورتیں تھیں؟..... ان کو آسمانی کتابوں
پر ایمان نہ تھا؟ یہ قرآن کو نہیں سننا چاہتی تھیں، اس اللہ کی بات نہیں سننا چاہتی تھیں، جس
نے ان کو مال اور حُسن دیا تھا؟..... وہ چاہتا تو ان کی سائیں روک دیتا، ان کے دل بند
کر دیتا۔ مگر اس نے ان کو ہرنفعت دے رکھی تھی، پھر بھی وہ اس کی بات نہیں سننا چاہتی
تھیں؟

”یہ تو قرآن کی آیت ہے، اللہ کا کلام ہے۔ آپ سینیں تو سکی، یہ تو...“ اس نے کہنا
چاہا۔

”پلیز، آپ ہماری ڈسکشن میں مخل نہ ہوں۔“

اور وہ خاموش ہو گئی۔ اتنی بہت دھرمی، شاید وہ بد نصیب عورتیں تھیں، جن کو اللہ اپنی
بات سنوانا پسند نہیں کرتا تھا اور ہر وہ شخص جو روز قرآن نہیں پڑھتا، وہ بد نصیب ہوتا ہے۔

الله اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔

پھر وہ ادھر نہیں بیٹھی، تیزی سے اُٹھی، قرآن بیک میں رکھا اور فرشتے سے ”میں گھر جا رہی ہوں“ کہہ کر بغیر کچھ سنبھالنے، وہاں سے چلی آئی۔ اس کا دل جیسے درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنسو اُٹھنے کو بے تاب تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیسے اس غم کو قابو کرے، کیسے..... کیسے مسلمان ہو کروہ یہ سب کہہ سکتی تھیں؟ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

دل بہت بھر آیا تو آنسو بہہ پڑے۔ وہ چہرہ پھیرے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سڑک کے ایک طرف درخت پیچھے کو بھاگ رہے تھے۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا، جسے وہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ تائی مہتاب کی بہو بننے پر یہ اعزاز تو اسے ملنا ہی تھا اور روک ٹوک بھی قدرے کم ہو گئی تھی۔ مگر ابھی وہ ان باتوں کو نہیں سوچ رہی تھی، اس کا دل تو ان عورتوں کے روؤیے پر ایک سا گیا تھا۔ اسے لگا۔

ایک دم گاڑی جھٹکے سے رکی۔ وہ چونک کر آگے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟“

”لبی! گاڑی گرم ہو گئی ہے۔ شاید ریڑی ایثر میں پانی کم ہے، میں دیکھنا بھول گیا تھا۔“ ڈرائیور پریشانی سے کہتا باہر نکلا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

سڑک قدرے سنان تھی۔ گوکہ و قلن و قلن سے گاڑیاں گزرتی دکھائی دیتی تھیں مگر اردو گرد آپادی کم تھی۔ وہ کوئی انڈا شریل ایریا تھا۔ بہت دور اونچی عمارتیں دکھائی دیتی تھیں۔ ڈرائیور بونٹ کھول کر چیک کرنے لگ گیا تو وہ سریٹ سے نکلے، آنکھیں موندے انتظار کرنے لگی۔

”لبی!“ تھوڑی دیر بعد اس کی کھڑکی کا شیشہ بجا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ باہر ڈرائیور کھڑا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے شیشہ نیچے کیا۔

”انجمن گرم ہو گیا ہے، میں کہیں سے پانی لے کر آتا ہوں۔ آپ اندر سے سارے دروازے لاک کر لیں، مجھے شاید تھوڑی دیر لگ جائے۔“

”ہوں..... ثمیک ہے، جاؤ۔“ اس نے شیشہ چڑھایا، سارے لاک بند کئے اور

چہرے پر جا ب کا ایک پو گرا کر آنکھیں پھر سے موند لیں۔ او ہیز عمر ڈرائیور چھ سات برس سے ان کے ہاں ملازمت کر رہا تھا، اور خاصا شریف نفس انسان تھا، سو وہ مطمئن تھی۔

وہ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی جس زدہ ہو گئی۔ گھشن اور جس اتنا شدید تھا کہ اس نے شیشہ کھول دیا۔ ڈرائیور اندر آئی، مگر گاڑی کے ساکن ہونے کے باعث ماحول پہلے سے زیادہ گرم ہو گیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں پینہ پینہ ہو گئی۔ بے اختیار سیٹ پر تہہ کر کے رکھا دوپٹہ اٹھایا اور اس سے ہوا جھلنے لگی۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ اسے لگا، وہ بھٹی میں جل رہی ہے۔

کافی دیر گزر گئی، مگر ڈرائیور کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ بے اختیار وہ سورہ طلاق کی تیسری آیت آخر سے پڑھنے لگی۔ ”جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لئے راستہ بنا ہی دیتا ہے۔“

ڈریڈھ گھنٹے سے اوپر ہونے کو آیا تھا، وہ گرمی سے ٹھھال، پینے میں شراب اور کتنی ہی دیر سے دعا کر رہی تھی۔ مگر جانے کیوں آج کوئی راستہ نہیں کھل رہا تھا۔ پھر جب سورج سر پہنچ گیا اور باہر سے آتی دھوپ و گرمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو اس نے گھبرا کر شیشے بند کر دیئے۔

اور پھر سے وہی ہوا۔ گھشن زدہ اور جس زدہ بند گاڑی جیسے بند ڈبہ ہو یا بند قبر..... یا سمندر کی تہہ میں تیرتی کسی پھل کا پیٹ.....!

”پھل کا پیٹ؟“ اس نے حیرت سے دہرا یا۔ ”یہ میرے دل میں کیسے خیال آیا کہ یہ پھل کا پیٹ ہے؟“ وہ ابھی۔ اور پھر سے اسے وہ کلب کی عورتیں یاد آئیں اور ان کا وہ گھمنڈی روئی۔ اس کے خیال کی رو بھکنے لگی۔ پتہ نہیں، وہ کیوں اس رب کی بات نہیں سننا چاہتی تھیں، جس کے ہاتھ میں ان کی سائیں ہیں۔ اگر وہ چاہے تو ان منکریں کی سائیں روک دے، مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔

”کیوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کی آواز بندیشوں سے ٹکر اکر پلٹ آئی۔ باہر فضا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دور سے جھلکتی اونچی عمارتیں، ان کے اوپر

آسمان، جہاں سے پرندے اڑتے ہوئے گزرتے تھے۔ یہ عمارتیں، یہ آسمان، زمین، یہ اڑتے پرندے، یہ زمین کو رو نہ تے ہوئے پڑتے متکبر لوگ، وہ سب زندہ تھے۔ ان کی سائنس اپنے ”انکار“ کے باوجود نہیں رکھتی تھیں۔ کیوں؟

”کیونکہ ان کی سائنس ان کو ملی مہلت کی علامت ہے محمل بی بی! کسی کے گناہ کتنے ہی شدید ہوں، اگر سائنس باقی ہے، تو امید ہے۔ شاید کہ وہ لوث آئیں۔ وہ رب تو ان نافرمانوں سے مایوس نہیں ہوا، پھر تم کیوں ہوئیں؟“ کوئی اس کے اندر بولا تھا۔
وہ جیسے سنائے میں آگئی۔

لکھنی جلدی وہ نہ ماننے والوں سے مایوس ہو گئی؟ ”ان“ پر کڑھنے لگی؟ پھر کیوں وہ کسی کی ہٹ دھرمی دیکھ کر یہ فرض کر بیٹھی کہ وہ کبھی بدل نہیں سکتیں۔ کیوں اس نے مایوس ہو کر بستی چھوڑ دی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ بے اختیار اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

”نہیں کوئی اللہ تیرے سوا، پاک ہے ٹو، بے شک میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔“
نہادت کے آنسواس کے گالوں پر لڑک رہے تھے۔ اسے بستی نہیں چھوڑنی چاہئے تھی۔ اگر کچھ لوگ قرآن نہیں سننا چاہتے تو کوئی تو ہو گا جو اسے سننا چاہے گا۔ خود وہ کیا تھی؟ قرآن کو اس روز چھت پر کھولتے ہی پدک اُٹھنے والی، آج کدھر تھی! صرف اس سیاہ قام لڑکی کی ذرا سی کوشش، ذرا سے تجسس کو بھڑکانے والے عمل سے وہ کسی نہ کسی طرح آج ادھر پہنچ گئی تھی کہ اللہ اس سے بات کرتا تھا، پھر اپنی پارسائی پر غرور اور دوسرے کی تحقیر کیسی؟

اس کے آنسو ابھی بہہ ہی رہے تھے کہ ذرا سیور سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پانی کی بوتلیں تھیں۔

”اور جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لئے راستہ نکال ہی دیتا ہے۔“

بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اسے لگا، اس کی توبہ شاید قبول ہو گئی تھی۔ کبھی اسے لگتا تھا، ایمان اور تقویٰ بھی سانپ سیر گی کے کھیل کی طرح ہوتا ہے، ایک تجھ

قدم کسی معراج پر پہنچا دیتا ہے تو دوسرا غلط قدم گھری کھائی میں۔ اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

گاڑی گھر کے سامنے رکی، اور ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ چوکیدار گیٹ کھول ہی رہا تھا، جب اس کی نگاہ ساتھ والے بنگلے پر پڑی۔

”تم جاؤ، میں آتی ہوں۔“ وہ سبک رفتاری سے باہر نکلی۔

بریگیڈر صاحب کا چوکیدار وہیں گیٹ پر کھڑا تھا۔ اس نے فوراً گیٹ کھنگالا۔

”سنو، یہ اپنے صاحب کو دے دینا۔“ اور چند پمپفلش نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ ”ان سے کہنا، یہ امانت ہے۔ چاہے تو پڑھ لیں، کوئی دباؤ نہیں، مگر میں واپس ضرور لینے آؤں گی۔ پکڑ لوٹا۔“ متذبذب کھڑے چوکیدار کو پمپفلش زبردست تھا اور واپس گھر کی جانب ہو لی۔

کوئی تو ہو گا، جو اسے سننا چاہے گا۔ آج نہیں، کل نہیں، مگر کبھی تو وہ ان پمپفلش کو کھولیں گے۔



کاریڈور میں لگا سافٹ بورڈ آج کچھ زیادہ ہی چمک رہا تھا یا شاید اس کیلی گرانی کے کناروں پر لگی افشاں کی چمک تھی، جو سافٹ بورڈ کے وسط میں آویزاں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دیوار کے قریب آئی۔ کیلی گرانی بہت خوب صورت تھی۔ اس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات کے موقع پر کہے گئے الفاظ اور رقم تھے۔ وہ گردان اٹھائے ان الفاظ کو پڑھنے لگی۔

”عبد الرحمن بن عوف نے کہا۔“ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بھی روئے ہیں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”اے ابن عوف! یہ رحمت اور شفقت ہے۔“ اور آپ پھر سے روپڑے اور فرمایا۔

”بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے، اور دل غمگین ہے۔ لیکن ہم زبان سے وہی بات نکالیں گے، جس پر ہمارا رب راضی ہو۔ اے ابراہیم! بے شک ہم تیری جدائی پر بہت غم زدہ ہیں۔“

وہ مسحوری اسی طرح گردن او نجی اٹھائے کھڑی وہ الفاظ بار بار پڑھتی گئی۔ کچھ تھا ان میں جو اسے بار بار کھینچتا تھا۔ وہ وہاں سے جا ہی نہ پا رہی تھی، جانے کے لئے قدم اٹھاتی مگر وہ الفاظ اسے روک دیتے اور وہ واقعی پھر سے روک جاتی۔

جب تفسیر کی کلاس کا وقت ہونے لگا تو وہ بمشکل خود کو وہاں سے بچنے لای۔ قرآن کھولتے ہوئے نظر درمیان کے کسی صفحے پر پڑ گئی۔

”ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔“

وہ صفحے پیچھے پلنٹے لگی۔ انگلی سے ورق پلتتے ہوئے ایک اور جگہ یونہی نگاہ پھسلی۔

”آج تم ایک موت نہ مانگو، بلکہ آج تم کئی موشیں مانگو۔“

وہ سر جھٹک کر اپنے سبق پر آئی۔

آج کی پہلی آیت ہی یہ تھی۔

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی ایک پر موت حاضر ہو جائے۔“

”اوہ، مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ وہ بے بسی سے سکرا کر رہ گئی۔ آج تو ساری موت کی آیتیں پڑھ رہی ہوں۔ کہیں میں مرنے تو نہیں والی؟..... اُف، محمل! فضول مت سوچو

اور سبق پر توجہ دو۔“

وہ سر جھٹک کر نوش لینے لگی۔ موت کی وصیت کے متعلق آیات پڑھی جا رہی تھیں۔

اسے یاد آیا، انہی اس نے ایک حدیث بھی کچھ ایسی ہی پڑھی تھی۔

اچانک لکھتے لکھتے اس کا قلم پھسل گیا۔ وہ روک گئی اور پھر آہستہ سے سراخھایا۔

”کیا کوئی مرنے والا ہے؟“ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ وہ جو قرآن میں پڑھتی تھی، وہ اس کے ساتھ پیش آ جاتا تھا، یا آنے والا ہوتا تھا۔ کبھی ماضی، کبھی حال اور کبھی مستقبل۔ کوئی لفظ بے مقصد، بے وجہ اس کی آنکھوں سے نہیں گزرتا تھا۔ پھر آج وہ کیوں بار بار ایک ہی طرح کی آیات پڑھ رہی تھی۔ کیا کوئی مرنے والا ہے؟ کیا کوئی اسے چھوڑ گر جانے والا ہے؟ کیا اسے قرآن ذہنی طور پر تیار کر رہا ہے، اسے مبرکرنے کو کہہ رہا ہے؟..... مگر کیوں؟..... کیا ہونے والا ہے؟

وہ بے چینی سے قرآن کے صفحے آگے پلنٹے لگی۔

”اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

ایک سطر پڑھ کر اس نے ڈھیر سارے درق اٹکے۔

”صبر کرنے والے اپنا صد.....“

پورا پڑھے بغیر اس نے آخر سے قرآن کھولا۔

”اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہو۔“

اور پھر وہ صفحے تیز تیز پیشی ایک نظر سے سب گزارتی جا رہی تھی۔

”اور کوئی نہیں جانتا، وہ کون سی زمین پر مرجے گا۔“

محمل کا دم گھٹنے لگا۔ بے اختیار گھبرا کر اس نے قرآن بند کیا۔ اسے پینہ آ رہا تھا۔

دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ ہونے والا تھا۔ کیا وہ برداشت کر پائے گی؟ شاید نہیں، اس میں اتنا صبر نہیں ہے۔ وہ کچھ نہ برداشت کر پائے گی۔ کبھی بھی نہیں۔ اس نے وحشت سے ادھر ادھر دیکھا۔

میڈم مصباح کا پیچھر جاری تھا۔ لڑکیاں سر جھکائے نوٹس لے رہی تھیں۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس نے ذرا سی گروں اور پر کو اٹھائی۔ اور پچھت تھی۔ پچھت کے پار آسمان تھا۔ وہاں کوئی اس کی طرف ضرور متوجہ نہ تھا۔ مگر وحشت اتنی تھی کہ وہ دعا بھی نہ مانگ سکی۔ تب ہی آیا اماں اسے دروازے میں نظر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چٹ تھی۔ وہ میڈم مصباح کے پاس گئیں اور چٹ ان کی طرف بڑھا۔ میڈم نے پیچھر روک دیا اور چٹ تھامی۔

خُل دُنا پُلک جھپکے ان تو دیکھ رہی تھی۔

میڈم مصباح نے چٹ پڑھ کر سر اٹھایا، ایک نگاہ پوری کلاس پر ڈالی، پھر چہرہ مائیک کے قریب کیا۔

”محمل ابراہیم! پلیز ادھر آ جائیں۔“

اور اسے لگا، وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔ وہ جان گئی تھی، کوئی مر نے والا نہیں تھا۔ اب کسی کو نہیں مرتا تھا۔ اس کا نام پکارا جا رہا تھا اور اس کی ایک ہی وجہ تھی۔

جسے مرتا تھا، وہ مر چکا تھا۔ کہیں توئی، اس کا پیارا، مر چکا تھا۔ قرآن فال نہیں نکالتا

تھا۔ صرف آنے والے حالات کے لئے تیار کرتا تھا۔ یقیناً اس کے آیات پڑھنے سے قبل ہی کوئی مر چکا تھا۔

وہ نیم جاں قدموں سے اٹھی اور میڈم کی طرف بڑھی۔

”آنکھ آنسو بہاتی ہے۔

دل غمگین ہے۔

مگر ہم زبان سے وہی کہیں گے، جس پر ہمارا رب راضی ہو۔

اے ابراہیم! بے شک ہم تیری جدائی پر بہت غم زده ہیں۔“

صدیوں پہلے کسی کے کہے گئے الفاظ کی بازگشت اسے سارے ہال میں سنائی دے رہی تھی۔ باقی ساری آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ اس کے کان بند ہو گئے تھے۔ زبان بند ہو گئی تھی۔

بس وہ ایک آواز اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

آنکھ آنسو بہاتی ہے۔

دل غمگین ہے۔

دل غمگین ہے۔

دل غمگین ہے۔

وہ بمشکل میڈم مصباح کے سامنے کھڑی ہوئی۔

”جی میڈم؟“

”آپ کا ڈرائیور آپ کو لینے آیا ہے، ایم جسی ہے۔ آپ کو گھر جانا.....“

مگر وہ پوری بات سننے بغیر ہی تیزیوں کی طرف بھاگی۔ ننگے پاؤں زینے پھلانگتی وہ تیزی سے اوپر آئی تھی۔ جو توں کاریک ایک طرف رکھا تھا، مگر محمل کو اس وقت جو توں کا ہوش نہ تھا۔ وہ سنگ مرمر کے فرش پر ننگے پاؤں دوڑتی جا رہی تھی۔

غفران بچا کی اکارڈ سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور دروازہ کھولے منتظر کھڑا تھا۔ اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔

”بی بی! آپ.....“

”پلیز خاموش رہو۔“ وہ بمشکل ضبط کرتی اندر بیٹھی۔ ”اور جلدی چلو۔“

اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا، گویا ابھی سینہ توڑ کر باہر آگئے گا۔

آغا ہاؤس کا میں گیٹ پورا کھلا تھا، باہر گاڑیوں کی قطار لگی تھی۔ ڈرائیورے پے لوگوں کا جم غیر اکٹھا تھا۔ گاڑی ابھی گیٹ کے باہر سڑک پے ہی تھی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر بھاگی۔ ننھے پاؤں تارکوں کی سڑک پے جلنے لگے، مگر اس وقت جلن کی پروا کے تھی۔

اس نے رش میں گھرے آغا جان کو دیکھا، غفران بچپا کو دیکھا، حسن کو دیکھا۔ وہ سب اس کی طرف بڑھے تھے۔ مگر وہ اندر کی طرف لپک رہی تھی۔ لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتی، وہ ان آوازوں تک پہنچنا چاہتی تھی، جو لان سے آ رہی تھیں۔ عورتوں کے میں، روئے، آہ و بکا کی آوازیں۔

لوگ ہٹ کر اس سفید یونیفارم اور گلابی اسکارف والی لڑکی کو راستہ دینے لگے تھے۔

وہ بھاگتی ہوئی لان تک آئی اور پھر گھاس کے دہانے پے بے اختیار رُک گئی۔

لان میں عورتوں کا ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ درمیان میں چار پائی رکھی تھی، اس پے کوئی سفید چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ چار پائی کے چاروں طرف عورتیں رو رہی تھیں۔ ان کے چہرے گذشتہ ہورہے تھے۔ ایک فضہ چھپی تھیں۔ اور ہاں، ناعمه چھپی بھی تھیں، اور وہ سینے پے دھڑک مار کر روئی رضیہ چھپھو تھیں، اور وہ اوپھی آواز میں بین کرتی مہتاب تائی تھیں۔ سب تو ادھر موجود تھے۔

پھر کون تھا اس چار پائی پے؟..... کون..... کون تھا وہ؟

اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، وہاں سارا خاندان اکٹھا تھا، بس ایک چہرہ نہ تھا۔

”ماں.....!“ اس کے لب پھر پھڑائے۔

اس نے انہیں پکارنے کے لئے لب کھولے، مگر آواز نے گویا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ وحشت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شاید اس کی ماں کسی کونے میں بیٹھی ہو، مگر وہ کہیں نہ تھی۔ اس کی ماں کہیں نہ تھی۔

”محمل..... محمل.....!“ وہ عورتیں اسے پکار رہی تھیں۔ اٹھ اٹھ کر اسے گلے سے لگا رہی تھیں۔ کسی نے راستہ بنادیا، تو کوئی میت کے پاس سے ہٹ گیا۔ کوئی اسے ہاتھ سے

پکڑ کر چارپائی کے قریب لے آیا، کسی نے شانوں پر زور دے کر اسے بٹھا دیا۔ کسی نے میت کے چہرے سے سفید چادر ہٹا دی۔ کون کیا کر رہا تھا، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ساری آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ ارد گرد کی عورتوں کے لب مل رہے تھے، مگر وہ سن نہ پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں، رو رہی ہیں یا ہنس رہی ہیں، وہ تو بس یک نک، ڈنک پلک جھپکے اس زرد چہرے کو دیکھ رہی تھی، جو چارپائی پر آنکھیں مومندے لیٹا تھا۔ انھوں میں روئی ڈالی گئی تھی اور چہرے کے گرد سفید پٹی تھی۔ وہ چہرہ واقعی اماں سے بہت ملتا تھا۔ بالکل جیسے اماں کا چہرہ ہو، اور شاید..... شاید وہ اماں کا چہرہ ہی تھا۔

اسے بس ایک پل لگا تھا یقین آنے میں، اور پھر اس نے چاہا کہ وہ بھی وحاظیں مار کر رونے لے گے، نوحہ کرے، میں کرے، زور زور سے چلانے، مگر وہ رحمت اللعالمین کے کہے گئے الفاظ.....

”مگر ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے جس پر ہمارا رب راضی ہو۔“

اور اس کے لب کھلے رہے گئے، آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ زبان بٹنے سے انکاری ہو گئی۔

اس کا شدت سے دل چاہا کہ اپنا سر پیٹے، سینے پر دھنھڑا مار کر میں کرے، دو پسہ پھاڑ ڈالے اور اتنا جیخ جیخ کر رونے کہ آسمان مل جائے۔ اور پھر اس نے ہاتھ اٹھائے بھی، مگر.....

”نوحہ کرنے والی اگر توبہ کے بغیر مر گئی تو اس کے لئے تارکوں کے کپڑے اور آگ کے شعلے کی قیضی ہو گی۔“

”جو گریبان چاک کرے اور رخساروں پر ٹلانچے مارے اور میں کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔“

یہ ہدایت تو ابد تک کے لئے تھی۔

اس کے ہاتھ اٹھنے سے انکاری ہو گئے۔ انھوں سے آنوبہہ رہے تھے، لیکن لب خاموش تھے۔

”اسے زلاوہ، اسے کہوا و نچاروں لے، ورنہ پاگل ہو جائے گی۔“

”اس سے کہو دل بیکار لے۔“

بہت سی عورتیں اس کے قریب زور زور سے کہہ رہی تھیں۔

”میری بیچی؟“ تائی مہتاب نے روئے ہوئے اسے گلے سے لگایا۔ وہ اسی طرح ساکت سی بیٹھی ماں کی میت کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو گر کر گدن پر لڑک رہے تھے۔ اس کا پورا چہرہ بھیگ گیا تھا، مگر زبان..... زبان نہیں ہلتی تھی۔

”سرت تو نجیک ٹھاک تھی، پھر کیسے.....؟“

”بس صحیح کہنے لگی سینے میں درد ہے۔ ہم فوراً ہسپتال لے کر گئے، مگر..... اوہوری اوہوری سی آوازیں اس کے ارد گرد سے آرہی تھیں، مگر اسے سنائی نہ دے رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھارہ رہا تھا۔ اسے لگا، اسے چکرا آرہے ہیں۔ عجیب سی گھشن تھی، اس کا سانس بند ہونے لگا تھا۔ وہ ایک دم اٹھی اور عورتوں کو ہٹاتی اندر بھاگ گئی۔



کسی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، پھر تیسرا دفعہ۔ اس نے گھنٹوں پر رکھا سر ہولے سے اٹھایا۔ دروازہ نج رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھی، بیٹھ سے اتری، سلیپر پاؤں میں ڈالے اور کنڈی کھوی۔ باہر فضہ چیزیں کھڑی تھیں۔

”محمل بیٹھا! تمہارے آغا جان تمہیں بلا رہے ہیں۔“

”آتی ہوں۔“ اس نے ہولے سے کہا تو فضہ چیزیں پلٹ گئیں۔ وہ کچھ دیر یوں ہی ادھر کھڑی رہی، پھر باہر آگئی۔

یئر ہیوں کے قریب گلے آئینے کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ بیل بھر کو رکی، اس کا عکس بھی رک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پر سفید ملک کا دوپٹہ سر پر لئے وہ کمزور، پژمردی محمل ہی تھی؟ ہاں، شاید وہ ہی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ کملایا ہوا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقتے تھے۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

آغا جان کے کمرے میں سب چیزاں موجود تھیں۔ ویسی بھی ایک طرف کھڑا

- ६

”آومحل!“ اسے آتے دیکھ کر آغا جان نے سامنے صوفی کی طرف اشارہ کیا۔
آج اماں کو گزرے چوتھا دن تھا اور گھر والوں کا روز یہ پہلے کی نسبت اب خاصا نرم تھا۔
وہ چپ چاپ صوفی پہ بیٹھ گئی۔

”اُس صبح جب سرت کی ڈیتھ ہوئی، اس نے درد شروع ہوتے ہی یہ کچھ چیزیں
وصیت کی تھیں تمہارے لئے۔ اسے لگ رہا تھا، وہ اب خریدنہیں جی پائے گی..... ہم
نے سوچا کہ تمہیں دے دی جائیں۔“ انہوں نے ایک طرف رکھا ڈبہ اٹھایا۔ محمل نے سر
اٹھا کر ڈبے کو دیکھا۔ یہ ڈبہ اماں کے زیورات کا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ تالا لگا کر الماری
کے نچلے خانے میں رکھتی تھیں۔

”یہ ایک ذبہ تھا، اس کی یہ چالی ہے، تم خود دیکھ لو۔ اور ساتھ یہ کچھ رقم تھی، اس کی جمع پونچی۔ اس نے بھے سے کہا تھا کہ میں تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کر دوں۔ مگر میں نے سوچا کہ میں یہ تمہارے ہی حوالے کر دوں۔ تم بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔“

انہوں نے ایک بھولا ہوا الفافہ ذبہ کے اوپر رکھا۔

محل نے آہستہ سے لفاظ اٹھایا اور کھول کر دیکھا۔ اندر ہزار ہزار کے کئی نوٹ تھے۔
شاید اماں نے اس کے جیز کے لئے رکھے تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے لفاظہ ایک
طرف رکھا اور جانی سے کافی ڈبے کا تالا کھولا۔

اندر کچھ زیورات تھے۔ خالص سونے کے جڑاؤ زیورات۔ اس نے ڈپہ بند کر دیا۔
معلوم نہیں، اماں نے کب سے سنچال رکھتے۔

”ویک سمیت سب لوگ اس دھیت کے وقت موجود تھے۔ تم سب سے پوچھ سکتی ہو، میں نے تھا راحق یورا ادا کر دیا ہے یا نہیں۔“

اس نے بھیکی آنکھیں اٹھائیں، سامنے صوفوں اور کرسیوں پر پیشے تمام نفوں کے
چہرے مطمئن تھے۔ مطمئن اور بے نیاز۔

”چیزیں تو آپ نے ادا کر دی ہیں آغا بھائی! مگر سرت کی وصیت؟“ دفعۂ فضہ
چی نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

”اوہوفضہ! ابھی اس کی ماں کو گزرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“ تالی مہتاب نے نگاہوں سے تنبیہ کی۔

”مگر بھائی! مسرت نے کہا تھا کہ جلد از جلد....“

”زہنے دونفسہ! ہم اس کا فیصلہ محمل پر چھوڑ چکے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔“

”مگر ایک لیسٹ اسے بتا تو دیں۔“

”ابھی اس کا غم تو ہلکا ہونے دو پھر.....“

ان کی دبی دبی سرگوشیاں اسے بے چین کر گئیں۔

”تالی ماں! کیا بات ہے؟ ماں نے کچھ اور بھی کہا تھا؟“

سب ایک دم خاموش سے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”محمل! میں تمہیں کچھ دن تک بتا دیں گی، ابھی اس قصے کو چھوڑو۔“

”پلیز تالی ماں!..... مجھے بتائیں۔“

”مگر تمہارا غم ابھی.....“

”میں تمہیک ہوں، مجھے بتائیں۔“ اس نے بے چینی سے بات کاٹی۔

تالی مہتاب نے ایک نظر سب کو دیکھا، پھر قدرے پھکپا کر گویا ہوئیں۔

”بات یہ ہے کہ مسرت نے مرنے سے پہلے وسیم کو بلا کر ان سب کے سامنے تمہارے آغا جان سے کہا تھا کہ اگر وہ فتح نہ سکے تو جتنی جلدی ہو، ہم محمل کو وسیم کی دلہن بنا کر سہارا دیں، اس کو بے آسرا نہ چھوڑیں۔ اور تمہارے آغا جان نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔“

وہ اپنی جگہ سُن سی ہو گئی۔ زمین جیسے قدموں تلے سے سر کرنے لگی تھی اور آسمان سر سے ٹھنے لگا تھا۔

”ماں نے یہ سب کہا؟“

”ہاں، یہ سب لوگ جو یہاں ہیں، اس بات کے گواہ ہیں۔ تم کسی سے بھی پوچھ

لو۔“

وہ ایک دم بالکل چپ ہی ہو گئی۔ عجیب سی بات تھی، اسے یقین نہ آ رہا تھا۔

”لیکن محل! ہم نے یہ فصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے، تم چاہ تو یہ شادی کرو، چاہ تو نہ کرو۔ ہم نے تمہیں اس لئے آگاہ کر دیا کہ یہ تمہاری ماں کی آخری خواہش تھی۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اس کی بات رکھتی ہو یا نہیں۔ ہم میں سے کوئی تم پر زور نہیں ڈالے گا۔“

وہ سر جھکائے کاسنی ڈبے کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں جیسے جھکڑ جمل رہے تھے۔ مگر یہ ڈبہ اور لفافِ ثبوت تھا کہ یہ وصیت واقعی اس کی ماں نے کی تھی۔

”اگر تمہیں منظور ہے تو ہم اگلے جمعے کو نکاح رکھ لیتے ہیں کہ سرت کی خواہش تھی یہ کام جلد از جلد کیا جائے۔ اگر نہیں تو کوئی بات نہیں، تم جو چاہو گی، وہی ہو گا۔“ مہتاب تائی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

اس نے ہولے سے سراخھایا۔ سنہری آنکھیں پھر سے بھیگ چکی تھیں۔ کمرے میں موجود تمام نفوس دم ساد ہے اسے دیکھ رہے تھے۔

”میں اپنی ماں کی بات کامان رکھوں گی۔ آپ جب کہیں گی، میں شادی کے لئے تیار ہوں۔“

پھر وہ رکی نہیں، ڈبہ اور لفافہ اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔



وہ کھن میں کرسی پر بیٹھی تھی، ہاتھ میں صبح و شام کی دعاوں اور اذکار کی کتاب تھی اور وہ منہمک سی پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔

”ہم نے صبح کی، فطرت اسلام پر

اور کلمہ اخلاص پر

اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر

اور اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر

جو یکسو مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔“

”محمل.....!“ کسی نے زور سے کھن کا دروازہ کھولا۔ ان نے چونک کر سراخھایا۔

سامنے گلست میں اندر داخل ہوئی تھی۔

”تم سے کوئی ملنے آیا ہے، ڈرائیک روم میں ہے۔ جاؤ، مل لو۔“

”کون ہے؟“

”وہی پولیس والا۔“ وہ کہہ کر پلت گئی۔

”ہمایوں آیا ہے؟“ وہ کتنی ہی دیر کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی، پھر آہستہ سے اسے بند کیا، سلیب پر رکھا، لباس کی شکنیں درست کیں اور سیاہ دوپٹہ نجیک سے سر پلے کر باہر آ گئی۔

ڈرائیک روم سے باتوں کی آواز آرہی تھی، جیسے دلوگ گفتگو میں مشغول ہوں۔ یہ ہمایوں سے کون باتیں کر رہا ہے؟ وہ ابھتی ہوئی اندر آئی۔ ڈرائیک روم اور ڈرائیک ہال کے درمیان سفید جالی دار پروہ تھا۔ وہ پردے کے پیچھے ڈرادری کو روکی۔

سامنے بڑے صوفے پر ہمایوں بیٹھا تھا۔ اس کے بالکل مقابل، سنگل صوفے پر آزو بیٹھی تھی۔ ٹانگ پٹانگ رکھے، آدمی پنڈلی تک ٹراوُزر پہنے وہ اپنے مخصوص بے نیاز حلیے میں تھی۔ کئے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتی وہ ہنس کر ہمایوں سے کچھ کہہ رہی تھی۔

جانے کیوں اسے یہ اچھا نہ لگا۔ اس نے ہاتھ سے پروہ سمیٹا اور اندر قدم رکھا۔ وہ جیسے اسے دیکھ کر کچھ کہتے کہتے رکا اور پھر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ بلیوشرٹ اور گرے پینٹ میں لمبیوس وہ ہمیشہ کی طرح بہت شان دار لگ رہا تھا۔ آغا جان اسے پسند نہیں کرتے تھے، مگر پھر بھی اسے اندر آنے دے دیا گیا۔ شاید اس لئے کہ اب وہ ان کی بہو بننے والی تھی۔ اور اس کو وہ ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”السلام علیکم؟“ وہ آہستہ سے کہہ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ آزو کے پھرے پر ڈرائیک ٹاریک اُبھری، جسے ہمایوں نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پوری طرح محمل کی طرف متوجہ تھا۔

”مجھے مزاربرائیم کی ڈسچرچ کا پتہ بہت دیر سے چلا۔ میں کراچی گیا ہوا تھا، آج ہی آیا ہوں۔ فرشتے نے مجھے ہی بتایا، میں آگئیا۔ آئی ایم دیری سوری محمل!“ واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ بہت ناسف سے کہہ رہا تھا۔

محمل نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر آرزو کو دیکھا۔

”آرزو باتی! آپ جاسکتی ہیں، اب میں آگئی ہوں۔“

”ہاں، شیورے!“ آرزو انہ کھڑی ہوئی۔ ”مگر جانتے ہوئے ان کو شادی کا کارڈ دے دیتا۔“ استہزا یہ مسکرا کر وہ گویا جتنا گئی تھی۔ محمل کے سینے میں ہوک سی انہی۔
”کس کی شادی؟“ وہ چونکا تھا۔

”محمل کی شادی، دیکم کے ساتھ۔ آپ کو نہیں پتا اے ایس پی صاحب؟ اسی فرائیدے ان کا نکاح ہے۔ آپ ضرور آئیے گا۔ میں آپ کا کارڈ نکلا دیتی ہوں، ٹھہریئے!“ وہ خوش دلی سے کہتی باہر نکل گئی۔
کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

”یہ کیا کہہ رہی تھی؟“ وہ بولا تو اس کی آواز میں حیرت تھی۔ بے پناہ حیرت۔

”ٹھیک کہہ رہی تھی۔“ وہ سر جھکائے ناخن کھڑی رہی۔

”مگر کیوں محمل؟“

”آپ غالباً تعزیت کے لئے آئے تھے۔“

”پہلے میری بات کا جواب دو۔ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟“

”میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔“ اس نے تتملاً کر سراخایا۔ ”یہ میری ماں کی آخری خواہش تھی، مرتے وقت انہوں نے یہ ہی وصیت کی تھی۔“

”تمہیں کیسے پڑتا؟ تم تو ان کی ڈسیتھ کے وقت مسجد میں تھیں۔“

”ہاں، مگر انہوں نے آغا جان سے کہا تھا، سب لوگ وہاں موجود تھے، سب گواہ ہیں۔“

”تم!“ وہ مٹھیاں بھیج کر رہا گیا۔ اس کا بس نہیں ہیں رہا تھا، وہ کیا کر ڈالے۔ ”تم انتہائی بے دوقوف اور احمق ہو۔“

”میں اپنی ماں کی بات کا مان رکھنا چاہتی ہوں، اس میں کیا حماقت ہے؟“ وہ چوٹی۔

”نادان لڑکی! تمہیں یہ لوگ بے دوقوف بنا رہے ہیں، استعمال کر رہے ہیں۔“

”کرنے دیں۔ آپ کو کیا ہے؟“ وہ پیر شخ کر کھڑی ہو گئی۔ ”آپ میرے کون ہیں جو مجھ سے پوچھ پکھ کر رہے ہیں؟“

”میں جو بھی ہوں، مگر تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“ وہ بھی ساتھ ہی کھڑا ہوا، اس کی آواز میں بے بسی تھی۔ کبھی یہ ہی بات اس نے بہت اکھر لجھے میں بھی کہی تھی، جب وہ مسجد کے باہر اسے لینے آیا تھا، اس رات کی صبح کو جو اس کی زندگی اجادہ گئی تھی۔

”اگر آپ کے دل میں میری ماں کا ذرا سا بھی احترام ہے تو مجھے وہ کرنے دیں جو میری ماں چاہتی تھی۔ ماں، باپ کبھی اولاد کا برائیں چاہتے۔ اسی میں کوئی بہتری ہو گی۔ آپ جاسکتے ہیں۔“ وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

اسی پل پر وہ ہٹا کر آرزو نسودار ہوئی۔

”آپ کا کارڈ۔ آئیے گا ضرور۔“ اس نے سکرا کر کارڈ ہمایوں کی طرف بڑھایا۔ ہمایوں نے ایک قبر آکلو نظر کارڈ پر ڈالی اور دوسری محمل پر، پھر لبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

”نور پر ایلم۔“ آرزو شانے اچکا کر کارڈ لئے واپس مڑ گئی۔

”ماں؟“ وہ کراہ کر صوفی پر گرسی گئی۔ یہ ماں اسے کس منجد ہمار میں چھوڑ کر چلی گئی تھیں؟ کیوں کیا انہوں نے یہ فیصلہ؟..... کیوں ماں؟..... وہ دونوں باتوں میں سرگرا نے سوچتی رہ گئی۔



سارے گھر میں دبادبا سا شادی کا شور اٹھ چکا تھا۔ گوکرہ بھی صرف نکاح تھا، مگر مہتاب تائی بھر پور تیاریاں کر رہی تھیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فواد جلد ہی واپس گمرا آ رہا تھا۔ اس خبر سے محمل پر تو کوئی اثر نہ ہوا، البتہ تائی اماں اپنی اندر وہی خوشی چھپائے سب کچھ محمل پر ڈال گئی تھیں۔

”سوچ رہے ہیں، تمہڑا سا گھما گھمی والا فنکشن رکھ لیں، تاکہ محمل کا دل بہل جائے۔ درستہ کج پوچھو تو صرت کے جانے کے بعد سے وہ بہت بجھی گئی ہے۔ اب ہمارا دل تو نہیں چاہتا کہ شور ہنگامہ ہو، مگر بس محمل اچھا محسوس کرے، اس لئے۔“ وہ کسی نہ کسی کو ہر وقت فون پر وضاحتیں دے رہی ہوتی تھیں۔

محمل چپ چاپ کھن میں کام نہ تھا تی رہتی، جیسے وہ خاموش ماتم کر رہی تھی۔ نمازیں، نسیم، دھانگیں، وہ سب کر رہی تھی۔ ہاں، مسجد وہ ابھی نہیں جا رہی تھی۔ مسجد جا کر سکون ملتا تھا وہی امال وہ سکون نہیں چاہتی تھی۔ وہ صرف اور صرف ماتم چاہتی تھی۔ صرفت کا، یا شاخہ اپنا، وہ نہیں جانتی تھی۔

فون کی گھٹی بھی تھی جو دریں میں صاف کر رہی تھی، آہستہ سے رو مال چھوڑ کر ہی۔

اسی وجہ پر کہاں توں مسلسل بیجے چار ہی تھے۔ وہ مجھے نے چھوٹے قدم اٹھاتی تریکھ آئی
بندوں پیغمبر اُنہیں۔

”السلام عليكم؟“

”وليك السلام، محمل؟“ نسوانی آواز ریسیور میں گوئی۔ وہ لمحے بھر میں ہی پچان گئی۔

”فرشته؟..... کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ ہمایوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم.....“ فرشتے قدرے پریشانی سے کہہ رہی تھی کہ اس نے تیزی سے بات کائی۔

”ہمایوں ہر بات آپ کو کیوں جا کر بتاتے ہیں؟ ان سے کہیں، ایسا مت کیا کریں۔“

”مگر محمل!..... تم اس طرح کیسے؟“

”آپ لوگ مجھے احمد کیوں سمجھتے ہیں؟ کیوں میرے لئے پریشان ہو رہے ہیں؟ میری ماں میرے لئے کچھ غلط نہیں سوچ سکتی۔ پلیز مجھے میری زندگی کے فیصلے خود کرنے دیں۔“

”محمل! اب میں تمہیں کیا کہوں۔ اچھا ٹھیک ہے، جو کرنا، سوچ سمجھ کے کرنا۔ اوکے، چلو اب ہمایوں سے بات کرو۔“

”ارے نہیں۔“ وہ روکتی رہ گئی، مگر فرشتے نے فون اسے پکڑا دیا تھا۔

”اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے اور تمہارے وہ فیری ٹیل سرال والے اجازت دیں تو کیا میں اور فرشتے تمہاری شادی کے فنکشن میں آسکتے ہیں؟“

”اوہ ہوں..... ہمایوں!“ بیچپے سے فرشتے کی تمہیں آواز اُبھری۔

”کیوں محمل! میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ وہ ٹھریہ بولا تھا۔

”ہاں شیور۔ کیوں نہیں؟ جمعہ کو رات آٹھ بجے فنکشن ہے۔ ضرور آئیے گا۔ اللہ حافظ!“

اس نے کھٹ سے فون کر دیا۔ غصہ اتنا اُبل رہا تھا کہ فرشتے سے بھی بات کرنے کو مل نہیں چاہا تھا۔

فون کی لکھنی بھر سے بچتے گئی، مگر وہ سر جھک کر میز کی طرف بڑھ گئی، جہاں جمازو پوچھ کاروں وال اس کا انتظار کر رہا تھا۔



بیوٹیشن نے کام دار دوپٹہ اس کے سر پر رکھا، اور پھر اسے ایک ہاتھ سے پکڑے، وہ جھک کر ڈرینگ ٹیبل سے بیٹھنے لی۔ محمل بت بنی اشول پر بیٹھی سامنے آئیں میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ بیوٹیشن اس کے پیچھے کھڑی اس کا دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی۔

وہ کام دار شلوار قمیص گھرے سرخ رنگ کی تھی، جس پر سلو رسلی ستارے کا کام تھا۔ ساتھ میں نازک سا وائٹ گولڈ اور روپی کانیکلس تھا اور ایک خوب صورت قیمتی سائیکل، جس میں بڑا سا سرخ روپی جڑا تھا، اس کے ماتھے پر سجا تھا۔ جانے تائی نے کب یہ سب بنوایا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ ہر چیز پہنچی۔

گھر میں ہونے والے ہنگاموں سے کہیں نہیں لگتا تھا کہ سرت کو مرے ابھی بیس دن بھی نہیں ہوئے، مگر وہ شکوہ کس سے کرتی؟ سرت کی زندگی میں بھی ان کی اتنی اہمیت کہاں تھی کہ مرنے کے بعد کوئی انہیں یاد رکھتا؟ اور سناتھا، آج تو فواد بھی آگیا تھا۔ پھر کہے کاماتم؟

وہ اپنے کمرے کے بجائے تائی کے کمرے میں تھی، تاکہ وہ ٹھیک سے تیار ہو جائے۔ اسے تیار کرنے کے لئے تائی نے دو ماہر بیوٹیشن لڑکیاں بلوانی تھیں، جو کافی دیر سے اس پر گلی ہوئی تھیں۔

دفعہ باہر لا دُنخ سے چند آوازیں گنجیں۔ وہ ذرا سی چوکی۔ کیا فواد آگیا تھا؟ یہ آواز تو....

”سنوا! یہ دروازہ تمہوڑا سا کھول دو۔“ بے چینی سے اس نے بیوٹیشن سے کہا، تو وہ سر پلاٹی آگے بڑھی اور لا دُنخ میں کھلنے والا دروازہ آدمکھول دیا۔

سامنے لا دُنخ کا منظر آدمان نظر آرہا تھا اور اس کا شک درست تھا۔

”تم..... تم ادھر کیوں آئی ہو؟“ تائی مہتاب کی تتملاٹی بلند آواز اندر تک سنائی دے رہی تھی۔

”مکرمت کریں، میں رنگ میں بھنگ ڈالنے نہیں آئی، محمل کی شادی ہے، میرا الٰ فرض یقنا تھا۔“ وہ اطمینان سے کہتی سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ ادھر کھلے دوازے سے ۴۷

محمٰل کو صاف نظر آ رہی تھی۔

سیاہ عبایا کے اوپر سیاہ جاپ کے شک ہالے کو چہرے کے گرد لپیٹے وہ اب بے نیازی سے ٹانگ پڑنا ٹانگ رکھنے بیٹھی اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔

محمٰل نے لمحے بھر کو محسوس کرنا چاہا کہ اسے فرشتے کے آنے سے خوشی ہوئی ہے، مگر اسے اپنے محسوسات بہت جامد لگے تھے، برف کی طرح خشندے۔

اندر باہر خاموشی ہی خاموشی تھی۔ فرشتے آئے یا فواڈ، اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

”مگر ہم تمہارا اس گھر سے کوئی رشتہ تسلیم نہیں کرتے۔“

”نہ کریں، مجھے پرداں نہیں۔“ وہ اب ہاتھ میں پکڑے موبائل کے بین دباتی اس کی طرف یوں متوجہ تھی، جیسے سامنے غصے سے مل کھاتی تائی مہتاب کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ فرشتے کے پاس موبائل نہیں تھا۔ وہ شاید ہمایوں کا موبائل لے کر آئی تھی۔

”دیکھو لڑکی! تمہارا محمٰل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ، اس سے پہلے کہ میں گارڈ کو بلاؤں۔“

”پھر آپ گارڈ کو بلاؤ لیں۔ کیونکہ میں تو ایسے جانے والی نہیں۔ سوری!“

”تم کیسے نہیں جاؤ گی، تمہارا تعلق.....“

”مزکریم! میں موبائل پہ بڑی ہوں، آپ دیکھ رہی ہیں، مجھے ڈسٹرپ مت کریں۔ اور پلیز محمٰل کو بلاویں۔“

وہ ٹانگ پڑنا ٹانگ رکھنے بیٹھی موبائل پہ چہرہ جھکائے ہوئے مصروف تھی۔ محمٰل کے لبوں کو ہلکی سی مسکراہٹ چھوگئی۔ فرشتے بد تیز یا بد لحاظ نہ تھی، بلکہ وہ اپنے از لی خشندے اور باوقار انداز میں تائی کو بہت آرام سے جواب دے رہی تھی۔ البتہ محمٰل بد تیزی کر جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا، وہ کبھی بھی فرشتے کی طرح پُر اعتماد اور باوقار نہیں بن سکے گی۔

”محمٰل تم سے نہیں ملے گی، تم جاسکتی ہو۔“

آغا جان کی آواز پر موبائل پر مصروف فرشتے نے چونک کر راٹھایا۔ وہ سامنے سے چلے آ رہے تھے۔ کلف لگنے شلوار قمیض میں لمبیں، کرپ ہاتھ باندھے وہ غیض و غضب

کی تصویر بنتے ہوئے تھے۔

”السلام علیکم کریم پچا.....؟“ وہ موبائل رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہرے پر ازملی اعتماد اور سکون تھا۔

”فرشته! تم یہاں سے جا سکتی ہو۔“

”آپ مجھے نکال سکتے ہیں؟“ وہ ذرا سماشکرائی۔ ”آپ کو لگتا ہے کریم پچا! کہ آپ مجھے نکال سکتے ہیں؟“

”میں نے کہا، یہاں سے جاؤ۔“ وہ ایک دم غصے سے دھاڑے تھے۔

”میں بھی اتنا ہی اونچا جیخ سکتی ہوں، مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں یہاں یہ کرنے نہیں آئی، میں صرف محمل سے ملنے آئی ہوں۔“ وہ سینے پر ہاتھ باندھے پڑا عتماد کی ان کے سامنے کھڑی تھی۔

لاڈنگ میں سب اکٹھے ہونے لگے تھے۔ لڑکیاں ایک طرف کھڑی لاعلمی، اشاروں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں۔ اسد پچا، غفران پچا فضہ چجی اور ناعمہ چچی بھی وہیں آگئی تھیں، حسن بھی شورس کریٹریوں سے اُتر آیا تھا۔ لاڈنگ کے پہلوں پنج آغا جان کے سامنے کھڑی وہ دراز قد، سیاہ عبا یا والی لڑکی کون تھی؟ بہت سی آنکھوں میں سوال تھا۔

”تمہارا محمل سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ تم سے نہیں ملے گی، سناتم نے؟“

”آپ یہی بات محمل کو بلوا کر پوچھ لیں نا کریم پچا! کہ وہ مجھ سے ملے گی یا نہیں؟“

”ہم تمہیں نہیں جانتے کہ تم کون ہو، کہاں سے اٹھ کر آگئی ہو۔ تم فوراً نکل جاؤ، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“

”آغا جان! یہ کون ہیں؟“ حسن الْجَمَاهِرَہ اور آگے بڑھا۔

”تم پنج میں مت بولو۔“ انہوں نے پلٹ کر اتنی بری طرح سے جھڑکا کہ حسن خائف سا ہو گیا۔

”ہشو۔“ بیویشنا کا ہاتھ ہٹا کر وہ آٹھی اور کامدار دوپٹہ سنبھالتی نگئے پاؤں باہر کو لپکی۔

”آپ مجھ سے ملنے آئی ہیں؟“ لاڈنگ کے بیرے پر وہ رک کر بولی تو سب نے

چونک کراس کی طرف دیکھا۔ فرشتے ذرا سامسکرائی۔

”کریم بچپا کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے نہیں ملوگی۔“

”محمل! تم اندر جاؤ۔“ تائی مہتاب پریشانی سے آگے بڑھیں۔

”آغا جان! تائی اماں! فرشتے کو میں نے خود شادی میں انواست کیا ہے۔ آپ گھر آئے مہمان کو کیسے نکال سکتے ہیں؟“

”تم نے؟“ تائی مہتاب بھونچکی رہ گئیں۔ ”تم جانتی ہو اسے؟“

”ہاں۔ میں انہیں جانتی ہوں۔“

”اور یہ کیسے نہیں جانتی ہوں گی، ان کے اُس عاشق کی عزیزہ ہیں نا یہ۔“

کوئی تمسخرانہ انداز میں کہتا سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا۔ محمل نے چونک کر گردن اٹھائی۔ وہ فواد تھا۔ ہشاش بٹاٹش، چہرے پر ٹھریہ مسکراہٹ لئے، وہ ان کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

”یہ کون ہیں؟“ فرشتے نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھ کر محمل کو مخاطب کیا۔

”یہ اس ملک میں قانون کی بے بھی کامنہ بولتا ثبوت ہیں، جن کو قانون زیادہ دریں سکھ رہا ہے میں نہیں رکھ سکتا۔“

ایک جتنا نظر فواد پر ڈال کر اس نے چہرہ موڑ لیا تھا۔ ”آپ اندر آ جائیں فرشتے! بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔“ تائی تیزی سے آگے بڑھیں۔ ”محمل! یہ لڑکی فراڈ ہے، یہ صرف ابراہیم کی جاسیداد کے پیچھے ہے۔“

”وہ تو آپ بھی ہیں مہتاب آنٹی! اور شاید اسی لئے آپ محمل کو بھوپالہ رہی ہیں۔“ اس نے فرشتے کو کسی سے اتنی درشتی سے بات کرتے آج چہلی بار دیکھا تھا، مگر اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔

”یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے، تم بیچ میں مت بولو۔“

”میں بیچ میں بولوں گی، محمل کے لئے میں ضرور بولوں گی۔“ وہ پلٹی اور محمل کو دونوں کندھوں سے تحام کر اپنے سامنے کیا۔

”محل! مجھے بتاؤ، ان لوگوں نے تمہارے ساتھ زبردستی کی ہے؟ یہ تمہیں کیوں مجبور کر رہے ہیں اس شادی پر؟“

”مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا، یہ میرا اپنا فیصلہ ہے، میں اس پر خوش ہوں۔“

فرشتے ایک دم چپ سی رہ گئی۔ اس کے شانوں پر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔

”سن لیا تم نے؟ اب جاؤ۔“ آغا جان نے استہزا سے سر جھکا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا، مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہ تھی۔

”محل! تم نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کر لیا؟“ وہ دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”جب کسی کو اپنا مخلص دوست کہا جاتا ہے اور اپنے دوست کی محبت اور خلوص کے دعوے کئے جاتے ہیں تو اتنے بڑے فیملوں سے قبل اسے مطلع بھی کیا جاتا ہے۔“

”میں آپ کو بتانے ہی.....“

”میں اپنی بات نہیں کر رہی۔“

”پھر کون؟“ وہ چونکی۔ ”کیا ہمایوں؟“ اس کا نام اس نے بہت آہستہ سے لیا تھا۔

”میں.....“ وہ مزید اس کے قریب آئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے دھیرے سے بولی۔ ”میں اپنے مصحف کی بات کر رہی ہوں، جس کے اتا رنے والے سے تم نے سمعنا و اطعنا (ہم نے سنा اور ہم نے اطاعت کی) کا وعدہ کیا تھا۔ کیا تم نے اسے بتایا؟“

”فرشتے!“ وہ ڈنال پلک جھکے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”اللہ کو سب پڑھتے ہے، میں کیا بتاؤں؟“

”کیا تمہیں دن میں پانچ بار اسے اپنی اطاعت کا بتانا نہیں پڑتا؟ پھر اپنے فیملوں میں تم اسے کیسے بھول سکتی ہو؟“

محل ٹکر کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی کچھ بچھے میں نہیں آ رہا تھا کہ فرشتے کیا کہہ رہی ہے، کیا سمجھنا چاہ رہی ہے۔

”مگر میں نے نماز، تسبیح، کچھ نہیں چھوڑا۔ میں ساری نمازوں پر صحتی ہوں۔“ وہ دنوں بہت دھرم سرگوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔

”لیکن کیا تم نے اس کی سنی؟ اس نے کچھ تو کہا ہو گا تمہارے فیصلے پر۔“ فرشتے نے ابھی تک اسے کندھوں سے تھام رکھا تھا اور وہ یک لیک اسے تکے جارہی تھی۔

”محل! تم اس کی باتیں سنتیں تو سکی، اس سے پوچھتیں تو سکی۔ تم قرآن کھولو اور سورہ مائدہ کا ترجمہ دیکھو۔“ اس کی آواز میں تاسف گھل گیا۔ محل نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے، اسے لگا، اس سے نظری ہو گئی ہے۔

”میں ابھی آتی ہوں، آپ جائیے گا نہیں۔“

وہ کام دار دوپٹے کا پلو انگلیوں سے تھامے، ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی۔

”محترمہ! آپ جاسکتی ہیں۔“ فواد نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میرے باپ کا گھر ہے، اس میں خبرنے کے لئے مجھے آپ کی اجازت نہیں چاہئے۔“ وہ رُکھائی سے کہتی صوفی پیشی اور پھر سے موبائل اٹھالیا۔

فواد اور آغا جان نے ایک دوسرے کو دیکھا، نگاہوں میں اشاروں کا تبادلہ کیا اور پھر آغا جان بھی گھری سانس لیتے ہوئے صوفی پیشہ گئے۔ تقریب کے شروع ہونے میں دوڑھائی گھنٹے رہتے تھے۔ مہماںوں کی آمد کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

محل دوڑتے قدموں سے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ دروازے کی چیخنی چڑھا کر وہ شیف کی طرف پیکی۔

سب سے اوپر والے خانے میں اس کا سفید جلد والا مصحف رکھا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اوپر رکھا مصحف اٹھایا اور آہستہ سے اسے دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے چہرے کے سامنے لائی۔ اسے سب یاد رہا تھا، صرف یہ بھول گیا تھا۔ کیوں؟

وہ اسے مقبوٹی سے پکڑے بیٹھ پ آپیشی اور کورکھوا۔

وہ سورہ مائدہ کی 106 آیت تھی۔ جس وقت کلاس میں موت کی موت کی خبر کی وجہ سے اسے بلوایا گیا تھا، اس وقت یہی آیت پڑھائی جارہی تھی۔

”اے ایمان والو! جب تم میں کسی کی موت کا وقت آ جائے اور وہ وصیت کر رہا ہو

تو...“

چند الفاظ پڑھ کر ہی اس کا دل بری طرح سے دھڑکا۔ اس نے زور سے ٹلکیں جھپکیں۔ کیا وہ سب کچھ واقعی ادھر لکھا تھا؟ وصیت..... موت کا وقت..... وصیت.....

”سرت نے مرتبے وقت وصیت کی تھی.....“

”تمہارا رشتہ وسیم سے.....“

بہت سی آوازیں ذہن میں گذرا ہوئے تھیں۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے پڑھنے لگی۔

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لئے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں دو صاحب عدل آدمی گواہ بنائے جائیں یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر لوگوں ہی میں سے دو گواہ لے لئے جائیں، پھر اگر (ان کی بتائی ہوئی وصیت میں) کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ قسم کھا کر کہیں کہ ہم کسی فائدے کے عوض شہادت پہنچنے والے نہیں ہیں اور خواہ کوئی حمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور نہ خداواسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔“

وہ ساکت سی ان الفاظ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھرا گئی تھیں۔ قرآن کو تھا میں دونوں ہاتھ بے جان سے ہو گئے تھے۔ کیا وہ سب واقعی یہاں لکھا تھا؟ مگر..... مگر کیسے؟ وصیت..... دو افراد کی قسم کھا کر گواہی..... رشتہ دار..... یہ سب تو..... یہ سب تو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

وہ پلک تک نہ جھپک پا رہی تھی۔ اس کا دل جیسے رعب سے بھر گیا تھا۔ رعب سے اور خوف سے۔ یکا یک اسے لگا، اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں، اسے ٹھنڈے پینے آرہے ہیں۔ وہ بہت بھاری کتاب تھی، بہت بھاری، بہت وزنی، وہ جس کا بوجھ پہاڑ بھی نہ اٹھا سکتے ہوں، وہ کیسے اٹھا سکتی تھی؟ اسے لگا، اس کی ہمت جواب دے جائے گی۔ وہ اب مزید یہ بوجھ نہیں اٹھا پائے گی۔ وہ عام کتاب نہیں تھی، اللہ کی کتاب تھی۔ اسے اللہ نے

اس کے لئے، خاص اس کے لئے اتنا راتھا۔ ہر لفظ ایک پیغام تھا، ہر سطر ایک اشارہ تھی۔
اس نے اتنی زندگی ضائع کر دی۔ اس نے یہ پیغام کبھی دیکھا ہی نہیں۔

”مholm! تم نے اتنی عرب بے کار گزار دی۔ یہ کتاب غلاف میں لپیٹ کر بہت اور پہنچانے کے لئے تو نہ تھی۔ یہ تو پڑھنے کے لئے تھی۔“

ہر دفعہ کی طرح آج پھر اس کتاب نے اسے بہت حیران کیا تھا۔ سوچنا کبھنا تو دور کی بات، وہ تو تحریری ان الفاظ کو تکے جا رہی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ کیسے اس کتاب کو سب پتہ ہوتا تھا؟

”کیونکہ یہ اللہ کی کتاب ہے، نادان لڑکی! یہ اللہ کی بات ہے، اس کا پیغام ہے، خاص تمہارے لئے۔ تم لوگ نہ سننا چاہو تو یہ الگ بات ہے۔“ کسی نے اس کے دل سے کہا تھا۔

وہ کون تھا؟ وہ نہ جانتی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر سب نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ آہستہ سے چلی آ رہی تھی۔ کام دار دوپٹے کا کنارہ ٹھوڑی کے قریب سے اس نے دو الگیوں میں لے رکھا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت قدرے سفید پڑی ہوئی تھی، یا شاید یہ کچھ اور تھا جو انہیں چونکا گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”آغا جان!“ اس نے ان کی آنکھوں میں جہان کا۔ وہ اس کے ا江山ی لمحے پر چونک سے گئے۔

”ہاں، بولو۔“

”میری ماں کی وصیت کے وقت موجود لوگوں میں سے کون سے دلوگ عصر کی نماز کے بعد اللہ کے نام کی قسم اٹھا کر گواہی دیں گے کہ انہوں نے یہ وصیت کی تھی یا نہیں؟“
بلی بھر کو لا دُنخ میں سکوت سا چھا گیا۔ فرشتے نے مسکراہٹ دبا کر سر نیچے کر لیا۔
آغا جان حیران سے کھڑے ہوئے۔

”کیا مطلب؟“

”آپ کو پتہ ہے، سورہ مائدہ میں لکھا ہے۔ نماز کے بعد آپ میں سے دلوگوں کو

الله کے نام کی قسم اٹھا کر گواہی دینی پڑے گی۔“

”کیا بکواس ہے؟“ وہ حسب توقع بھڑک اٹھے۔ ”تمہیں ہماری بات کا اختیار نہیں ہے؟“

”نہیں ہے۔“

”تم.....“ وہ غصہ خبط کرتے، مٹھیاں بھیج کر رہ گئے۔ تب ہی نگاہ فرشتے پر پڑی تو اس نے فوراً شانے اچکا دیئے۔

”میں نے تو کچھ نہیں کیا، کریم چچا!“

”تم سے تو میں بعد میں.....“

”آپ لوگ گواہی دیں گے یا نہیں؟“ وہ ان کی بات کاٹ کر زور سے بولی تھی، پھر چہرے کارخ صوفوں پر بیٹھے نفوس کی طرف موڑا۔ ”کون کون تھا اس وقت آپ میں سے ادھر؟ کون دے گا گواہی؟ کون اٹھائے گا قسم؟“ بولئے، جواب دیجئے۔“

سب خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اسے اس کے سارے جواب مل گئے تھے۔ کاش! وہ پہلے اس آیت کو پڑھ لیتی تو اتنا غلط فیصلہ نہ کرتی۔ صحیح کہتا ہے اللہ تعالیٰ، ہماری بہت سی مصیبتیں ہمارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہیں۔

”تو آپ لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ بہت بہتر..... مجھے اب کوئی شادی نہیں کرنی۔“ اس نے ماتھے پر جھولتا یہ کافی نوج کر سامنے پھینکا۔ نازک سائیکا ایک آواز کے ساتھ میز کے شیشے پر گرا۔

”اب میرا فیصلہ بھی سن لو۔“ آغا جان نے ایک گھری سانس لی۔ ”مگر پہلے تم لڑکی!“ انہوں نے خوارت سے فرشتے کو اشارہ کیا۔ ”تم مجھے یہاں سے چلتی نظر آؤ۔“

”میرے باپ کا گھر ہے، میں تو کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ فواد!“ انہوں نے فواد کو اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھا اور صوف پر بیٹھی فرشتے کو ایک دم بازو سے کھینچا۔

”چھوڑو مجھے۔“ وہ اس اچاک افتاد کے لئے تیار نہ تھی، بے اختیار چلا کر خود کو چھڑانے لگی، مگر وہ اسے بازو سے کھینچ کر گھینٹا ہوا باہر لے جانے لگا۔ اسی پل آغا جان،

محمٰل کی طرف بڑھے۔

”تو تم یہ شادی نہیں کرو گی؟“

”ہرگز نہیں کروں گی۔ میری بہن کو چھوڑو۔“ وہ غصے سے فواد پہ جھپٹنا ہی چاہتی تھی جو فرشتے کو زبردستی باہر لے کر جا رہا تھا، مگر اس سے پہلے ہی آغا جان نے اس کو بالوں سے پکڑ کر واپس کھینچا۔

”تو تم شادی نہیں کرو گی؟“ انہوں نے اس کے چہرے پہ تھپٹر مارا۔ وہ چکرا کر گری۔

”تمہیں لگتا ہے، ہم پاگلوں کی طرح تمہاری میتیں کریں گے؟ تمہارے آگے ہاتھ جوڑیں گے؟..... نہیں بی بی! شادی تو تمہیں کرنی پڑے گی، ابھی اور اسی وقت..... اسد! نکاح خواں کو ابھی بلواؤ۔ میں بھی دیکھتا ہوں، یہ کیسے شادی نہیں کرتی۔“

”میں نہیں کروں گی، سنا آپ نے؟“ وہ روتے ہوئے بولی۔ وہ مسلسل اسے تھپٹروں اور نکلوں سے مار رہے تھے۔

”میری بہن کو چھوڑ دو۔“ خود کو چھڑاتی فرشتے، محمل کو پشتے دیکھ کر لمحے بھر کو تو سکتہ میں رہ گئی تھی، اور پھر دوسرے ہی بلماں اس نے زور سے فواد کو دھکا دینا چاہا، مگر وہ مرد تھا، وہ اس کو دھکیل نہ سکتی تھی۔ وہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے اسے دروازے سے باہر نکال رہا تھا۔

”فواد! اسے چھوڑو۔“ یک دم حسن نے پوری قوت سے فواد کو چیچھے دھکیلا تھا۔ فواد اس حملے کے لئے تیار نہ تھا، ایک دم بوکھلا کر وہ چیچھے کو ہٹا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی، اور فرشتے بازو چھڑاتی محمل کی طرف بھاگی، جسے آغا جان ابھی تک مار رہے تھے۔ فواد نے غصے سے حسن کو دیکھا، مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے سُجھ سخت کہتا، فضہ نے حسن کو بازو سے کھینچ کر ایک طرف کر دیا۔

”میری بہن کو چھوڑیں، ہٹیں۔“ وہ چھتی ہوئی آغا جان کا ہاتھ روکنے لگی۔ مگر انہوں نے ساتھ ہی ایک زوردار سماںچہ اس کے چہرے پہ مارا۔ فرشتے تیورا کر ایک طرف کو گری۔ منہ میز کے کونے سے لگا۔ ہونٹ کا کنارہ پھٹ گیا۔ لمحے بھر کو اس کی آنکھوں

کے سامنے اندھیرا چھایا تھا، اگلے ہی منٹ وہ خود کو سنپھال کر تیزی سے اٹھی۔

محمل اپنے بازو چہرے پر رکھے، روئی ہوئی اپنا کمزور ساوفانع کر رہی تھی۔ اب کی بار فرشتے نے آغا جان کا ہاتھ نہیں روکا، بلکہ محمل کو چھپے سے پکڑ کر کھینچا۔ محمل گھٹڑی بنی چند قدم پیچے کھینچتی گئی۔ اس کا دوپٹہ سر سے اتر کر چھپے کو ڈھلک گیا تھا، بالوں کی لشیں جوڑے سے نکل کر چہرے پر بکھر گئیں۔

اس سے پہلے کہ آغا جان اپنے اور محمل کے درمیان چند قدم کا فاصلہ عبور کر پاتے، فرشتے ان کے پیچے آ کھڑی ہوئی۔

”ہاتھ مت لگائیے میری بہن کو۔“ اپنے چھپے گھٹڑی بنی محمل کے سامنے اپنے دونوں بازو پھیلائے وہ چیخ پڑی تھی۔ ”آپ لوگ اس حد تک گر جائیں گے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیا بگاڑا ہے اس نے آپ کا؟“

”سامنے سے ہٹ جاؤ، ورنہ تم آج میرے ہاتھوں ختم ہو جاؤ گی۔“ وہ غصے سے ایک قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ فواد نے ان کا بازو ڈھام لیا۔

”آرام سے آغا جان! آپ کابی لی شوت کر جائے گا۔“ ان کو سہارا دے کر وہ زمی سے بولا تھا۔ محمل ابھی تک گھشوں پر رکھے رو رہی تھی، جبکہ فرشتے اس کے آگے اپنا بازو پھیلائے راستہ روکے کھڑی تھی۔ فواد چاہتا تو اس کو پھر پکڑ لیتا، مگر جانے کیوں وہ آغا جان کو سہارا دیئے دیں کھڑا رہا۔ اس کی طرف نہیں بڑھا۔

”میں اب محمل کو ادھر نہیں رہنے دوں گی۔ اٹھو محمل! اپنا سامان پیک کرو، اب تم میرے ساتھ رہو گی۔ چلو!“ اس نے محمل کو اٹھانا چاہا، مگر وہ ایسے ہی گری روئی جا رہی تھی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے، آپ اسے اپنے ساتھ لے گئیں تو ہم خاندان والوں کو کہیں لے کر محمل کی نام نہاد بہن اسے لے گئی اور بس؟“ محمل کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے اس کے ہاتھ ایک ٹانیے کو ٹھم گئے۔ اس نے قدرے الجھ کر سراٹھایا اور فواد کو دیکھا۔ چہرے پر چھایا غصہ آہستہ سے انجھن میں ڈھلا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلوب یہ کہ محمل تو وہ لڑکی ہے نا جو ایک رات پہلے بھی گھر سے باہر رہ چکی ہے۔ تو اس کے لئے اگر خاندان والوں کو یہ بتایا جائے کہ یہ نکاح سے پہلے کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو وہ فوراً یقین کر لیں گے نا؟“

اس کے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔

”نہیں.....“ محمل نے ترپ کر آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اوپر اٹھایا۔

”تمہارے نہیں کہنے سے یہ بدنامی مل تو نہیں جائے گی ڈیز کزن! تم اپنی بہن کے ساتھ گئیں تو ہم تمہیں پورے خاندان میں بدنام کر دیں گے۔ اور پھر یہ تمہیں کتنا عرصہ سن جائے گی؟ اس کے بعد تم کہاں جاؤ گی؟“

محمل پھٹی پھٹی نگاہوں سے فواد کا چہرہ دیکھ رہی تھی، خود فرشتے بھی سن رہ گئی۔

”اگر تم نے اس گھر سے قدم بھی نکالا تو تم بدنام ہو جاؤ گی۔ پورا خاندان تھوکے گا تم پر کہ ماں کے مرتے ہی کھلی چھوٹ.....“

”نہیں، نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ خوف زدہ سی، گھٹی گھٹی آواز میں بمشکل بول پائی۔

”یعنی تم ویسیم سے شادی کرنے پر تیار ہو۔ دیری گذ کزن؟“ وہ اسی عیاری سے مسکرا یا۔ ”اسد پچا یقیناً نکاح خواں کولاتے ہی ہوں گے۔ ویسیم کوہر ہے؟ کوئی اسے بھی بلاجے۔“

”ہرگز نہیں۔“ فرشتے نے غصے میں ترپ کر اسے دیکھا۔ ”میں محمل کی شادی تمہارے بھائی سے نہیں ہونے دوں گی۔ تم لوگ یہ سب صرف اس کی جائیداد ہتھیانے کے لئے کر رہے ہو۔ میں جانتی ہوں، تم شادی کے بعد اس سے جائیداد اپنے نام لکھوادو گے اور اسے طلاق دلا کر گھر سے نکال دو گے۔“

”ہاں بالکل، ہم یہی کریں گے۔“ وہ بہت سکون سے بولا۔ گوکہ یہ بات فرشتے نے خود کمی تھی، مگر اسے فواد سے اعتراف کی توقع نہ تھی۔ وہ اپنی جگہ ششدر رہ گئی۔

”تو تم واقعی.....“

”ہاں، ہم اسی لئے تو محمل کی شادی ویسیم سے کروانا چاہتے ہیں۔“

”فوا!“ آغا جان نے تمہیں نظر وہ سے اسے ٹوکنا چاہا۔

”مجھے بات کرنے دیں آغا جان!..... ہاں تو محمل! ہم اسی لئے تمہاری شادی ویسے کر رہے ہیں۔ تمہیں منظور ہے نا؟ کیونکہ فرشتے کے ساتھ تو تم جانہیں سکتیں۔ اب تمہیں شادی تو کرنا ہی ہوگی۔“

”نہیں، نہیں۔“ وہ بے اختیار وحشت سے چلا گی۔ ”میں نہیں کروں گی یہ شادی۔“

”محمل! تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہیں شادی کرنا پڑے گی۔“ وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا آہستہ آہستہ اسے چاروں طرف سے گھیر رہا تھا۔

”کاش! میں تمہیں بد دعاء دے سکتی، آغا فوا! مگر میں حاملین قرآن میں سے ہوں، ایسا نہیں کروں گی۔ کیا تمہیں اللہ سے ذر نہیں لگتا؟“ فرشتے نے تنفس سے اسے دیکھا۔

”میں نے کچھ غلط تھوڑی کہا ہے؟“

”تم غلط کر رہے ہو، ایک یتیم لاکی کے ساتھ۔“

”یہ تو ہم کافی سالوں سے کر رہے ہیں۔ یقین سمجھئے، ہم پر کبھی کوئی طوفان نہ نہیں آیا۔“

”تمہیں اس طوفان کی خبر تھب ہوگی، جب وہ تمہارے سر پر پہنچ چکا ہوگا۔ اللہ سے ذردو۔ تمہیں اس یتیم پر ظلم کر کے کیا ملے گا؟“

”تو آپ اس ظلم کو اپنے حق میں کیوں نہیں بدل لیتیں؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونگی۔

وہ جواب دیئے، پنا اس پر نظر ذاتِ محمل کی طرف متوجہ ہوا، جو زمین پر پیشی سراخاۓ اسے نکر نکر دیکھ رہی تھی۔

”ایک صورت میں، میں تمہاری شادی ویسے روک دوں گا، اور چاہو تو تم اپنی بہن کے مالٹھ پلی جاؤ۔ ہم خاندان والوں کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ پھر فرشتے جہاں چاہے، تمہاری شادی کروادے، ہمارا پورا خاندان شریک ہوگا۔ کیا تم وہ صورت اختیار کرنا چاہوگی؟“

محمل کے چہرے پر بے یقینی اتر آئی۔ وہ پنا پلک جھپکے فواڈ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”سدرہ! میری بیٹہ سائیڈ ٹیبل پر جو کاغذ پڑا ہے، وہ لے کر آؤ اور ساتھ پین بھی۔“
اس نے مہرین اور ندا کے ساتھ دیوار سے لگی خاموش کھڑی سدرہ کو اشارہ کیا، جو اس کی
بات سن کر سر ہلاتے ہوئے تیزی سے شریھیوں کی طرف لپکی۔

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ خطرے کا الارم دور کہیں بجتا فرشتے کو ننائی دے رہا تھا۔
”یہی کہ محمل کی شادی رک سکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ جا سکتی ہے اگر....“ اس
نے شریھیوں سے اترتی سدرہ کو دیکھا، جو بھاگتی ہوئی آئی اور اسے کاغذ قلم پکڑا دیا۔

”اگر تم دونوں یہ پیپرز سائنس کر دو۔“

”یہ کیا ہے؟“ فرشتے کا لبھہ محتاط تھا۔

”مجھے معلوم تھا کہ آپ نکاح کے وقت ڈرامہ کرنے ضرور آئیں گی۔ اسی لئے ہم
نے پہلے سے انظام کر رکھا تھا۔ آپ کو کیا لگتا ہے، ہمیں علم نہیں تھا کہ آپ محمل سے مل کر
اسے کیا پیش کر دیتی ہیں؟ ہمیں سب پتہ تھا محترم! یہ بھی کہ محمل کب کب آپ کے
کزوں سے ملتی رہی ہے۔ مگر اس وقت کے لئے ہم نے آنکھ بند رکھی۔“

”آپ کی کیا شرط ہے، وہ بات کریں۔“ وہ سرد لبھے میں بولی۔

”یہ فرشتے ابراہیم اور محمل ابراہیم کا اعلان دستبرداری ہے۔ اس گھر، فیکٹری اور آغا
ابراہیم کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے یہ دونوں بہنیں دستبرداری کا اعلان کرتی
ہیں اور ہر چیز ہمارے حوالے کرتی ہیں۔ یہ کبھی بھی ہم سے کسی بھی موروثی ملکیت سے
حصہ مانگنے نہیں آئیں گی۔ اور آپ جانتی ہیں کہ بد لے میں ہم وسیم کی شادی محمل سے
نہیں کریں گے۔ آف کورس! یہ آخری بات اس کاغذ میں نہیں لکھی گئی۔“

فرشتے کے چہرے پر پہلے انجھن اُبھری، پھر حیرت اور پھر واضح بے یقینی۔

”تم..... تم ہمیں، ہمارے حق سے، ہمارے گھر سے بے دخل کرنا چاہتے ہو؟“

”بالکل صحیح۔“

”تم ایسا کیسے کر سکتے ہو آغا فوار؟ تم.....“ اس کی بے یقینی اور تحریر غصہ میں بدل
گیا۔

”تم ہمیں ہمارے گھر سے بے دخل کیسے کر سکتے ہو؟ یہ ہمارا گھر ہے، ہمارے باپ

کا گھر ہے، اس پر ہمارا حق ہے۔ ہمیں ضرورت ہے پیسوں کی۔ محمل کی پڑھائی ہے۔ اور پھر اس کی شادی کے لئے..... ہمیں ان سب کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”یہ ہمارا دردسر نہیں ہے۔ تم یہ سائیں کر دو تو محمل کی جان و سیم سے چھوٹ جائے گی۔“

”مگر ہم تمہیں اپنا حق کیوں دیں؟“

”کیونکہ ان سب پر میرے شوہر اور بیٹوں کا حق ہے۔“ تائی مہتاب چک کر کہتی آگے بڑھیں۔ ”ابراہیم کی وفات کے وقت یہ بنس دیوالیہ ہو چکا تھا۔ میرا شوہر دن رات محنت نہ کرتا تو یہ بنس کبھی اٹھیلش نہ ہو سکتا تھا۔“

”اگر اتنے ہی مختی تھے آپ کے شوہر اور بیٹے تو میرے ابا کی ذمہ کے وقت بے روزگار کیوں پھر رہے تھے؟..... اور تم۔“ وہ فواد کی طرف پڑھی۔ ”اور وارث تو اللہ نے بنائے ہیں۔ ہم کیسے اپنا حق نہ لیں؟“

”فرشتے بی بی! یہ پر اپنی تو آپ کو چھوڑنا ہی پڑے گی۔ انہی کچھ دری میں مہمانوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ شادی والا گھر ہے، ذرا سی بات کا بیکار بن جائے گا اور بدناہی کس کی ہو گی؟ صرف محمل کی۔ اول تو اس کو وسیم سے شادی کرنی ہی پڑے گی، لیکن اگر آپ یونہی اڑی رہیں تو نحیک ہے، ہم خاندان میں کہہ دیں گے کہ محمل کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ کس کا خاندان چھوٹے گا، کس کا میکا بدناہی کے باعث چھوٹے گا، آپ خود فیصلہ کر سکتی ہیں۔“

”وہ سمجھتے کہتے ذرا دیر کور کا۔ وہ تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آن فواد! تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟“

”وہ ہولے سے مگر ادا یا۔“ ہم کوئی غلط بات تھوڑی کرو رہے ہیں؟ اپنا حق ہی مانگ رہے ہیں۔ خیر، دوسرا آپشن یہ ہے کہ آپ اور محمل اس پر دستخط کریں اور اپنے حصے سے دستبردار ہو جائیں، ہم باعزت طریقے سے شادی کینسل کر دیں گے۔ آپ محمل کو اپنے ساتھ لے جائیے گا، آپ جس سے چاہیں، جب چاہیں، اس کا نکاح کر ادیں۔ ہم بھرپور شرکت کریں گے، بلکہ پورا خاندان شرکت کرے گا۔ یہ گھر، محمل کا میکا رہے گا، وہ جب

چاہے ادھر آسکتی ہے، مگر اس کی ملکیت میں آپ دونوں میں سے کسی کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ مجھے!“ اس نے کاغذ قلم اس کے سامنے کئے۔ ”کرو مجھے سائیں۔“

”مگر فواد.....!“ آغا جان نے کچھ کہنا چاہا لیکن تائی مہتاب نے ان کا بازو تھام لیا۔

”اسے بات کرنے دیں، وہ بھیک کہہ رہا ہے۔“

”ہونہے.....“ فرشتے نے سر جھکا۔ ”آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کی اس بلیک میلنگ میں آجائیں گی؟ بلکہ آپ کوتو.....“

اس کی بات ابھی ادھوری تھی کہ اسے اپنے دائیں ہاتھ پہ دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے چوک کر دیکھا۔ محمل اس کا ہاتھ پڑ کر کھڑی ہو رہی تھی۔

اس کا کام دار دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا، بکھری بھوری لشیں گالوں کو چھوڑ رہی تھیں۔ آنسوؤں نے کابل دھوڑا لاتھا۔ وہ بہ دقت فرشتے کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز میں کچھ تھا کہ اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس سے پہلے کہ فرشتے اس کو روک پاتی، اس نے جھپٹ کر فواد کے ہاتھ سے کاغذ قلم چھینا۔

”کدر کرنے ہیں سائیں؟ بتاؤ مجھے۔“ وہ ہندیانی کیفیت میں چلائی تھی۔ فواد ذرا سا مسکرا کر اپنی انگلی کا گند پہ ایک جگہ رکھی۔

”نہیں..... محمل!“ فرشتے کو جھکا لگا تھا۔ ”ہمارے پاس کئی راستے ہیں، ہمیں ان کی بلیک میلنگ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر مجھے ہے، فرشتے! میں اب شک آپکی ہوں۔ نہیں چاہئے مجھے کوئی جائیداد، کوئی مال دولت۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ لے لیں، سب لے لیں۔“ وہ دھڑا دھڑ سائیں کرتی جا رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے برابر گر رہے تھے۔

فرشتے ساکتی اسے دیکھے گئی۔ اس نے تمام دستخط کر کے کاغذ اور قلم فواد کی طرف اچھال دیا۔

”لے لو سب کچھ۔ تم لوگوں کو اللہ سے ڈر نہیں لگتا۔ میں اب تم سے اپنا کوئی حق نہیں مانگوں گی۔ چھوڑتی ہوں میں اپنے سارے حقوق۔“ وہ کہتے کہتے ٹھہرال سی

صوفے پر گرگئی اور گہری سانسیں لینے لگی۔ وہ واقعی تھک چکی تھی، ٹوٹ چکی تھی۔

فواود نے کاغذ سیدھا کر کے دیکھا، پھر فاتحانہ مکراہٹ کے ساتھ اردو خاموش اور بے یقین بیٹھے حاضرین پر ایک نگاہ دوڑائی، پھر فرشتے کی طرف پلنا۔

”محمیل نے دستخط کر دیئے ہیں۔ اب آپ بھی کرو دیں۔“

اس نے کاغذ قلم اس کی طرف بڑھایا، مگر فرشتے نے اسے نہیں تھاما۔ وہ ابھی تک سکتے کے عالم میں محمل کو دیکھ رہی تھی۔

”دستخط کر دی بی! اور اسے لے جاؤ۔“ مہتاب تائی نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ بلایا تو وہ چونکی، پھر ناگواری سے ان کا ہاتھ ہٹایا اور فواود کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا۔

”نہیں۔ تم محمل کو نفیا تی طور پر گھیر کر بے وقوف بناسکتے ہو۔ یہ چھوٹی ہے، کم عقل ہے۔ مگر فرشتے ایسی نہیں ہے۔ میں تمہاری بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گی۔ میں ہرگز سائنس نہیں کروں گی۔ اور میں کیوں کروں سائنس؟..... مجھے ضرورت ہے اپنے حصے کی۔ مجھے یہی اچی ڈی بھی کرتا ہے۔ مجھے باہر جانا ہے، میں.....“

اس کی بات اوھوری رہ گئی۔ فواود نے کاغذ قلم میز پر پھینکا اور صوفے پر بیٹھی محمل کو گردن سے دبوچ کر اٹھایا اور اپنے سامنے ڈھال کی طرح رکھتے ہوئے جانے کہاں سے پستول نکال کر اس کی گردن پر رکھا۔

”اب بھی نہیں کرو گی تم سائنس؟“ وہ غزایا۔

فرشتے نائلے میں آگئی۔

فواود نے بازو کے حلقوں میں اس کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ وہ شاک کے باعث کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ سخت گرفت کے باعث اس کی آنکھیں اُبل کر باہر آئے گئیں۔ بے اختیار وہ کھانسی۔

”اپنی بہن سے کہو کہ شرافت سے سائز کر دے۔ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔ اور تم جانتی ہو کہ میں قانون کی بے بسی کامنہ بولتا ثبوت ہوں۔ یہی کہا تھا نام تم نے میرے بارے میں؟“ اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر اس نے بظاہر سرگوشی میں کہا۔ مگر سب کے کافلوں تک اس کی سرگوشی پہنچ گئی۔

سب کو گویا سانپ سونگھا گیا۔ حسن نے آگے بڑھنا چاہا، مگر فرشتے نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

”کیا کر رہے ہو؟ اگر اس نے گولی چلا دی تو یہ مر جائے گی۔ کیا تم یہی جانتے ہو؟“ انہوں نے بیٹھے کو گھر کا تواہ بے بسی سے کھڑا رہ گیا۔

”بولا فرشتے بی بی! تم سائنس کرو گی یا نہیں؟“

اس نے پستول کی خندھی ہالِ محمل کی گردان پر چھوٹی۔ وہ سک کر رہ گئی۔

”بولا فرشتے!“ وہ زور سے چینخا۔

”نہیں۔“ وہ جیسے ہوش میں آئی۔ ”میں سائنس نہیں کروں گی۔“ اس کا لہجہ اٹھ تھا۔

”میں تمن تک گنوں گا فرشتے! اگر میں نے گولی چلا دی تو تمہاری بہن کبھی واپس نہیں آئے گی۔“

”فرشتے پلیز!“ محمل بلک پڑی۔ ”پلیز میری خاطر فرشتے! آج آپ اپنا حق چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں، اگر ضرورت پڑی تو میں بھی آپ کے لئے اپنا حق چھوڑ دوں گی۔ آئی پر اس۔“

”نہیں۔ میں سائنس نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمن تک گنوں گا۔“

فرشتے نے دیکھا، اس کی انگلی ٹرائیگر پر مضبوط ہوئی اور وہ واقعی گولی چلانے والا تھا۔

”ایک.....“

لمحہ بھر کو اس کا دل کانپا۔ اگر وہ گولی چلا دے تو محمل مر جائے گی۔ پھر بھلے وہ جمایوں کو بلا لے، کورٹ کچھری میں گواہیاں دیتی پھرے، کچھ بھی کر لے، اس کی بہن واپس نہیں آسکے گی۔

”وو.....“

بھلے فواد کو پہنچی ہو جائے اور وہ ساری جائیداد کی مالک بن بیٹھے، اس کی بہن واپس نہیں آئے گی۔“

”تین...!“

”رکو....! میں سائن کر دوں گی۔“ وہ شکست خورده لبجے میں بولی۔ ”لیکن آپ کو محمل کی شادی اسی وقت وہاں کرنا ہوگی، جہاں میں کہوں گی۔ اور اس میں نہ صرف آپ سب بلکہ آپ کا پورا خاندان شریک ہوگا۔ محمل اسی گھر سے رخصت ہوگی۔“
”منظور ہے۔“ فواد جھٹ بولا تھا۔

محمل پھیل چکی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فرشتے کیا کہنا چاہ رہی ہے، وہ نہیں سمجھ پائی تھی۔ پھر اس نے حسن کو دیکھا، جو اسی طرح بے بس ساکھڑا تھا۔ فضہ نے سختی سے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔ بے بس اور کمزور مرد۔ وہ جو اتنے دعوے کرتا تھا، سب بے کار گئے تھے۔

”ٹھیک ہے، پھر نکاح خواں کو بلایے، میں ہمایوں کو بلا تی ہوں۔“ اس نے جھک کر میز پر رکھا موبائل اٹھایا۔

”ہمایوں..... ہمایوں داؤ؟“ فواد کو گویا کرنٹ لگا تھا۔

”جی، وہی....“ فرشتے تھی سے سکرا کر سیدھی ہوئی۔ ”بولیے، اب آپ کو یہ معافیہ قبول ہے؟“

”ہمایوں داؤ؟.... وہ اسے ایسی لی؟“

”وہ پولیس والا؟“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“

بہت سی جیران، غصیلی آوازیں اُبھری تھیں، جن میں سب سے بلند آغا جان کی تھی۔

”وہ شخص اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا، جس نے میرے بیٹے کو جیل بھجوایا تھا۔

تھیں دستخط نہیں کرنا تو نہ کرو۔ مگر میں محمل کی شادی کبھی اس سے نہیں کروں گا۔“

”میں آپ سے بات نہیں کر رہی، کریم پچا! میں یہ معافیہ آغا فواد کے ساتھ کر رہی ہوں، ان ہی کو بولنے دیجئے ہا۔“
”مگر.....“

”نہیں آغا جان! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بلایے اس کو۔ ہمیں قبول ہے۔“ وہ

سنجل چکا تھا، چہرے کی مسکراہٹ واپس آگئی تھی۔

”مگر فواد! یہ کل کو منکر گئی تو؟“ آغا جان نے پریشانی سے اس کا شانہ پکڑ کر اپنی جانب کیا۔

”یہ نہیں منکریں گی۔ یہ تو ماشاء اللہ سے مسل..... مان ہیں۔ یہ وعدے سے نہیں پھریں گی۔“ مسلمان کو توڑ کر کہتے ہوئے اس نے استہزا رسید مسکراہٹ فرشتے کی جانب اچھائی۔ وہ لب سینچنے تفری سے اسے دیکھتی رہی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ بلا یے اپنے کزن کو۔ نقشن تو آج ہونا ہی ہے۔ اسداب تک نکاح خواں کا بندوبست کر چکا ہو گا۔“ غفران چچا مصروف سے لمحے میں کہتے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی جیسے جان چھوٹ گئی تھی۔ فضہ سے بھی اپنا اطمینان و خوش چھپانی مشکل ہو رہی تھی۔ ان دونوں کو گویا اپنا بیٹا واپس مل گیا تھا، پھر بھی وہ حسن کا بازو مضبوطی سے تھا مے کھڑی تھیں۔ مگر اب شاید وہ رستی تڑا کر بھاگنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کا تو آسرائی ختم ہو گیا تھا۔

”آؤ، اندر چلو۔“ فرشتے نے تھکے تھکے انداز میں محمل کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لئے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سب گروں موڑ کر انہیں جاتا دیکھنے لگے تھے۔ پورے گھر میں عجیب سی خاموشی دوڑ گئی تھی۔



وہ سب کسی خواب کی سی کیفیت میں ہوا تھا شاید وہ ایک حسین خواب ہی تھا، جس کی تعبیر کی اسے بہت بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ بہت سارے خواب توڑنے پڑے تھے۔ مگر اسے اس وقت وہی صحیح لگا تھا۔ یہ نہ کرتی تو وہ لوگ اسے خاندان بھر میں بدنام کر دیتے۔ اس کے مرحوم ماں باپ کا نام اچھالا جاتا یا پھر سب سے بڑی وجہ وہ تھی، جو فواد کو بھی معلوم تھی اور جس کو اس نے استعمال کیا تھا۔ محمل کی ذکھتی رُگ کہ اس کا خاندان اس کو عزت سے بیاہ دے۔ اسے بولت سے زیادہ اپنا مقام اور عزت چاہئے تھی اور فواد نے اسی ذکھتی رُگ کو ایسے دبایا تھا کہ اس کا دل ترپ اٹھا تھا۔ وہ فیصلہ جذباتی تھا، مگر اسے صحیح لگا تھا۔

پھر جو بھی ہوا، جیسے نیند کی حالت میں ہوا۔ فرشتے اس کا چہرہ کلیز سے صاف کر کے بیویشن کے ساتھ اس کا دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی، پھر وہ تائی مہتاب کے زیور اتار کر اس کی ماں کے زیور پہنارہی تھی، پھر وہ اس کا میک اپ کر رہی تھی، پھر وہ اس کے سینڈل کے اسٹریپ بند کر رہی تھی، پھر وہ سکراتے ہوئے پکھے کہہ رہی تھی۔ اور پھر وہ بہت پکھے کر رہی تھی، مگر اسے آواز نہیں آ رہی تھی۔ ساری آوازیں بند ہو گئی تھیں، سارے منظر ڈھنڈلا گئے تھے۔ بس وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی بت بنی بیٹھی تھی۔

وہ خواب حسین تھا، مگر اس کا دل خالی تھا۔ سارے جذبات گویا مرے گئے تھے۔
خواہش کے جگنو کھو گئے تھے۔

یا شاید ہمیں خوشی سے محبت نہیں ہوتی، خوشی کی "خواہش" سے محبت ہوتی ہے۔
ہماری سب محبتیں "خواہشات" سے ہوتی ہیں، کبھی کسی کو پانے کی تمنا، کبھی کوئی خاص چیز حاصل کرنے کی آرزو..... شاید محبت صرف خواہش سے ہوتی ہے، چیزوں یا لوگوں سے نہیں۔

اس نے اپنی خواہش کو اپنے پہلو میں بیٹھتے دیکھا، مگر اس کا اپنا سر جھکا تھا، سوزیادہ دیکھنے پائی اور اسی جھکے سر کے ساتھ نکاح نامے پر دستخط کرتی گئی، کرتی گئی، کرتی گئی۔
جب اس کا ہاتھ قائم کر فرشتے اسے اٹھا رہی تھی تو اس نے لمحہ بھر کو اسے دیکھا، جو سامنے لب بخیچے کھڑا تھا۔ براؤں شلوار گرتے میں مبوس، سنجیدہ اور وجیہ۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اسے اس کی سنجیدگی سے خوف آیا تھا۔ کیا وہ اس پر مسلط کی گئی تھی؟ ان چاہی، بے وقت بیوی؟

اس نے بے عزتی اور تو چین محسوس کرنا چاہی، مگر دل اتنا خالی تھا کہ کوئی احساس بیدار نہ ہوا۔

ارو گردوںگ بہت پکھے کہہ رہے تھے، مگر اس کی سماعیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ سر جھکائے ہمایوں کی گاڑی کی بیک سیٹ پر بیٹھے گئی۔ اسے لگا، اب زندگی کئھن ہو گی۔ بہت کئھن!



وہ اس جہازی سائز بیڈ کے وسط میں سرگھٹنوں پر رکھے، گم صمی میٹھی تھی۔ فرشتے پکھ دری ہوئی، اسے وہاں بٹھا کر جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اور ہمایوں کو تو اس نے گاڑی سے نکل کر دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تیزی سے اندر چلا گیا تھا اور پھر دبارہ سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کے دل میں عجیب عجیب سے خیال آرہے تھے۔ وہ بار بار ”اعوذ بالله“ پڑھتی مگر دسوے سے اور وہم تنانے لگے تھے۔ شاید وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، شاید وہ اس پر مسلط کی گئی تھی۔ شاید وہ خفا تھا۔ شاید وہ اسے پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ شاید وہ بات تک نہ کرے، شاید وہ اسے چھوڑ دے، شاید وہ..... شاید۔

بہت سے شاید تھے، جن کے آگے سوالیہ نشان لگے تھے۔ بار بار وہ شاید اس کے ذہن کے پردے پر ابھرتے اور اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ وہ ہمایوں ہونے لگی تھی، جب دروازہ کھلا۔

بے اختیار سب کچھ بھلا کروہ سراخھائے دیکھنے لگی۔

وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ جانے وہ اب کیا کرے؟ وہ دروازہ بند کر کے اس کی طرف پلٹا، پھر اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ذرا سامسکرا یا۔

”السلام علیکم! کیسی ہو؟“ آگے بڑھ کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل دراز کھولی۔ وہ خاموشی سے کچھ کہئے ہنا اسے دیکھے گئی۔ وہ اب دراز میں چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا۔

”تم تھک گئی ہو گی، اتنے بڑے ٹراما سے گزری ہو۔ پریشان مت ہونا، سب تھیک ہو جائے گا۔“ وہ اب نچلے دراز میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ لہجہ متوازن تھا اور الفاظ..... الفاظ پر تو اس نے غور ہی نہیں کیا۔ وہ بس اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی، جو دراز میں ادھر ادھر حرکت کرتے یک دمڑ کے تھے اور پھر اس نے ان میں ایک میگزین پکڑے

دیکھا۔

(کیا اس میں گولیاں بھی ہیں؟ کیا یہ مجھے مار دے گا؟)

وہ عجیب سی باتیں سوچ رہی تھی۔

وہ میگر زین نکال کر سیدھا ہوا۔

”آئی ایم سوری محمل! ہمیں سب بہت جلدی میں کرنا پڑا۔ اور میں جانتا ہوں، تم اس کے لئے تیار نہیں تھیں۔“

وہ کہہ رہا تھا اور وہ سائنس روکے اس کے ہاتھ میں پکڑا میگر زین دیکھ رہی تھی۔

”میں ابھی آن ڈیوٹی ہوں اور مجھے ریڈی کے لئے کہیں جانا ہے۔ رات فرشتے تمہارے ساتھ رک جائے گی، میں پرسوں شام تک واپس آ جاؤں گا۔ تم پریشان نہ ہونا۔“

وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ عجیب شادی، عجیب سی دلہن اور عجیب سا دلہبا۔ اس کی باتیں بہت عجیب لگی تھیں۔

”تم سن رہی ہو؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھ پہ بیٹھا بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا سی چوٹی۔

”ہوں.....جی، جی۔“ بے ساختہ نگاہیں جھکالیں۔

پھر پتہ نہیں، وہ کیا کیا کہتا رہا، محمل نظریں نیچے کئے سنتی رہی۔ الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرا کر گویا واپس پلٹ رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کب خاموش ہوا، کب اٹھ کر چلا گیا، اسے تب ہوش آیا، جب پورچ سے گاڑی نکلنے کی آواز آئی۔

اس نے دیران نظروں سے کمرے کو دیکھا۔ یہی وہ کمرہ تھا جس میں کبھی ہمایوں نے اسے بند کیا تھا، تب وہ سیاہ ساڑھی میں ملبوس تھی۔

آج اس نے سرخ شلووار قمیض پہن رکھی تھی۔ عربی جوڑا، عربی زیورات۔ وہ دلہن تھی۔ اور پتہ نہیں کیسی دلہن تھی۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس کمرے میں یوں کبھی ہمایوں کی دلہن بن کر آئے گی۔ ہاں، فواد کے خواب اس نے دیکھے تھے، مگر وہ اس کے دل کا ایک چھپا ہوار از تھا، جس کی خبر شاید خود فواد کو بھی نہ تھی۔

”اور حسن؟“ اندر سے کسی نے سرگوشی کی۔

حسن کے لئے اس کے دل میں کبھی کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا۔ اور اچھا ہی ہوا۔ شام کو جب فواد نے اس کے نام کے ساتھ ہمایوں کا نام لیا تو کیسے وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔ وہ جو ہر موقع پر محمل کے حق کے لئے بولتا تھا، لڑتا تھا، اتنے اہم موقع پر یوں کیوں پیچھے ہو گیا تھا؟ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ اور فرشتے، اس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی اس کے لئے۔ وہ کبھی بھی اس کا احسان نہیں اتنا سکتی، وہ جانتی تھی۔ اس نے اپنا حق چھوڑ دیا، کاش فرشتے بھی بھی اسے موقع دے اور وہ اس کے لئے اپنا حق چھوڑ سکے۔

اس نے تھک کر سر بیڈ کراؤن سے نکلا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کا دل اداں تھا، روح بوجھل تھی۔ اب اسے راحت چاہئے تھی، سکون چاہئے تھا۔ اپنے خاندان والوں کی قید سے نکلنے کے احساس کو محسوس کرنے کی جس چاہئے تھی۔ اسے غم سے نجات چاہئے تھی۔ اس نے ہولے سے لبوں کو حرکت دی اور آنکھیں موندے دھیمی آواز میں دعا مانگنے لگی۔

”یا اللہ! میں آپ کی بندی ہوں اور آپ کے بندے کی بیٹی ہوں۔ اور آپ کی بندی کی بیٹی ہوں۔ میری پیشانی آپ کے قابو میں ہے، میرے حق میں آپ کا حکم جاری ہے، آپ کا فیصلہ میرے بارے میں انصاف پر بنی ہے۔ میں آپ سے سوال کرتی ہوں، آپ کے ہر اس نام کے داسطے سے جو آپ نے اپنے لئے پسند کیا یا اپنی کتاب میں اتنا رہا، یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا یا اپنے علم غیب میں آپ نے اس کو اختیار کر رکھا ہے، اس بات کو کہ آپ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار اور میری آنکھوں کا نور بنادیں اور میرے فکر اور غم کو لے جانے کا ذریعہ بنادیں۔“

وہ دعا کے الفاظ بار بار دہراتی گئی، یہاں تک کہ دل میں سکون اترتا گیا۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں اور وہ نیند میں ڈوب گئی۔



وہ دو دن فرشتے اس کے ساتھ رہی۔ ان دونوں میں انہوں نے بہت سی باتیں کیں، سوائے شام کے ڈرامے کے۔ وہ ایسا موضوع تھا کہ دونوں ہی کسی خاموش

معاہدے کے تحت اس سے اخراج برداشت رہی تھیں۔

فرشتے نے اسے بہت کچھ بتایا۔ ابا کے بارے میں، اپنی ماں کے بارے میں، ہمایوں کی ای کے بارے میں، اپنی زندگی، گھر اور پرانی یادوں کے بارے میں۔ وہ دونوں چائے کے مگ تھامے گھنٹوں لان میں بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔ چائے خندی ہو جاتی، شامِ دھل جاتی، مگر ان کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔

”پتہ ہے محمل! ادھر لان میں.....“ وہ دونوں برآمدے کی سیر ہیوں پر بیٹھی تھیں، چائے کے مگ ہاتھ میں تھے، جب فرشتے نے بازوں لمبا کر کے انگلی سے سامنے اشارہ کیا۔ ”وہاں ایک جھولا تھا، بالکل کونے میں۔“

محمل گردن موڑ کر وہاں دیکھنے لگی، جہاں اب صرف گھاس اور کیاریاں تھیں۔

”ہم بچپن میں اس جھولے پر بہت کھلتے تھے اور اس کے اس طرف طوطوں کا چنگرہ تھا۔ ایک طوطا میرا تھا اور ایک ہمایوں کا۔ اگر میرا طوطا اس کی ڈالی گئی چوری کھا لیتا تو ہمایوں بہت لڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اتنا غصے والا تھا، مگر غصہ خندنا ہو جائے تو اس سے بڑھ کر لوگ اور کیرنگ بھی کوئی نہیں ہے۔“

محمل مدھم مسکراہٹ لئے سر جھکائے سن رہی تھی۔

”جب میں بارہ سال کی ہوئی تو ابا نے مجھ سے پوچھا کہ میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں یا اماں کے ساتھ؟ میں وقتی طور پر ابا کے ساتھ جانے کے لئے راضی ہو گئی، مگر اس دن ہمایوں مجھ سے بہت لڑا۔ اس نے اتنا ہنگامہ چھایا کہ میں نے فیصلہ بدل دیا۔“ چائے کا مگ اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور وہ کہیں دور کھوئی ہوئی تھی۔

”پھر جب ہم بڑے ہوئے اور میں نے قرآن پڑھا تو ہمایوں سے ذرا دور رہنے لگی۔ وہ خود بھی سمجھ دار تھا، مجھے زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتا تھا۔ پھر میری اماں کی ڈیتھر ہوئی تو.....“

دفعۃ گاڑی کا ہارن بجا۔ وہ دونوں چونک کر اس طرف دیکھنے لگیں۔ انگلے ہی لمحے گیٹ کھلا اور زن سے سیاہ گاڑی اندر داخل ہوئی۔

”چلو، تمہارا میاں آگیا۔ تم اپنا گھر سنپھالو۔ میں اپنا سامان پیک کر لوں۔“ وہ نہیں

کر کہتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

محمل متذبذب سی بیٹھی رہ گئی۔ وہ گاڑی سے نکل کر اس کی طرف آ رہا تھا۔ یونیفارم میں لمبیں، کیپ ہاتھ میں لئے تھا تھکا سان۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

”تو تم میرے انتظار میں بیٹھی ہو، ہوں؟“ وہ مسکرا کر کہتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو وہ گزبردا کر کھڑی ہو گئی۔ گلبی شلوار قمیض پہ بھورے بالوں کی اوپنجی پونی ٹیل بنائے وہ اُس شام کا حصہ لگ رہی تھی۔

”وہ میں.....“

”کہہ دو کہ تم میرا انتظار نہیں کر رہی تھیں۔“

”نہیں۔ وہ..... چاۓ لاوں؟“

”اوہ ہوں، یہی کافی ہے۔“ اس نے محمل کے ہاتھ سے گک لیا۔ ایک گھونٹ بھرا اور گک لئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر جاتے جاتے پلٹا۔ ”فرشتے ہے؟“

”جی، وہ اندر ہیں۔“

”اوے کے۔ میں شناور لے کر کھانا کھاؤں گا، تم ٹیبل لگا دو۔“ وہ کہہ کر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

وہ چند لمحے خاموش کھڑی کھلنے دروازے کو دیکھتی رہی۔ وہ دروازہ بند کر کے نہیں گیا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اندر آ جائے؟ پہلے بھی تو وہ بغیر اجازت اس کی زندگی میں داخل کر دی گئی تھی۔ اب بھی چلی جائے تو کیا مفائد ہے؟
اس نے تیغ سے سر جھکا اور کھلنے دروازے سے اندر چلی آئی۔

لاڈنچ کے بڑے پیڑھیوں کے قریب فرشتے اور ہمایوں کھڑے تھے۔ وہ اپنے بیک کا ہینڈل تھا مے، سیاہ جماب چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے انگلی سے ٹھوڑی کے نیچے اُس رہی تھی۔

”نہیں بس، اب میں چلتی ہوں۔ کل مجھے کلاس لئنی ہے۔“

”کم از کم کچھ دن تو تمہیں ادھر رہنا چاہئے۔“

وہ دونوں باتمن کر رہے تھے۔ ان کی آواز بے حد مددم تھی۔ محمل کو اپنا آپ ادھر بے

کار لگا تو وہ سر جھکائے پکن میں چلی آئی۔ -

بلقیس جا چکی تھی۔ پکن صاف سحر اپڑا تھا۔ اس نے چولہا جلایا اور کھانا گرم کرنے لگی۔ شاید وہ بھی اس گھر میں بلقیس کی طرح تھی۔ ایک نوکرانی۔

”محمل!“ فرشتے نے کھلے دروازے سے جھانکا۔ محمل نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ وہ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

”آپ مت جائیں فرشتے! پلیز۔“ وہ بے اختیار رواہنسی سی ہو کر اس کے قریب آئی۔

”اوہ، میرا کزن بہت اچھا انسان ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو پاگل!“ اس نے ہولے سے اس کا گال تھپٹھپایا۔ محمل چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر یا کیک اس کی بھوری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وہ جھک کر چولہے کو تیز کرنے لگی۔

”محمل! کیا ہوا ہے؟ تم مجھے پریشان لگ رہی ہو؟“ وہ ذرا فکر مند سی اس کے پیچھے آئی۔ محمل کی اس کی طرف پیٹھے تھی، فرشتے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”کسی کی شادی ایسے بھی ہوتی ہے، جیسے میری ہوئی؟“ بہت دری بعد وہ بولی تو آواز میں صدیوں کی یاس تھی۔ فرشتے کچھ نہ بولی تو وہ پلٹی۔

فرشتے بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا، اس نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔ ”کیا؟“ وہ گز بڑا گئی۔

”محمل! تم.....“ حیرت کی جگہ خفگی نے لے لی۔

”کیا ہوا؟“

”تم بہت..... بہت ناشرکی ہو محمل!..... بہت زیادہ۔“ وہ جیسے غصہ خبط کرتے ہوئے تیزی سے مڑ گئی۔

”فرشتے! رکیں۔“ محمل بوکھلا کر اس کے پیچے لگی۔ وہ تیزی سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے اسے بازو سے تھاما تو وہ رک گئی، چند لمحے کھڑی رہی، پھر گبری سانس لے کر اس کی طرف گھومی۔

”تمہیں ہمیوں مل گیا محمل! تم اب بھی ناخوش ہو؟“ وہ بہت دمکھی سی ہو کر بولی تھی۔

محمٰل نے بے چینی سے لب کچلا۔ فرشتے اسے غلط سمجھ رہی تھی۔

”نہیں، میں صرف اس خوشی کو محسوس کرنا.....“

”جسٹ اسٹاپ ایٹ!“ وہ بہت خفا تھی۔ محمٰل چپ سی ہو گئی۔ چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی حاکل رہی، پھر فرشتے نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور اسے اپنے بالکل سامنے کیا۔

”تم واقعی ناخوش ہو؟“

”نہیں۔ مگر اس سب سے میرا دل کٹ کر رہ گیا ہے۔“

”لوگوں کی روح تک کٹ جاتی ہے محمٰل! سب قربان ہو جاتا ہے، وہ پھر بھی راضی ہوتے ہیں۔ اور تم..... تم اب بھی شکر نہیں کرتیں؟“ اس کی سنہری آنکھوں میں سرخ سی نی اُبھری تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک محمٰل کے کندھوں پر تھے۔

”نہیں، میں بہت شکر کرتی ہوں، مگر..... مگر بس سب کچھ بہت عجیب لگ رہا ہے،

جیسے.....“

”بس کرو محمٰل!“ اس نے تاسف سے سر جھٹک کر اپنے ہاتھ ہٹائے اور تیزی سے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسے یونہی شک سا گزر را کہ وہ رود رہی تھی۔

وہ دل مسوں کر رہ گئی۔ اس نے شاید فرشتے کو ناراض کر دیا تھا۔ لیکن وہ ٹھیک کہتی تھی، وہ واقعی ناشکری کر رہی تھی۔ صرف زبان سے الحمد للہ کہنا کافی نہیں ہوتا، اصل انہمار تو رو قیے سے ہوتا ہے۔

”کدر گم ہو؟“

آواز پر وہ چوٹی۔ ہمایوں سامنے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جھجک سی گئی۔

”فرشتے چلی گئی؟“ وہ کاؤنٹر سے ہٹ کر فرجع کی طرف بڑھا اور اسے کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔

”می۔“

”فرشتے۔ بہت اچھی ہے وہ۔ ہے نا؟“ اس نے ڈھکن کھول کر بوتل منہ سے

لگائی۔

”بیٹھ کر پیس پلیز؟“ وہ خود کو کہنے سے روک نہ سکی۔ وہ پھر منہ سے ہٹا کر نہ دیا۔

”فرشتے نے تمہیں بھی اچھی لڑکی بنا دیا ہے۔“

”تو کیا پہلے میں بری تھی؟“ وہ برا مان گئی۔

”ارے نہیں، تم تو ہمیشہ سے اچھی تھیں۔“ مسکرا کر کہتے اس نے پھر بوٹل بوس سے لگائی۔ محمل نے دیکھا، وہ بیٹھا نہیں تھا، اب بھی کھڑا ہو کر پی رہا تھا۔ خود کو بدلتا بھی آسان نہیں ہوتا۔ مگر دوسرے کو بدلتا بہت بھی کٹھن ہوتا ہے۔

”اچھا یہ بتاؤ، تمہارا دل کیوں کٹ کر رہ گیا؟“

”آف!“ وہ بری طرح چوٹکی۔ وہ تو شادر لینے گیا تھا۔ کب آکر سب سن گیا، اسے تو پتہ ہی نہ چلا تھا۔

”وہ، دراصل...“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ”مگر سے کسی نے کال نہیں کی تو میں...“

”وہ کیوں کریں گے کال؟ ان کی اس شادی میں مرضی شامل نہیں تھی۔ فرشتے نے بہت مشکل سے انہیں راضی کیا تھا۔ وہ اس بات پر ابھی تک غصہ ہیں، آئی تھنک۔“

”وہ یکدم تھنک گئی۔“

”فرشتے نے.....“ اس نے قفرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اس نے کتنی مشکل سے ان کو راضی کیا..... تم جانتی ہو۔“ وہ پھر بوٹل سے گھونٹ مجرر رہا تھا۔

وہ دم بخودی اسے دیکھیے گئی۔ کیا وہ کچھ نہیں جادا؟ اسے نہیں معلوم کہ کیسے ان دونوں نے فواد کے دیے کاغذ پر دستخط کئے تھے؟ فرشتے نے اسے کچھ نہیں بتایا؟ مگر کیوں؟

”تم فکر مت کرو۔ ہم نے یہ شادی ان سے زبردستی کر دیئی ہے۔ ان کو کچھ عرصہ نا راض رہنے دو۔ ڈونٹ وری۔“

تو وہ واقعی کچھ نہیں جانتا۔ وہ بتائے یا نہیں؟ اس نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا۔ اگر فرشتے نے کچھ نہیں بتایا تو وہ کیوں بتائے؟ چھوڑو، جانے دو۔

”صرف ان کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے یا آپ کے ساتھ بھی؟“

”تو تم اس لئے پریشان تھیں؟“ اس نے مسکرا کر سر جھکا۔ ”تمہیں لگتا ہے، کوئی ہمایوں داؤ د کو مجبور کر سکتا ہے؟“

”مجبوراً قائل تو کر سکتا ہے۔“

”نہیں کر سکتا۔ قطعاً نہیں۔“

”پھر آپ نے..... آپ نے کیوں شادی کی مجھ سے؟“

”اگر تم چاہتی ہو کہ میں یہ کہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ، تو میں ایسا نہیں کہوں گا۔ کیونکہ واقعی مجھے تم سے کوئی طوفانی قسم کی محبت نہیں تھی۔ ہاں، تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں نے اپنی مرضی سے تم سے شادی کی ہے۔ اور میں اس فیصلے پر بہت خوش ہوں۔“

اس کا انداز اتنا زم تھا کہ وہ آہستہ سے مسکرا دی۔ دل پر لدا بوجھ پلا کا ہو گیا۔

”یعنی آپ خوش ہیں؟“

”آف کورس محمل! ہر بندہ اپنی شادی پر خوش ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر میں بہت پریکشیکل انسان ہوں۔ لمبی بات نہیں کرتا اور مجھے بے کار کی مبالغہ آرائی نہیں پسند۔ میں کوئی دعویٰ کروں گا، نہ وعدہ۔ یہ تم وقت کے ساتھ دیکھ لو گی کہ تم اس گھر میں خوش رہو گی۔“

وہ جیسے کھل کر مسکرا دی۔ اطمینان اور سکون اس کے رُگ و پے میں دوڑ گیا تھا۔

”تم اس پر کچھ نہیں کہو گی؟“

”میں کیا کہوں؟“

”میں بتاؤں؟“

”مجی بتائیے۔“ وہ بہت دھیان سے متوجہ ہوئی۔

”سالن جمل رہا ہے۔“

”اوہ!“ وہ بوکھلا کر پڑی۔ دیپنگی میں سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ مدھم سی جلنے کی نوجی سارے میں پھیل رہی تھی۔ اس نے جلدی سے چولہا بند کیا۔

”ویکلم نو پر یکینیکل لاکف۔“ وہ مسکرا کر کہتا باہر نکل گیا۔ وہ گہری سائنس لے کر دیپنگی کی طرف متوجہ ہوئی۔

سالن جل گیا تھا، مگر اس کے اندر ہر سو بہار چھا گئی تھی۔ وہ مسکراہٹ دبائے دیپنگی اٹھا کر سنک کی طرف بڑھ گئی۔



”محمّل!..... محمل!“ وہ نیچے لاڈنخ میں کھڑا سرا اٹھائے مسلسل اسے آوازیں دے رہا تھا۔ ”جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔“

”آ رہی ہوں۔ بس ایک منٹ۔“ اس نے ڈرینگ نیبل سے لپ گلوس اٹھایا اور سامنے آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے لپ اسٹک پہ لگایا، لپ اسٹک چمک اٹھی تھی۔ ”محمل!“ وہ پھر چلا یا تھا۔

”بس آ گئی۔“ اس نے ایک عجلت بھری نگاہ سنگھار میز کے آئینے میں جھلکتے اپنے وجود پر ڈالی۔ ٹی پنک بیماری سازی میں ملبوس، لمبے سیدھے بال کمر پر گرانے، کافنوں میں چمکتے ڈامنڈ کے ایز رنگز، کرون سے چپکا نازک ہیروں کا سیٹ، جو ہمایوں نے اسے تیمور کی پیدائش پر دیا تھا اور کلائی میں داسٹ گولڈ کے موٹی جڑے لکھن، ساتھ مناسب سامیک اپ۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ بیٹھ پڑی تیمور کو اٹھایا اور باہر نکل آئی۔

”تم اتنی دیر کر رہی ہو، کیا ارادہ بدلتے گیا ہے؟“ آخری فقرہ کہتے وہ زیر لب مسکرا یا۔ وہ جو تیمور کو اٹھائے کج کچ سیڑھیاں اُتر رہی تھی، مسکرا اٹھی۔

”ہرگز نہیں۔ آخر کو اپنے میکے جا رہی ہوں، ارادہ کیوں بدلوں گی؟“ وہ سیڑھیاں اُتر آئی۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ بلیک ڈر سوت میں ملبوس، بالوں کو جیل سے پیچھے کئے، وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔

”اچھے لگ رہے ہیں۔“

”تم بھی!“

”بس اتنی تعریف؟“ اس کا چہرہ اُتر گیا۔

”شادی کے ایک سال بعد اب میں اور کیا کھوئی؟“ وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے تھے۔

”ایک سال گزر گیا ہمایوں! پتہ ہی نہیں چلا۔ ہے نا؟“ وہ فرنٹ ڈر کھولتے ہوئے کہیں کھوئی گئی تھی۔

”ہاں، وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے۔“ وہ گاڑی سڑک پر ڈال کر بہت دیر بعد بولا تھا۔ ”یوں لگتا ہے، جیسے کل ہی کی بات ہے۔“

”ہوں۔“ محمل نے سیٹ کی پشت سے سر نکلا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

ایک سال گزر بھی گیا، یوں جیسے پتہ ہی نہ چلا ہو۔ پورے ایک برس پہلے وہ بیاہ کر اس گھر سے اور ہر آئی تھی، آج ایک برس بعد ہمایوں نے شادی کی ساگرہ پر اسے اسی گھر لے جانے کا تھفا دیا تھا۔

پورا سال نہ انہوں نے اس کی خبر گیری کی، نہ ہی محمل نے کوئی فون کیا۔ شروع میں اسے غصہ تھا، پھر آہستہ آہستہ وہ غم میں ڈھل گیا اور اب..... اب اسے اپنے فرانچس یاد آئے۔ صدر رحمی کے احکامات یاد آئے تو اس نے تہیہ کر لیا کہ اپنے رشتہ داروں سے پھر سے تعلق جوڑے گی۔ پہلے بھی یہ خیال کئی بار آیا، مگر ہمایوں جانے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ فواد کا کیس اندر ہی اندر دبتا گیا اور پھر ہمایوں نے ہی ایک دن اسے بتایا کہ فواد ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ شاید آشر یلیا۔ وہ بھی کسی حد تک سکون میں آگئی۔ نہ جانے کیوں۔

ہفتہ پہلے ہمایوں کو کسی جگہ آغا کریم ملے۔ اس نے محمل کو بتایا کہ وہ بہت خوش دلی سے ملے اور اسے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ منافقت، دنیا داری اور پھر اب وہ کس چیز کا بغرض چہروں پر سجائے رکھتے؟ فواد تو باہر چلا گیا اور جائیداد نہیں مل گئی، پھر ہمایوں داؤ دیجیے بندے کو داما د کہنے میں کیا مفہاٹ تھا؟ بلکہ فخر ہی تھا۔

ایک تبدیلی اور بھی آئی تھی۔ فرشتے اسکات لینڈ چلی گئی تھی۔ اسے پی ایچ ڈی کرنا تھی۔ خوب سارا علم حاصل کرنا تھا۔ پھر اس کا تحسیز اور..... بہت کچھ۔ وہ چلی گئی تو مسجد

میں اس کی جگہ کسی اور نے لے لی۔

اور وہی محمل، تو وہ آج بھی تیمور کو لے کر مجرکی نماز کے ساتھ ہی مسجد جاتی تھی۔ اس کے علم الکتاب کا ابھی آدم حساسال رہتا تھا۔

گاڑی رکی تو وہ چونکہ کر حال میں آئی۔ وہ آغا ہاؤس کے پورچ میں موجود تھی۔ وہ تیمور کو اٹھائے باہر نہیں اور گم حرمی اور گرد نگاہ دوڑا تھی۔

لان کے کونے میں صنوئی آبشار بن چکی تھی، مگر کا پینٹ بدلتا تھا، پورچ کے ہنڑ بھی نئے اور قائم تھے۔

لاؤخ کے دروازے پر مہتاب تائی اور آغا جان کھڑے تھے۔ محمل اور ہمایوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر جیسے گھری سانس لے کر ان کی طرف بڑھے۔ شال اس نے ایک کندھے پر ڈال لی تھی۔ بھروسے سفید بال دونوں کافنوں کے پیچے اڑتے تھے۔ پورچ کی مدھم لائٹ میں بھی اس کے ڈامنڈز سینٹ کے جگر جگر کرتے ہیرے چمکتے تھے۔ ”محمل! یہ تم ہو؟..... کسی ہو؟“ مہتاب تائی پر تپاک استقبال کے ساتھ آگے پیسی تھیں۔

”محمل! میری بیٹی.....“ آغا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ہس کی آنکھوں کے گوشے بیکنے لگے۔ شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے اس کے ساتھ کتنا علم کیا۔

دونوں چیاں اور دوسری لاکیاں بھی دہیں آگئیں۔ وہ ان کے ساتھ ان کے سوالوں کے جواب دیتی احمد رآئی تھی۔

ایک تو ہمایوں کی شان دار پرنسالشی، اوپر سے محمل کا بدلا، سجا شورا، دولت اور آسائشوں کی فرادتی ظاہر کرتا سراپا۔ خصہ نے تو ازی بیٹھے انداز میں تعریف کی، البتہ ہمر کے ماتحت کے بلوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی جلن چھپانہ پار ہی تھیں۔

لاؤخ کا بھی ہلیہ بدلا ہوا تھا۔ یعنی فانوس، پودے، بیش قیمت ڈیکوریشن پیز، کچھ کر پہلے بھی وہاں ہر جز قیمتی ہوتی تھی، مگر اب تو جیسے پیسے کی ریل ہیل ہو گئی تھی۔ ایک

ایک کونہ چک رہا تھا۔ شاید اب انہیں کھلا اختیار جوں گیا تھا۔

”سدرہ بائی کدھر ہیں؟..... اور آرزو؟“ صوفی پہ بیٹھتے ہوئے اس نے متلاشی نگاہ ادھر دوڑائی۔

”سدرہ کی تو دبیر میں شادی ہو گئی، وہ کینیڈا جلی گئی۔“ تائی مہتاب نے ختر سے عطا یا۔ چھرے پہ اسے نہ بلانے کی کوئی نہامت نہ تھی۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب کر آبھرا۔ وہ غلط تھی، ان کو کوئی شرمندگی نہ تھی بلکہ رشتہوں کی بے پناہ بارش نے انہیں حرید مغرب دکر ڈالا تھا۔

”مہرین کا نکاح پچھلے ماہ ہوا ہے۔ لڑکا ڈاکٹر ہے، انگلینڈ میں ہوتا ہے۔ اسی سال شادی کریں گے۔“

”اچھا..... ماشاء اللہ!“ وہ دل سے خوش ہوئی۔ مگر انہیں بہر حال تھی۔ انہوں نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا، پھر بھی ان کی خوشیوں میں اضافہ کیوں ہوتا چلا گیا؟

”ندا کی بھی منگنی ہو گئی۔“ فضہ چجی کیوں بیچپے رہتیں۔ ”وہ بھی ڈاکٹر سے سعودیہ کی رائل فیملی کے ڈاکٹرز میں سے ہے۔ سامیہ کی بھی آج کل بات چل رہی ہے۔“

”اور آرزو؟“ یونہی اس کے لیوں سے پھسل پڑا۔ نگاہ سب سے الگ بیٹھی تھیہ ہمہ چجی پہ جا پڑی۔ ان کی کوفت میں جیسے اضافہ ہوا تھا۔

”رشتوں کی لائی گئی ہے میری بیٹی کے لئے، ہر دوسرے دن کی شہزادے کا رشتہ آ جاتا ہے۔“ وہ ہاتھ پھا کر بہت چمک کر بولی تھیں۔

”مگر وہ مانے بھی تو۔“ فضہ چجی نے دسمی سرگوشی کی، آواز یقینہ تھامہ چجی تک نہیں گئی تھی۔ مخاطب محمل ہی تھی، جو سن کر ذرا سی چوکی تو فضہ چجی معنی خنز اندماز میں مسکرائیں۔

”آرزو بائی کدھر ہیں؟ نظر نہیں آ رہیں۔“ اس نے دوسری دفعہ پوچھا تو تھامہ چجی انہیں اور پیر پختی ہوئی دہاں سے نکل گئیں۔

”انہیں کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے تائی مہتاب کو دیکھا، جنہوں نے استہزا سے مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا۔

”بیٹی کا دل آگیا کسی پہ، اب مان کے نہیں دے رہی۔“

”اچھا!“ اسے حیرت ہوئی۔ اسی بیل سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کوئی رکا۔ آہٹ
پھمل نے نگاہ اٹھائی اور پھر بے اختیار شال کا پتو سر پر ڈال لیا۔

حسن مبہوت سا اوہر کھڑا تھا۔ کف کا بٹن بند کرتے اس کے ہاتھ وہیں رک گئے
تھے۔

”السلام علیکم حسن بھائی؟“ وہ خوش دلی سے مسکرائی تو وہ چونکا۔ پھر سر جھٹک کر آخری
زینہ اُترा۔

”علیکم السلام! کیسی ہو محمل؟ کب آئیں؟“ وہ ان کی طرف چلا آیا تھا۔ ”یہ
تمہارا..... بیٹا ہے یا بیٹی؟“
”بیٹا ہے، تیمور۔“

اس نے جھٹک کر تیمور کو پیار کیا، پھر سیدھا ہوا۔

”اکیلی آئی ہو؟“

”ارے نہیں، ہمایوں اس کے ساتھ آیا ہے۔ تمہارے آغا جان کے ساتھ ذرا سُک روم
میں بیٹھا ہے۔ جاؤ، مل لو۔“ تالی مہتاب کے کہنے پر وہ سر ہلاتا ذرا سُک روم کی طرف بڑھ
گیا۔

”حسن بھائی کی کہیں متفقی وغیرہ نہیں کی چیزیں؟“ وہ سادہ سے لبجے میں فضہ سے
مخاطب ہوئی۔ اسے لگا، وہ اس کا جوگ لئے ابھی تک بیٹھا ہو گا۔

”ارے نہیں۔ حسن کی تو شادی بھی ہو گئی۔ میری بھانجی طلعت یاد ہے ہے تمہیں؟ اسی
سے۔ آج کل وہ میکے گئی ہوئی ہے۔ سامیہ!..... سامیہ!“ انہوں نے بیٹی کو پکارا۔ ”جاؤ
حسن کی شادی کا الہم لے آؤ۔“

محمل کو داقعہ جھٹکا لگا تھا، مگر پھر سنپھل گئی۔ وہ جوگ لینے والا بندہ تو نہ تھا۔ کنز و مرد
جو کبھی اس کے لئے مضبوط سہارا نہ بن سکتا تھا۔ لیکن بھلا اسے اس کا سہارا چاہئے بھی
کیوں تھا؟ کبھی بھی نہیں۔ اس کی تو حسن کے ساتھ کبھی بھی کوئی جذباتی وابستگی نہ رہی
تھی، سو افسوس بھی نہ تھا۔

پھر انہوں نے اسے حسن اور سدرہ کی شادیوں کے الہم دکھائے۔ وہ تو سجاوٹ اور

رہوم دھام دیکھ کر حق وق رہ گئی۔ ڈلہنوں کے عروی لباس اور زیورات تو ایک طرف، بھض ایونٹ ڈیر انگ پ پیسہ پانی کی طرح لٹایا گیا تھا۔ انہیں محمل نے وہ سب کچھ خود دیا تھا، اب بھلا وہ کیوں اس کا پُرپُتیاں استقبال نہ کرتے؟

ڈزر بہت پُر تکلف تھا۔ آغا جان اور ہمایوں کے انداز سے لگ رہا تھا، ان کی گہری دوستی رہی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا، کبھی آغا جان اس شخص کا نام نہیں سن سکتے تھے۔

بس اس کے ایک دستخط نے ساری دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ پھر بھی وہ خوش تھی۔ اسے میکے کا مان جو مل گیا تھا، چاہے منافقت کا ملمع اوڑھے، جھوٹا ہی سمجھی، مگر مان تو تھانا۔

بس چند لمحوں کے لئے وہ تیمور کا بیگ لینے گاڑی تک آئی تھی اور تب اس نے لان میں کرسی پ پیشی آرزو کو دیکھا تورک گئی۔ وہ بھی اسے دیکھ بھی تھی، سوتیزی سے اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”بہت خوب مسز ہمایوں! خوب عیش کر رہی ہو۔“

اس کے قریب سینے پ پازو لپیٹے کھڑی، وہ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے بہت ٹھر سے بولی تھی۔ اس نے بمشکل خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔

”اللہ کا کرم ہے آرزو بآجی! درندہ میں اس قابل کہاں تھی؟“

”قابل تو تم خیراب بھی نہیں ہو۔ یہ تو اپنی اپنی چالاکی کی بات ہوتی ہے۔“

”مجھے چالاکیاں آتی ہوتیں تو اس گھر سے ایسے ہی رخصت ہوتی، جیسے سدرہ بائی ہوئیں۔“

”اوہ ڈونٹ پر یئنڈ ٹولی انویسٹ۔“ (زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو) وہ تیزی سے جھڑک کر بولی۔ ”تم جانتی تھیں کہ ہمایوں صرف اور صرف میرا ہے، پھر بھی تم نے اس سے شادی کی۔ تمہیں لگتا ہے، میں تمہیں یونہی چھوڑ دوں گی؟“

”یہ ہمایوں آپ کے کب سے ہو گئے آرزو بآجی؟ نام تک تو آپ ان کا جانتی نہیں تھیں۔ وہ بھی مجھ سے ہی پوچھا تھا۔“

”اپنی چھوٹی سی عقل پ پزیا۔ زور نہ دو محمل ڈیر!“ اس نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی انٹھائی۔ ”اور یاد رکھنا، آرزو! یک دفعہ کسی کو چاہ لے تو اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتی

ہے۔“

”کیوں؟..... آرزو خدا ہے کیا؟“ اس کے اندر غصہ اپلا تھا۔ بے اختیار اس نے اپنی ٹھوڑی تسلی اس کی انگلی ہٹائی۔

”یہ تو تمہیں وقت بتائے گا کہ کون خدا ہے اور کون نہیں۔“ وہ تشریف انداز میں کہتی مڑی اور بے لبے ڈگ بھرتی اندر چلی گئی۔

”عجیب لڑکی ہے یہ، کسی کے شوہر پر حق جماری ہے۔ اونہہ! وہ غم و غصے سے کھولنے ہوئے واپس اندر آگئی۔



”یہ تمہاری کزن آرزو..... اس کے ساتھ کوئی دماغی مسئلہ ہے کیا؟“ واپسی پر ڈرائیور کرتے ہوئے ہمایوں نے پوچھا تھا۔ وہ بری طرح چونگی۔

”کیوں، کچھ کہا اس نے؟“ اس کا دل ایک دم ڈر سا گیا۔

”ہاں، عجیب سی باتیں کر رہی تھی۔“

”آپ کو کب تھی؟ لا دنخ میں تو آئی ہی نہیں۔“

”پتا نہیں، عجیب طریقے سے سب مردوں کے درمیان آ کر بیٹھ گئی اور مجھ سے پے درپے سوالات شروع کر دیئے۔ بہت آکر ڈالگ رہا تھا، مگر اس کے باپ کو تو فرق ہی نہیں پڑا۔“

”پھر؟“ وہ دم بخودی سن رہی تھی۔

”پھر حسن کو برالگا اور اس نے اسے جھڑکا کہ اندر جاؤ۔ بٹشی واڑ لائیک کر کے تمہاری نوکر ہوں جو اندر چاؤ۔“ عجیب سی پھوٹش بن گئی تھی۔ میں تو فون کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔ واپس آیا تو وہ نہیں تھی۔ کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟“

”پتا نہیں۔“ وہ لب کچل کر رہی گئی۔

”ایک بات کہوں محمل!“

”ہوں، کہئے۔“

”تم یہ مت سمجھنا کہ میں لاپچی ہوں۔ مگر حق، حق ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا، وہ لوگ

کس طرح تمہاری جائیداد پر عیش کر رہے ہیں۔ تمہیں ان سے اپنا حصہ مانگنا چاہئے۔“
”رہنے دیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ہمایوں شانے
اچکا کر ڈرائیو کرنے لگا۔

وہ ہمایوں کو کیسے بتاتی کہ اس کے لئے وہ اپنا حق بہت پہلے ہی چھوڑ چکی ہے۔ اگر
فرشتے نے چھپایا تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

وہ اندر سے ایک دم ہی بہت افرادہ ہو گئی تھی۔ سو بیک میں رکھا چھونا قرآن نکالا،
جس کے سفید کور پر ”م“ لکھا تھا۔

میں نے یہ اوہر کیوں لکھا ہے؟ وہ ہر دفعہ قرآن کھولنے پر اپنا لکھا ”م“ پڑھ کر سوچتی
اور پھر یاد نہ آنے پر شانے اچکا کر آگے پڑھنے لگتی۔

اس نے صبح کی تلاوت پر لگائے گئے نیک مارک سے کھولا۔ سب سے اوپر لکھا تھا۔
”اور اس نے عطا کیا تم کو ہر اس چیز سے جو تم نے اس سے مانگی تھی۔ اور اگر تم شمار
کرو اللہ کی فضت کو، اسے تم شمار نہیں کر سکتے۔“ بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ بھر
گئی۔

”کیوں مسکرا رہی ہو؟“ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے حیران ہوا تھا۔
”نہیں..... کچھ نہیں۔“ اس کے دل کی تسلی ہو گئی تھی، سو قرآن بند کر کے رکھنے لگی۔
اسے واقعی ہر وہ چیز مل گئی تھی، جو کبھی اس نے مانگی تھی۔
”بتاؤ نا۔“

”اصل میں میرے لئے بڑی پیاری آیت انتاری تھی اللہ تعالیٰ نے، وہی پڑھ کر ان
پر بہت پیار آیا تھا۔“

وہ سر جھٹک کر نہس دیا۔

”نہیں کیوں؟“

”کم آن محمل! اُس آل ان یور مائندہ!“

”کیا؟“ وہ حیران ہوئی اور اس بھی بھی۔

”محمل! وہ آیت تمہارے لئے نہیں تھی، یہ الہامی کتاب ہے۔ او کے؟ اتنا

casually ثریث مت کیا کروائے۔ یہ قرآن پاک ہے۔ اس میں نماز، روزے کے احکام ہیں۔ اُس نات اباؤث یو۔ ”اس نے موڑ کاٹا۔ کھلی شاہراہ رات کے اس پہر سنان پڑی تھی۔

وہ سکتے کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”تم دیکھو محمل! ایک ہی تصور کو ہر شخص اپنے زاویے سے دیکھتا ہے۔ مثلاً فقاد اس کی خامی ذہوئڑے گا، شاعر اس کے حسن میں کھوئے گا، سائنس دان کسی اور طرح سے اسے دیکھے گا۔ اُس آل ان یور ماںڈ۔“

”نہیں ہمایوں! قرآن میں وہی کچھ ہوتا ہے جو میں سوچتی ہوں۔“

”اس لئے کہ تم وہی پڑھنا چاہتی ہو۔ تمہیں ہر چیز اپنے سے ریلیٹیٹ لگتی ہے کیونکہ تم اسے خود سے ریلیٹ کرنا چاہتی ہو۔ محمل! یہ سب تمہارے ذہن میں ہے، یہ الہامی کتاب ہے۔ اس میں تمہارا ذکر نہیں ہے۔ ژرائی ٹوا انڈر اسٹینڈ۔“

دفعہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے ڈیش بورڈ پر رکھا موبائل اٹھایا، چمکتی اسکرین پر نمبر دیکھا اور پھر بٹن دبا کر کان سے لگایا۔

”جی رانا صاحب.....“ وہ محوج گفتگو تھا۔

محمل نے گم صمی نگاہ گود میں سوئے تیمور پڑالی اور پھر ہاتھوں میں پڑے قرآن کو دیکھا، جس کو وہ ابھی بیک میں رکھنے ہی لگی تھی۔ اسے لگا، ہمایوں کی بات نے اس کی جان نکال لی تھی، روح کھینچ لی تھی۔ وہ لمحے بھر میں کھوکھلی ہو گئی۔ اس کا دل کھوکھلا ہو گیا، خیال کھوکھلا ہو گیا، امید کھوکھلی ہو گئی۔

تو کیا اتنا عرصہ وہ یہ سب تصور کرتی آئی تھی؟ وہ وہی پڑھتی تھی جو وہ پڑھنا چاہتی تھی؟ اسے وہی دکھائی دیتا تھا جو اس کی خواہش ہوتی؟ وہ ہر چیز کا من چاہا مطلب نکلتی تھی؟

اس کا دل جیسے پاتال میں گرتا گیا۔ ہمایوں ابھی تک فون پر مصروف تھا، مگر اسے اس کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ سب آوازیں جیسے بند ہو گئی تھیں۔ وہ گم صمی، ہاتھوں میں پڑے قرآن کو دیکھے گئی، پھر درمیان سے کھول دیا۔ دو صفحے سامنے روشن ہو

گئے۔

پہلے صفحے کے وسط میں لکھا تھا۔

”اور بے شک ہم نے اسے نازل کیا ہے اور بے شک اس (قرآن) میں ذکر ہے تمہارا....“ اس سے آگے پڑھا ہی نہ گیا۔ وہ جیسے پھر سے جی اٹھی تھی۔

ساری اداسی، ویرانی ہوا ہو گئی۔ دل پھر سے منور ہو گیا۔ اب اسے کسی کا نظریہ یا رائے خود پر مسلط نہیں کرنا تھی۔ اسے اس کا جواب نظر آگیا تھا۔ ولیل مل گئی تھی۔

مسکراہٹ بیوں پر بکھیرے اس نے احتیاط سے قرآن پاک سنبھال کر واپس بیگ میں رکھا اور زپ بند کی، پھر سریش کی پشت سے نکا کر آنکھیں موند لیں۔ اسے ہمایوں سے کوئی بحث نہیں کرنا تھی۔ اسے کچھ نہیں سمجھانا تھا۔ وہ اسے سمجھا ہی نہیں سکتی تھی کہ اکثر لوگ نہیں جانتے، نہیں مانتے۔



صحیح نہیں اتری تھی۔ چڑیاں چپھاتے ہوئے اپنی منزلوں کی طرف اڈ رہی تھیں۔ رات بارش کھل کے بری تھی، سورج کبھی تک نہ تھی۔ سیاہ بادل اب نیلی چادر سے قدرے برک گئے تھے اور موسم خاصاً خوشگوار ہو گیا تھا۔

وہ گیٹ پارک کے باہر نکلی تو درختوں کی باڑ کے ساتھ نوی سائیکل دوڑاتا آ رہا تھا۔ وہ تیمور کی پرام دھکیلتی سڑک پر آگے بڑھنے لگی۔ اس کا رخ نوی کی طرف تھا۔ ”محمل باجی! السلام علیکم۔“ نوی اسے دیکھ کر چک اٹھا۔ تیزی سے سائیکل بھگاتا اس تک آیا۔ وہ کالونی کے ان بچوں میں سے تھا، جنہیں شام کو محمل اپنے گھر جمع کر کے ناظرہ پڑھاتی تھی۔

”علیکم السلام! صحیح کدھر جا رہے ہو نوی؟“ وہ رک گئی تھی۔

”ہمارے اسکول کی چھیاں ہو گئی ہیں نا، تو صحیح فارغ ہوتا ہوں۔“ اس نے اپنی اللہ پلی کیپ سیدھی کی۔ اب وہ سائیکل روک کر اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

”خنان اور راحم وغیرہ کی بھی؟“

”جی باجی! سب کا آف ہو گیا ہے۔“

”تو پھر یوں نہیں کریں کہ آئندہ فجر کے بعد کلاس رکھ لیں؟“

”باجی! میں تو آ جاؤں گا، مگر راحم وغیرہ.....“ اس نے متذبذب سے اپنے ہمارے کا نام لیا۔

”وہ نہیں آئیں گے؟“

”آپ ان سے خود ہی پوچھ لیجئے گا۔“

نومی پائیک دوڑا تا دور نکل گیا۔

اس کا ارادہ سامنے مدرسہ جانے کا تھا، مگر پھر نکڑ پہ چھلی والا نظر آگیا۔

بارش کے بعد کا شندرا ہہانا موسم اور بھنے ہوئے دانے۔ وہ رہ نہ سکی اور پرام دھکیلتی نکڑ پہ کھڑی ریڑھی کی طرف بڑھ گئی۔

سرک سنان پڑی تھی۔ چھلی والا بھی خاموشی سے سر جھکائے ریت گرم کر رہا تھا۔ وہ پرام دھکیلتی آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ اسے یاد آیا، اس نے آج صحیح کی دعائیں وہ پرام دھکیلتی کی تبعیق پڑھنے لگی۔ تب ہی فاصلہ سمٹ گیا اور وہ ریڑھی کے پاس آن پنجی تو دھیان بٹ گیا۔

”ایک چھلی بنا دو۔ اور ساتھ میں پانچ روپے کے دانے بھی۔ اور مسالہ بھی ذرا زیادہ ہو۔“ اس کی تبعیق اوہوری رہ گئی۔ بوڑھا چھلی والا سر ہلا کر چھلی بھوننے لگا۔ وہ محکیت سے اسے بھوننے دیکھنے لگی۔

ذہن کے کسی گوشے میں اس روز آرزو کی کہی گئی باتیں گو نجتے لگیں۔ وہ بار بار انہیں ذہن سے جھٹکتا چاہتی، مگر یونہی ایک دھڑ کا سادل کو لگ گیا تھا۔ بس ایسے ہی اس کا دل گھبرا سا جاتا۔ وہ نیند میں ڈر جاتی۔ جانے کیا بات تھی۔

”دس روپے ہوئے بی بی؟“

بوڑھے شخص کی آواز پہ وہ چونکی، پھر سر جھٹک کر ہاتھ میں پکڑا پاؤچ کھولا۔ اندر پیسے اور چند کاغذ، بیل وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے دس کا نوٹ نکالنا چاہا تو ایک کاغذ، جو نوٹ کے اوپر اس کر رکھا گیا تھا، اڑ کر دور سرک پہ جا گرا۔

”اوہ، ایک منٹ۔“ وہ دس کا نوٹ اس کے ہاتھ پہ رکھ کر، تیمور کی پرام دھکیلتی چھوڑے، دوڑتی ہوئی گئی، جہاں سرک کے وسط میں وہ مڑا تڑا سا کاغذ پڑا تھا۔ اس نے جھٹک کر کاغذ اٹھایا اور اسے کھول کر پڑھا، پھر تحریر دیکھ کر مسکرا دی۔ اگلے ہی بیل سامنے سرک کے کونے سے آتی گاڑی کی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ گاڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی، ایک ہی جست میں اڑ کر سرک پار کرنا

چاہتی تھی، مگر موقع نہ ملا۔

تیز ہارن کی آواز تھی اور کوئی جیخ رہا تھا۔ اس کے پاؤں حرکت کرنے سے انکاری تھے۔ اس نے گاڑی کو خود سے مگراتے دیکھا، پھر اس نے خود کو پورے قد سے گرتے دیکھا۔ شور تھا..... بہت شور۔ اس نے اپنی چینیں سنیں..... اپنے سر سے نکل کر رُزک پر گرتا خون دیکھا، بہتا ہوا الال خون..... بے حد لال۔

اس کی کلائی وہیں اس کے چہرے کے ساتھ بے دم سی گر گئی۔ اس نے ہاتھ کھول دیا۔ مژا تڑا سا کاغذ نکل کر رُزک پر لٹھک گیا۔ اس نے اور گرد لوگوں کو اکٹھے ہوتے دیکھا۔ کہیں ذور کوئی بچہ رورہا تھا۔ بہت اوپھا اوپھا، حلق پھاڑ کر۔ ذور..... بہت ذور۔ جو آخری بات اس کے ذوبتے ذہن نے سوچی تھی، وہ یہ تھی کہ آج اس نے صحیح کی دعائیں نہیں پڑھی تھیں۔



اس کا ذہن گھپ اندر میرے میں ڈوب چکا تھا۔ تاریکی..... سیاہ کالی، مہیب سی تاریکی، پنا رنگ کے، پنا شور کے، خاموشی تاریکی۔ اندر میرے پر اندر میرا، پردے پر پردہ۔

اس کا ذہن، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ پانی پر بہرہ رہا تھا۔ بادلوں پر تیر رہا تھا۔

زمیں اور آسمان کے درمیان۔ نہ اوپر، نہ نیچے، ہوا کے بیچ کہیں معلق۔ کہیں درمیان میں، کسی تیرتے بادل پر۔

پھر آہستہ آہستہ تیرتے بادل کو قرار آیا۔ ذرا سا جھٹکا لگا اور بادل کی بلیے کی طرح پھٹ کر ہوا میں تخلیل ہو گیا ہر طرف روشنی بھرتی گئی۔ تیز، پیلی روشنی۔

اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں۔ ڈھنڈلا سا ایک منظر سامنے تھا۔ سفید دیواریں، سفید چھت، چھت سے لکھا پکھا، اس کے تین پر تھے، ہولے ہولے وہ ایک دائرے میں گھوم رہے تھے۔ دائِرے..... دائِرے..... بار بار دائِرے۔

وہ کتنی ہی دیر یک نک چھت کو دیکھے گئی۔ وہ کون تھی؟ کدھر تھی؟ کیوں تھی؟ وہ خالی نگاہوں سے چھت کو تکتی رہی۔ پھر یک ایک ادھر ادھر دیکھنا چاہا۔

ارڈ گرد سفید دیواریں تھیں۔ قریب ہی ایک کاؤچ رکھا تھا۔ تپانی پہ سوکھے پھولوں کا گلدستہ سجا تھا۔ اس نے کہیوں کے مل اٹھنا چاہا، مگر جسم جیسے بے جان سا ہو گیا تھا، یا شاید وہ بے حد تھک چکی تھی۔ اس نے کوشش ترک کر دی اور اپنے بازوؤں کو دیکھا، جن میں بے شمار نالیاں سی پیوست تھیں۔ ہر نالی کسی نہ کسی مشین کے برے پے جائز تھی۔ وہ شاید ہسپتال کا کرہ تھا اور وہ خود شاید..... بلکہ یقیناً محمل ابرا ہیم تھی۔

خود کو کیسے بھولا جا سکتا ہے بھلا؟ آہستہ آہستہ ساری یادداشتیں ذہن کے ہر گوشے سے ابھرنے لگیں۔ ایک ایک بات، ایک ایک چہرہ اسے یاد آتا گیا۔

تھک کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ آخری بات بھلا کیا ہوئی تھی؟ کس چیز نے اسے ادھر ہسپتال پہنچایا؟ شاید کوئی ایک بیٹھنٹ؟ اور اسے دھیرے دھیرے یاد آتا گیا۔ وہ بخشنے لینے سڑک کے اس پارگنی تھی۔ اس کے ساتھ نومی بھی تھا۔ وہ سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ نظروں سے او جھل ہوا ہی تھا کہ وہ ریڑھی والے کے پاس چلی گئی۔ پھر..... پھر کچھ ہوا تھا۔ اسے ٹکر لگی تھی۔ خون..... بکھرے کاغذ، روٹا پچ۔

”بچہ؟“ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں، پھر ادھر ادھر دیکھا۔ کرہ خالی تھا۔ وہ ادھر اکیلی تھی۔ مگر وہ روٹا بچہ..... وہ آواز جو اسے آخری پلی نک سانی دی تھی؟ تیمور..... تیمور رورہا تھا۔ ہاں، اسے یاد تھا۔ کہاں ہے تیمور؟

اس نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، اسی پلی دروازہ کھلا۔

سفید یونیفارم میں لمبوں نس اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ وہ تیزی سے ٹرے لئے بیڈ کی طرف بڑھی، پھر اسے جا گئے دیکھ کر نہ کھلکھل۔

”اوہ، شگر ہے، آپ کو ہوش آگیا۔“ وہ حیران سی کہتی اس کے قریب آئی۔ تب ہی کھلے دروازے سے ایک بچہ نظر آیا۔

چھسات برس کا، خوب صورت سا بچہ۔ شاید وہ نومی کا ہمسایہ راحم تھا۔ ہاں، وہ راجم ہی تھا، یا شاید راحم کا چھوتا بھائی۔ وہ فیصلہ نہ کر پائی۔

”آریو آل رائٹ؟“ نس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کو چھوا، پھر حیرت سے پوچھا۔ وہ بنا جواب دیئے نپے کا چہرہ دیکھتی رہی، جو عجیب انہاک سے اسے دیکھ رہا تھا۔
یہ شاید وہ لڑکا تھا، جس کو وہ شام میں ناظرہ پڑھاتی تھی۔

”تم آپ کی ستر کو بلاتا ہے ابھی۔“ نس خوشی سے چھکتی باہر کو بھاگی۔ وہ ابھی تک نپے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جن میں عجیب سی کوفت تھی اور ناخنی پیشانی پر ذرا سے مل۔ وہ اس کو عجیب تغزیب ہری نگاہوں سے دیکھتا کاوچ پہ آبیٹھا اور کہیاں گھنوں پر رکھ کر دونوں ہتھیلوں میں چہرہ گردایا۔ وہ ابھی تک اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

”راجم!“ اس نے پکارا تو اسے اپنی آواز بہت بلکی، بھی بھی سی سنائی دی۔ بچہ اسی طرح سے دیکھتا رہا۔

”راجم!“ اس نے پھر آواز دی۔ وہ بمشکل بول پار رہی تھی۔

”میں سنی ہوں۔“ پھر لمبے بھر کو رک کر عجیب سے تغزیہ سے بولا۔ ”آئی ڈونٹ لا یک بُ۔“ (تم مجھے اچھی نہیں لگتیں)

”سنی؟“ وہ دنگ رہ گئی۔ اس نپے کو وہ روز ناظرہ پڑھاتی تھی، وہ شاید راجم کے چھوٹا بھائی تھا۔ پھر وہ ایسے بات کیوں کر رہا تھا؟
اسی پل دروازہ زور سے کھلا۔

محمول نے چونک کر دیکھا۔

دروازے میں فرشتے کھڑی تھی سیاہ عبا یا پہ سیاہ جاپ چہرے کے گرد لپیٹے وہ بے یقینی سے بستر پہ لیئی محمول کو دیکھ رہی تھی۔

”فر..... فرشتے؟“ وہ اپنی جگہ جادر رہ گئی۔ فرشتے تو باہر تھی، وہ پاکستان کب آئی؟
”اوہ، میرے اللہ!..... ماحمل!“ اس نے بے اختیار ا۔ پن منہ پہ ہاتھ رکھا۔ کتنے ہی بلے وہ بے یقین کی کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔

”احمل!..... احمل!“ ایک دم آگے بڑھ کر اس نے بے قراری سے اس کا چہرہ چھوا۔

”تم مجھے دیکھ سکتی ہو احمل؟..... تم مجھے پہچانتی ہو؟..... تم بول سکتی ہو؟“

”میں تمہیں کیوں نہیں پہچانوں گی فرشتے! تم کب آئیں؟“

”میں؟“ فرشتے متعجب نظر وہ اسے تک رہی تھی۔ ”میں تو..... مجھے تو کافی وقت ہو گیا محمل! تم..... میں نے تو تم سے اتنی باتیں کیں۔ تم نے..... تم نے سنا؟“ ”کیا؟“ وہ ابھی گئی۔ ”نہیں..... میں نے تو کوئی بات نہیں سنی..... میں تو.....“ وہ زکر کر، اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ ”میں تو صحیح ریڑھی والے کے پاس گئی تھی۔“ مجھے گاڑی نے ملکر مار دی۔ اور..... اور تم نے بتایا بھی نہیں کہ تم آرہی ہو؟“ فرشتے بے یقینی سے پھیلی آنکھوں سے اسے ملکر ملکر دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ ہو۔

”فرشتے! بولو۔“ اسے فرشتے کی یہ حرست و بے یقینی پریشان کر رہی تھی، کہیں کچھ غلط تھا۔

”محمل! تم.....“ وہ کچھ کہتے کہتے پھر رک گئی، جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔ ”یو اینڈ یور اوورا یکٹنگ! ہونہیں۔“ وہ چھوٹا لڑکا بے زاری سے کہہ کر اٹھا تھا۔ فرشتے نے چونک کر اسے دیکھا۔

سیاہ جاپ میں دکتے فرشتے کے چہرے پہ بیکی سی نا گواری اُبھری۔

”سنی! پلیز بیٹا۔ جاؤ یہاں سے۔ مجھے بات کرنے دو۔“

”میں کیوں جاؤں؟ میری مرضی۔ آپ دونوں چلی جائیں۔“

”فرشتے! یہ کون ہے؟..... کیوں ضد کر رہا ہے؟“ وہ ابھی کر پوچھ رہی تھی، مگر فرشتے دوسری طرف متوجہ تھی۔

”آئی ڈونٹ وانٹ ٹو گو۔“ وہ بد تیزی سے چیخا تھا۔

”ش! اپ تیور! اینڈ گیٹ آؤٹ۔ تم دیکھ نہیں رہے، میں ماما سے بات کر رہی ہوں۔“

فرشتے کہہ رہی تھی اور اسے لگا، کسی نے اس کے اوپر ڈھیروں پھر لڑھکا دیئے ہوں۔

”تم نے..... تم نے تیور کہا فرشتے؟“ وہ ساکت رہ گئی تھی۔

”ہاہ! شی! از ناٹ مائی مام۔“ وہ سر جھٹکتا اٹھ کر باہر گیا اور اپنے پیچھے زور سے

دروازہ بند کیا۔

”تم نے تیمور کہا؟ نہیں، یہ تیمور..... نہیں..... میرا تیمور کہاں ہے؟“ اس کا دل بند ہو رہا تھا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ کہیں کچھ بہت غلط تھا۔

فرشتے نے آہستہ سے گردن اس کی طرف موڑی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں گلابی سی نبی ابھر آئی تھی۔

”محمول! تمہیں کچھ یاد نہیں؟“

”کیا..... کیا یاد نہیں؟..... میرا بچہ کہاں ہے؟“ وہ گھٹی گھٹی سی سک اٹھی۔ کچھ تھا جو اس کا دل ہولا رہا تھا۔

”محمول!“ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گال پر لڑکنے لگے۔ بے اختیار اس نے محمول کے ہاتھ تھام لئے۔ ”تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔“

”فرشتے! میں پوچھ رہی ہوں کہ میرا بیٹا کہاں ہے؟“

”تمہارے سر پر چوت آئی تھی۔ تمہارا اسپائیل کارڈ ذیسچ ہوا تھا۔“

”فرشتے! میرا بچہ۔“ اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ وہ بے قراری سے فرشتے کی بھیگ آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”محمول!..... میں بے ہوش ہو گئی تھیں، تم کو ماں چلی گئی تھیں۔“

”مجھے پتہ ہے، صبح میرا ایکسیڈنٹ.....“ اور یہ کہتے ہوئے بھی وہ جانتی تھی کہ وہ صبح نہیں تھا۔

”وہ صبح نہیں تھا۔ وہ سات سال پہلے تھا۔“

”وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہ گئی۔“

”وقت سات سال آگے بڑھ گیا ہے۔ تمہیں کچھ یاد نہیں؟ وہ ساری باتیں جو میں اتنے برس تم سے کہتی رہی؟ وہ دون، وہ راتیں جو میں نے ادھر تمہارے ساتھ گزاریں، تمہیں کچھ یاد نہیں؟“

وہ پتھر کا بت بن گئی تھی۔ فرشتے کو لگا، وہ اس کی بات نہیں سن رہی۔

ڈاکٹر ز کہتے تھے، تم کبھی بھی ہوش میں آسکتی ہو۔ ہم نے بہت ویٹ کیا تمہارا محمل!

بہت زیادہ۔“ آنسو متواتر اس کے دمکتے چہرے پر گر رہے تھے۔
وہ گم صشمی اسے دیکھے گئی۔ گویا وہ وہاں تھی، ہی نہیں۔

”میں نے تمہارے اٹھ جانے کی بہت دعائیں کیں محمل! میں نے اپنا پی ایچ ڈی
بھی چھوڑ دیا، تمہارے ایک سینٹ۔ کے درے میں میں آ گئی تھی۔ دو ماہ رہی، پھر واپس
گئی، مگر دل ہی نہیں لگ سکا۔ میں پڑھ ہی نہیں سکی۔ پھر میں نے سب پڑھائی چھوڑ دی
اور تمہارے پاس آ گئی۔ اتنے برس محمل! اتنے برس گزر گئے۔ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں،
محمل؟“

فرشتے نے ہولے سے اس پھر کے مجھتے کا شانہ ہلاایا۔ وہ ذرا سی چوٹی، پھر اس کے
لب کیکپاٹے۔

”میرا..... میرا تیمور؟“

”یہ تیمور تھا نا۔ ہم اسے سنی کرتے ہیں۔“

مگر وہ کیسے مانتی؟ وہ جسے کوئی کالونی کا بچہ سمجھی تھی، وہ اس کا اپنا بچہ تھا۔ یہ کیسے ممکن
تھا؟ اسے تو لگا تھا کہ وہ بس ایک دن کے لئے سوئی ہے یا پھر شاید دن کا ایک حصہ۔ پھر
صدیاں کیسے بیت گئیں؟ اسے کیوں نہیں پتہ چلا؟ اور تیمور.... نہیں۔

اُسے کاث میں لیٹا اپنا نومولود بچہ یاد آیا۔

”فرشتے! وہ میرا بچہ ہے۔ اوہ خدا یا!“ اس نے بے یقینی سے آنکھیں موند کر
کھولیں۔ ”وہ اتنا بدل گیا ہے؟“

”بہت کچھ بدل گیا ہے محمل! کیونکہ وقت بدل گیا ہے۔ وقت ہر شے پر اپنے نشان
چھوڑ جاتا ہے۔“

”ہمایوں؟“ اس کے لب پھر پھڑائے۔ ”ہمایوں کہاں ہے؟“

”زس نے جب بتایا تو میں نے اسے کال کر دیا تھا مگر.....“ وہ لمحے بھر کو چکپائی۔

”وہ میشنگ میں تھا، رات تک آ سکے گا۔“

”نہیں فرشتے! تم اس کو بلاو۔ پلیز، بلاو۔ اس سے کہو، محمل جاگ گئی ہے۔ محمل اس
کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ میرے ایک فون پر ہی دوڑ آتا تھا۔“

”وہ سات سال پہلے کی بات تھی محمل! وقت کے ساتھ یہاں بہت کچھ بدلتا ہے۔
لوگ بھی بدل جاتے ہیں۔“

”وہ کیوں نہیں آیا؟“ وہ کھوئی کھوئی کی بولی تھی۔ عجیب بے یقینی سی، بے یقینی تھی۔

”محمل! پریشان مت ہو۔ چلیز، دیکھو۔“

”وقت ہمایوں کو نہیں بدل سکتا.... میرا ہمایوں ایسا نہیں ہے... میرا تیمور ایسا نہیں
ہے۔“

وہ ہڈیاں انداز سے چلائی۔ اتنی بے یقینی تھی کہ اسے رونا بھی نہیں آرہا تھا۔

فرشتے تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔

ابھی اسے سنھلنے میں وقت لگے گا، وہ جانتی تھی۔



فرشته چلی گئی اور وہ منہ پر چادر ڈالے، آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ اسے یقین نہ تھا کہ فرشته نے اس سے بچ بولا ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب ایک بھیاںک خواب ہے۔ اور ابھی وہ آنکھ کھولے گی تو وہ خواب ٹوٹ جائے گا۔

پھر اس نے آنکھیں نہ کھولی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر خواب نہ ٹوٹا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ جانے کتنا وقت گزرا، وہ لمبیں کا حساب نہ رکھ پائی۔ اور اب کون سے حساب باقی رہ گئے تھے؟

دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی۔ اس نے لمحے بھر کو آنکھیں کھولیں۔ ہوا سے چہرے پر پڑی چادر سرک گئی تھی، منظر صاف واضح تھا۔ کھلے دروازے کے بچ وہ کھڑا تھا۔

اس کی نگاہیں وہیں خہری گئیں۔ وقت ہتم گیا۔ لمحے ساکن ہو گئے۔ وہ اسے دیساںی لگا تھا۔ اتنا ہی وجیہ اور شان دار۔ مگر اس کا جذبات سے عاری چہرہ، اس پر چھائی سمجھدی گی۔ نہیں، وہ شاید دیساںیں رہا تھا۔

وہ آہستہ سے قدم اٹھاتا بیڈ کے قریب آیا اور پاپتی کے ساتھ رک گیا۔ ”ہمایوں!“ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”ہوں..... کیسی ہو؟“ وہ پاپتی کے قریب کھڑا رہا، اس سے آگے نہیں بڑھا۔ آواز میں بھی عجیب سرد مہری تھی۔

”ہمایوں!“ وہ رو نے لگی تھی۔ ”یہ سب کیا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ اتنے سال گزر گئے۔

میری نیند اتنی لمبی کیوں ہو گئی؟“

”معلوم نہیں۔ ڈاکٹر ز کب تمہیں ڈسچارج کریں گے؟“ وہ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا، جیسے جانے کی جلدی ہو۔ اس کے لجھے میں کوئی ناراضی کا عضر نہیں تھا، بلکہ بہت ہموار لہجہ تھا۔ لیکن شاید ان کے درمیان کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہو جاؤں گی نا ہمایوں؟“ جیسے وہ تسلی کے دو بول سننا چاہتی تھی۔

”ہوں۔“ وہ اب جیبوں میں ہاتھ ڈالے تقدیمی نظریں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ؟ ہمایوں..... ور تیمور..... وہ اس کے ساتھ یوں کیوں کر رہے تھے؟

”ہمایوں!..... مجھ سے بات تو کریں۔“

”ہاں کہو، میں سن رہا ہوں۔“ وہ متوجہ ہوا۔ لمحے بھر کو نگاہ اس پر جھکائی۔ اس کے آنسو ہشم گئے۔ وہ بالکل چپ ہو کر رہ گئی۔ یہ تو محبت کی نگاہ نہ تھی۔ یہ تو خیرات تھی، بھیک تھی۔

وہ چند لمحے منتظر سا اس سے دیکھتا رہا، پھر واپس جانے کو مرا۔

اسی پل دروازے میں فرشتے کا سر اپا اُبرا۔ وہ ہاتھ میں فروٹ باسکٹ پکڑے تیزی سے آرہی تھی۔ ہمایوں اس کے ایک طرف سے نکل کر باہر چلا گیا۔ فرشتے نے پلت کر اسے جانتے دیکھا۔

”ہمایوں ابھی تو آیا تھا؟..... چلا بھی گیا؟..... کیا کہہ رہا تھا؟“ اچھنچھے سے کہتے ہوئے اس نے گردن اس کی جانب موڑی۔ محمل کے چہرے پر کچھ تھا کہ وہ لمحے بھر کو چپ سی ہو گئی۔

”فکر مت کرو، وہ ہر کسی سے ایسے ہی بی ہیو کرتا ہے۔“ وہ ماحول کو خوش گوار کرنے کے لئے کہتی آگے بڑھی اور فروٹ باسکٹ سائیڈ نیبل پر رکھی۔

”مگر میں..... کسی تو نہیں تھی فرشتے۔“ وہ ابھی تک نہ آنکھوں سے کھلے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

”ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟“

”مگر وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا؟“ اس کی آنکھیں پھر سے ڈبڈ بائیں۔

”محمل! دیکھو، اس تبدیلی نے وقت لیا ہے، تو اس کو ٹھیک ہونے میں بھی وقت لگے گا۔ تم اس کو کچھ وقت دو۔“ وہ اس کے ریشمی بھورے بال نرمی سے ہاتھ میں پکڑے برش کر رہی تھی۔

وقت، وقت وقت..... وہ ایک ہی سکرار ہر جگہ دہرائی جا رہی تھی۔ اس وقت نے کیا کچھ بدل دیا تھا، اسے اس کا اندازہ آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔

وہ اپنے نکلے دھڑ کو حرکت نہیں دے سکتی تھی، وہ اپنے پاؤں نہیں ہلا سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر بینہ نہیں سکتی تھی۔ خود کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ اپنے پاؤں پہ کھڑی ہونے کے قابل نہیں رہی تھی۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا؟

”اس دن..... اس دن جب میں گھر سے نکلی تھی تو میں نے صبح کی دعائیں نہیں پڑھی تھیں۔ یہ سب اسی لئے ہوا ہے فرشتے! کہ میں دعا پڑھے بغیر گھر سے نکلی تھی۔ ہے نا؟“ وہ نرمی سے اس کے بال سمجھا رہی تھی، جب وہ بھیگی آنکھوں اور ہر زندھے گلے سے کہنے لگی۔ فرشتے نے گھری سانس لی، کچھ کہا نہیں۔

”نہ تھا کہ اس کو اللہ سے کام آتا کچھ بھی، مگر ایک حاجت تھی یعقوب کے دل میں، تو اس نے اسے پورا کیا۔“

بہت دھیرے سے اس کے دل میں کسی نے سرگوشی کی تھی۔ وہ یکخت چونکسی گئی۔

”نہ تھا کہ اس کو اللہ سے کام آتا کچھ بھی، مگر ایک حاجت تھی یعقوب کے دل میں، تو اس نے اسے پورا کیا۔“

اس نے سنبھل کی۔ کوئی اس کے اندر مسلسل یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ وہیں، دھر آواز، ترجم اور سوز سے پر۔ اس کا دل دھڑ کنا بھول گیا۔ وہ ایک دم سنائے میں آگئی۔

یہ الفاظ، یہ بات، یہ سب بہت جانا پہچانا تھا۔ شاید یہ ایک آیت تھی۔

ہاں، یہ آیت تھی۔ سورہ یوسف، تیر ہواں سیپارہ۔ جب یعقوب علیہ السلام نے

اپنے بیٹوں کو غالباً نظرِ بد سے بچاؤ کے لئے احتیاطاً شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی تائید کی تھی، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے جیسے تبصرہ کیا تھا کہ ان بھائیوں کو اگر اللہ کی مرضی و نشا ہوتی تو پھر اللہ کے فیصلے سے کوئی بھی نہ بچاتا، مگر وہ احتیاط تو یعقوب علیہ السلام کے دل کی ایک حاجت تھی، تو یعقوب علیہ السلام نے اسے پورا کیا۔

ایک خاموش لمحے میں اس پر کچھ آشکار ہوا تھا۔ یہ جو ہوا تھا، اسے ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہ جو کر لیتی، یہ اللہ کی مرضی تھی، ہو کر رہی تھی، یہ اس کی تقدیر تھی، شاید اس کی دعاؤں نے اسے کسی بڑے نقصان سے بچالیا ہو۔ مگر کیا اس سے بھی کوئی بڑا نقصان ہو سکتا تھا؟ کوہا، معذوری، بیزار شوہر، بد کتا ہوا بچہ۔ اب کیا رہ گیا تھا زندگی میں؟

”کتنا کم تم شکر ادا کرتے ہو؟“

کسی نے پھر اس کو ذرا خنگی سے مخاطب کیا تھا۔ وہ پھر سے چونکی اور قدرے مفظرب ہوئی۔ یہ کون اسے بار بار اندر ہی اندر مخاطب کرتا تھا؟ یہ کون تھا؟

”فرشتے! پلیز مجھے کچھ دیر کے لئے..... پلیز، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ بہت بے بھی سے بولی تو فرشتے کا اس کے بالوں میں برش کرتا ہاتھ ڈک گیا۔ پھر اس نے جیسے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

”اوے کے۔“ اس نے برش سائیڈ پر رکھا اور انھوں کر باہر نکل گئی۔

”ہم نے بسایا تم کو زمین میں اور ہم نے تمہارے لئے اس زندگی کے سامان بنائے، کتنا کم تم شکر ادا کرتے ہو۔“ (سورہ اعراف)

کوئی اس کے اندر ہی اندر اسے جھنجوڑ رہا تھا، پکار رہا تھا۔ اس کے اندر باہر اتنا شور تھا کہ وہ سن نہ پا رہی تھی، کچھ نہ پا رہی تھی۔ فرشتے گئی تو اس نے آنکھیں موند لیں۔

اب اس کے ہر سو اندر میرا اُتز آیا۔ خاموشی اور تہائی۔ اس نے غور سے سنا چاہا، چند میں جلی آوازیں بار بار گونج رہی تھیں۔

”ہم تم میں سے ہر ایک کو آزمائیں گے، شر کے ساتھ اور خیر کے ساتھ۔“

”کہہ دو، بے شک میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ ہی کے لئے ہے جورب ہے تمام جہانوں کا۔“

اس کے ذہن میں جیسے جھما کا سا ہوا۔ ایک دم اندر باہر روشنی بکھرتی گئی۔ اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

”میرا قرآن..... میرا کلام پاک..... میرا مصحف.....“

وہ بکھی قرآن کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اس روز بھی وہ اس کے ہاتھ میں تھا، بلکہ بیک میں رکھا تھا۔ جب وہ ایکسٹرینٹ کے بعد اوہر لائی گئی ہو گی تو یقیناً وہ بھی ساتھ آیا ہو گا، پھر اسے اوہر ہونا چاہئے۔

گرسات سال..... اسے یاد آیا۔ وہ سات سال درمیان میں آگئے تھے۔ ان کے پیچھے توہر شے گویا دھول میں گم ہو گئی تھی۔
اوہ خدا یا.....! وہ کیا کرے۔

اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ یہ ایسی عجیب سی بات تھی، جس پر اسے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ وہ جتنا سوچتی، اور اُبھتی جاتی۔

تب ہی دروازہ ہولے سے کھلا، اس نے چوک کر آنکھیں کھولیں۔

تیمور دروازے میں ایستادہ تھا۔ جیز شرٹ پہنے، اس کے بھورے بال ماتھے پر کٹ کر گر رہے تھے۔ اس کی ناک بالکل ہمایوں کی طرح تھی۔ کھڑی، مغروڑ ناک۔ اور آنکھیں محمل کی سی، سنہری چمکتے کانچ جیسی۔ اور ماتھے کے وہ مل..... وہ جانے کس جیسے تھے!

”تیمور!“ اس کو دیکھ کر محمل کی آنکھیں جگہا اٹھی تھیں۔ وہ اس کا بیٹا تھا۔ اس کا تیمور تھا۔ ”اوہر آؤ بیٹا!“

”ویز از مائی ڈیڈ؟“ (میرے ڈیڈ کہاں ہیں؟) وہ اسی تنفس سے چھپتے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ منہ پھٹ، اکھڑ، بد تیز۔ اگر وہ اس کی ماں نہ ہوتی تو یہ تین الفاظ اس کے ذہن میں اس کے متعلق فوراً اُبھرتے۔

”وہ ابھی آئے تھے، پھر چلے گئے۔ تم ماں سے نہیں ملو گے؟“ اس نے متاس سے مجبور اپنے بازو پھیلائے۔

”نہیں۔“ اس نے پاہر نکل کر زور سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ نہ ہو کرہ گئی۔ بازو آہستہ سے پھلو میں آن گئے۔
 یہ سال سال کا بچہ..... اس کے دل میں اتنی نفرت، اتنی کڑواہٹ کیسے آگئی؟ کیا
 قصور تھا اس کا کہ وہ یوں اس سے مقفر تھا؟ اور صرف اس سے نہیں، بلکہ فرشتے سے بھی۔
 بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اور پھر وہ کب روتنے سو گئی، اسے
 پتہ بھی نہ چلا۔



فریو تھراپیٹ اسے ایکسر سائز کرانے کی ناکام کوشش کر کے جا چکی تھی۔ وہ اسی طرح
 دنیا سے بیزار، آنکھوں پہ بازور کھے لیٹی تھی۔ یہ دایاں بازو تو بالکل ٹھیک کام کرتا تھا،
 بایاں البتہ ذرا سا ڈھیلا تھا۔ مگر امید تھی کہ وہ بھی جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹانگوں کے
 متعلق کچھ کہنے سے ڈاکٹر زاد بھی قاصر تھے۔ کبھی وہ کہتے کہ فریو تھراپیٹ سے آہستہ آہستہ وہ
 ٹھیک ہو جائے گی۔ اور بعض اوقات وہ اس سب کا انحصار اس کی اپنی قوتِ ارادی پر
 گردانستہ۔ وہ قوتِ ارادی، جس کو استعمال کرنے کی سعی ابھی وہ نہیں کر رہی تھی۔
 ایک دم سے پھولوں کی مہک تھنھوں سے ٹکرائی تو اس نے دھیرے سے بازو ہٹایا
 اور آنکھیں کھولیں۔

فرشتے بڑا سا میکتے سرخ گلابوں کا بکے لئے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ
 اسکارف میں مقید چہرے پہ وہی مخصوص تھندی ہی مسکراہٹ تھی۔
 ”السلام علیکم مائی سسر؟ کیسی ہو؟ اور یہ فریو تھراپیٹ کو کیوں تم نے بھاگا دیا؟“ وہ
 کانچ کے گلدان میں گلداستہ لگاتے ہوئے بولی تھی۔
 ”مجھے کسی فریو کی ضرورت نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔ یہ لوگ مجھے گھر کیوں نہیں
 جانے دے رہے؟“

”میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ تمہیں عنقریب گھر شفت کر
 دیں گے۔ شاید ایک ہفتے تک۔ تم مینفلی بالکل ٹھیک ہو اور تمہیں مزید ہسپتال میں رکھنے
 کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ پھول سیٹ کر کے شاپر سے کچھ اور نکالنے لگی۔ ”اور تمہور نہیں آیا؟“

”اے آتا تھا کیا؟“ اس کا دل ڈوب کر آبھرا۔

”ہاں، میں اسے روز ساتھ ہی لاتی ہوں۔ پتہ نہیں، شاید لان میں بیٹھا ہو، ابھی آجائے گا۔“ وہ کہہ کر خود ہی شرمندہ ہوئی۔

محمل نے پھر سے چہرے پہ بازور کھلایا۔ وہ اب یوں ہی ساری دنیا سے چھپ جانا چاہتی تھی۔

فرشتبہ روز صبح آتی تھی، پھر دوپہر میں چلی جاتی اور گھنٹے بھر بعد تیمور کو ساتھ لئے آتی۔ وہ باہر ہی پھر تارہتا، اندر نہ آتا۔ پھر عصر کے وقت فرشتبہ چلی جاتی، غالباً اسے مسجد جانا ہوتا تھا۔ رات کو وہ پھر ایک چکر لگا لیتی۔ چھٹی کے دن وہ تیمور کو صبح سے ہی ساتھ لے آتی اور باقی دنوں میں اس کے اسکول کے باعث دوپہر میں لاتی۔ ہاں، رات کو تیمور اس کے ساتھ نہیں آتا تھا۔

اور ہمایوں، وہ تو بس ایک ہی دفعہ آیا تھا۔ پھر اس کے بعد ہمیشہ ”وہ شاید بڑی ہو گا“ والا جواب فرشتبہ خوب شرمندہ ہو کر دیتی۔

وہ دن میں تین تین چکر لگایا کرتی۔ گویا گھن چکرنی رہتی۔ محمل کا ہر چھوٹا بڑا کام کرتی۔ اور نہیں تو اس کے ساتھ بیٹھی تسلی اور پیار کی باتیں کرتی رہتی۔ اب بھی وہ جانے کیا چیز الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ محمل کو کھٹ کھٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر وہ یوں ہی بیزاری، منہ پہ بازور کھے لیتی تھی۔ اور پھر آہستہ سے وہ متربم آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔

”سب تعریف اس اللہ کی، وہ ذات جس نے اپنے بندے پہ کتاب اتاری اور اس میں کوئی ثیرہ نہیں بنایا۔“

اس نے جھکے سے بازو ہٹایا۔

فرشتبہ نیپریکارڈ سیٹ کر کے ہاتھ میں پکڑے کیست کو بند کر رہی تھی۔ محمل کی طرف اس کی پشت تھی۔ ”درست کرنے والی (کتاب) تاکہ وہ اپنے پاس موجود سخت عذاب سے ڈرائے اور خوش خبری دے ان مومنوں کو، جو اچھے کام کرتے ہیں کہ بے شک ان کے لئے اچھا اجر ہے۔“

وہ یہ آواز لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ قاری مشاری کی سورۃ الکھف۔
”وہ رہنے والے ہیں اس میں ہمیشہ ہمیشہ۔ اور ڈرانے ان لوگوں کو جنہوں نے کہا
کہ اللہ نے بیٹھا بنایا ہے۔“

ل فقط بوند بوند اس کی ساعت میں اُتر رہے تھے۔ آج جمعہ تھا اور وہ ہمیشہ جمعہ کو سورۃ
کھف پڑھا کرتی تھی۔

”نہ ان کے پاس اس کا کوئی علم ہے اور نہ ہی ان کے آباء و اجداد کے پاس ہے۔
ان کے منہ سے یہ بہت بڑی بات نکلتی ہے، وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں کہتے۔“
کھٹ سے فرشتے نے اشاپ کا ٹھن دبایا تو آواز رک گئی۔

اس نے رُٹپ کر فرشتے کو دیکھا۔

”لگائیں نا۔ بند کیوں کر دی؟“

”اوہ..... تم جاگ رہی تھیں؟“ وہ چونک کر پیٹھی۔ ”میں بھی، تم سوگی ہو۔ میں نے
سوچا، تمہیں تھنک نہ کروں۔“

”کوئی قاری مشاری کی سورۃ کھف سے بھی تھنک ہو سکتا ہے بھلا؟ اس میں تو میری
جان مقید ہے فرشتے! آپ کو یاد ہے، جب جمعہ کو کلاس میں سورۃ کھف شروع ہوئی تھی تو
”الحمد لله الذي“ ہی پر میرے آنسوگرنے لگتے تھے۔“

”تمہارے آنسو اب بھی گر رہے ہیں محمل؟“ وہ آہستہ سے اس کے قریب آن پیٹھی
اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔
محمل کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

”میں جانتی ہوں، تم تیمور اور ہمایوں کی وجہ سے اپ سیٹ ہو۔ بھول جاؤ ان کی
نادریاں محمل! وہ نا سمجھے ہیں۔ ان کی وجہ سے اپنا چین سکون برپا نہ کرو۔ وہ وقت کے
ساتھ ساتھ سمجھے جائیں گے۔ مگر ایک بات تمہیں ذہن میں بٹھایتا چاہئے کہ تمہاری زندگی
ان پر انحصار نہیں کرتی، تم ان کے بغیر نہیں مر جاؤ گی، ان کے بغیر جینا سیکھو محمل! خود کو
اشرائیگ کرو اور.....“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”مگر ابھی آپ سورۃ کھف لگائیں نا۔

پلیز! مجھے سننا ہے۔“

فرشتوں ذرا سی جیراں ہوئی، پھر گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا، صحیک ہے۔ میں لگاتی ہوں۔“

”اور میرا قرآن؟“

”ہاں..... وہ میں کل ڈھونڈ کے لے آؤں گی۔ ابھی تم یہ سنو۔ میں تیمور کو ڈھونڈتا ہوں۔“ اس نے play کا بٹن دبایا اور خود باہر نکل گئی۔

”بس شاید تم ان کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کرنے والے ہو، اگر وہ اس کلام کے ساتھ ایمان نہ لائے، بہت افسوس کے ساتھ، بے شک جو بھی زمین پر ہے، ہم نے اسے اس کی خوب صورتی کے لئے بنایا ہے، تاکہ ہم ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے کون سب سے اچھے کام کرتا ہے اور بے شک ہم اس کو بغیر، صاف میدان بنانے والے ہیں۔“

اس نے آنکھیں موند لیں۔ آنسو آہستہ آہستہ اس کے ہیکے کو بھگونے لگے تھے۔

سورۃ کہف کے ساتھ اسے وہ تمام مناظر یاد آنے لگے جو کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھے۔

سنگ مرمر کی چمکتی راہ داریاں، روشنیوں سے گھرا ہاں، جو اوپر سفید ستونوں پر کھڑا تھا۔ مسجد کے برآمدے کے سامنے گھاس سے بھرالاں، وہ پنک اسکارف میں لپٹے بہت سے جھکے سر جو تیزی سے نوش لینے میں معروف ہوتے، لاہبری یہی کی اوپری گھاس وندوز جن سے فیصل مسجد دکھائی دیتی تھی۔ وہ کالونی کی سڑک پر درختوں کی گھنی باؤز..... یادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا، جو اُمّہ کر اس کے ذہن میں آیا تھا۔ ڈاکٹر زمیک کہتے تھے کہ وہ ذہنی طور پر بالکل فٹ ہے۔

سورۃ کہف ختم ہوئی تو کیسٹ رک گئی۔ اس نے بے بھی سے ٹیپ کو دیکھا۔ وہ اس سے خاصے فاصلے پر تھی۔ وہ اٹھ کر اس کو ری پلے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیسی بے بھی، کیسی لاچاری تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ہر راہ بند ہوتی دکھائی دینے لگی، ہر دروازے

کے سامنے اندر چھانے لگا۔ اسے لگا، وہ اب ہمیشہ کسی اندر ہرے بند کھف میں مقید رہے گی۔

تیور اور ہمایوں سے دور..... بہت دور۔

● ● ●

صحیح وہ سوکر خاصی دیر سے آئی۔ رات بھروسہ بگی تو فجر کی کے قریب ہی آئی گئی تھی۔

سرزمیرین، بیڈ سائیڈ ٹیبل پر دوائیں رکھ رہی تھی، اسے جاگتے دیکھ کر مسکرائی۔

”گڈ مارنگ، سرز ہمایوں! ہاؤ آر ہو؟“

”فائن!“ وہ جبرا مسکرائی۔ کس کا نام اس کے نام کے ساتھ جڑتا تھا، وہ جو خود ہی اس سے دور بھاگنے لگا تھا۔

”آپ کی سرزمیرین آئی تھیں، آپ سورہ ہی تھیں، وہ یہ بُک دے کر گئی ہیں۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

”فرشتے آئی تھی؟“ وہ چونگی۔ پھر اس کی اشارہ کردہ کتاب کی طرف دیکھا تو سرزمیرین کی گئی۔ سفید، سادہ جلد والی دیزیز کتاب۔ اس کا سانس رُک گیا۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

”مصحف قرآن!“ وہ ذریل بڑا بڑا۔

”یا آپ کا قرآن ہے میڈم؟“ سرزمیرین نے اسے متوجہ پا کر احتیاط سے قرآن اٹھا کر اس کے سامنے کیا۔ اس نے بے قراری سے اسے تھاما اور پھر سینے سے لگایا۔

”مُؤْمِنْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، رَأَىٰ مَكَانَهُ؟“ (آپ کو اپنی مقدس کتاب بہت عزیز ہے نا؟) وہ مسکرا کر کہتی اسے بیٹھنے میں مدد دینے لگی۔

”آف کوں سرٹ!“ وہ بہت خوش تھی۔

پھر وہ بیٹھ گئی تو سرزمیرین نے اس کے پیچھے نیکے سیٹ کر دیئے۔

پھر سرٹ جانے کب وہاں سے گئی، اسے پتہ بھی نہیں چلا وہ بس اپنے قرآن میں گم تھی۔

اس نے دھیرے سے پہلا صفحہ کھولا تو عربی عبارات سے مزین اور اق سامنے آئے۔ اس کا دل ایک دم زعب سے بھر گیا۔ ہاتھ ذرا سے کپکپائے، لب لرزے، آنکھوں کے گوشے بھیگتے چلے گئے۔

اوہ خدا!..... وہ کتنی نوازی گئی تھی۔ اسے اللہ نے اپنے کلام کو تھامنے کا موقع دے دیا تھا۔ وہ اس کی سن لیتا تھا اور اس کو مخاطب بھی کرتا تھا۔ رسول کا یہ ساتھ بھلا کیسے ٹوٹ سکتا تھا؟

اس کی آنکھوں سے آنسو بننے لگے۔

وہ اسے بھولانہیں تھا، اس نے اسے یاد رکھا ہوا تھا۔

مholm ابراہیم اپنے رب تعالیٰ کو یاد تھی۔ کیا اسے واقعی اب کچھ اور چاہئے؟

اس نے شروع کے چند صفحات پڑے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر سے پڑھنا شروع کرے۔ پھر اس نے آغاز میں رکھے ایک بک مارک سے کھولا۔ وہ سورۃ بقرہ کے درمیان سے کھلا تھا۔ دوسرے سیپارے کے اوائل سے۔ رسول پرانا بک مارک جانے کب اس نے ادھر رکھا تھا؟

اس نے دھڑکتے دل سے پڑھنا شروع کیا۔

”بس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری مت کرنا۔“

آنوس کے رخساروں سے پھسل کر گردن پڑھ کر رہے تھے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے آپ کو خوشی میں یاد رکھا، آپ مجھے غم میں مت بھولیے گا، مگر لب کھل نہ پائے۔
اس نے آگے پڑھا۔

”اے ایمان والو! تم صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

ساتھ ہی حاشیے میں ہیں سے چھوٹا چھوٹا کچھ لکھا تھا۔ اس نے قرآن قریب کر کے پڑھنا چاہا۔ وہ اس کے اپنے لکھے تفسیر نوٹس تھے۔

”صیبت میں صبر اور نماز وہ دو سنجیاں ہیں، جو آپ کو اللہ تعالیٰ کا ساتھ دلواتی ہیں۔“

ان کے بغیر یہ ساتھ نہیں ملتا۔ اس لئے کوئی مصیبت آئے تو نماز میں زیادہ توجہ اور لگن ہوتا چاہے۔ مصیبت میں خاموشی کے ساتھ اللہ کی رضا پر راضی ہو کر جو کچھ موجود ہے، اس پر شکر کرنا اور اللہ کے آگے اچھی امید رکھنا صحیح معنی میں مجبور ہے۔“

یہ سب اس نے لکھا تھا؟..... وہ اپنے لکھے پر حیرت زدہ سی رہ گئی۔ کلاس میں آگے بیٹھنا، پھر کی ہر ایک بات نوٹ کرنا، وہ سب اسے کتنا فائدہ دے گا، اس نے تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

اس نے قدرے آگے سے پڑھا۔

”اوْرَ الْبَتَّةَ هُمْ تَهْمِسُونَ كَچھ چیزوں کے ساتھ ضرور آزمائیں گے۔ (یعنی) خوف سے اور بھوک سے، جانوں اور مالوں اور بچلوں کے نقصان سے..... اور خوش خبری دے دو ان کو، جو صبر کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، یہ کہتے ہیں، بے شک ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ان ہی لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے عطا ہتیں اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔“

اس نے ساتھ حاشیے میں لکھے اپنے الفاظ پڑھے۔

”صابرین کا مصیبت میں بس انا اللہ و انا الیہ راجعون کہہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ الفاظ ان دو عقائد کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جن پر مجھے بغیر کوئی صبر نہیں کر سکتا۔ ”انا اللہ“ (بے شک ہم اللہ کے لئے ہیں) عقیدہ توحید ہے۔ اور ”و انا الیہ راجعون“ (بے شک ہم اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے) عقیدہ آخرت پر ایمان ہے کہ ہر دکھ اور مصیبت ایک دن ختم ہو جائے گی اور اگر کچھ ساتھ رہے گا تو صرف آپ کے صبر کا اجر۔“

اس نے اگلی آیت پڑھی۔

”بے شک صفا اور مرودہ شعائر اللہ میں سے ہیں تو جو کوئی حج کا ارادہ کرے۔“ صبر کے فوراً بعد صفا مرودہ اور حج کا ذکر؟..... وہ ذرا حیران ہوئی، پھر اپنے ہاتھ کے لکھے نوٹ پڑھے۔

”صفا اور مروہ دراصل ایک عورت کے صبر کی نشانی ہیں، جب آپ کو بے قصور کسی پتے صحرائیں چھوڑ دیا جائے اور آپ اس توکل پر کہ اللہ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا، صبر کریں تو پھر زم زم کے میٹھے چشے پھونٹے ہیں۔“

اس کے بے قرار دل کو جیسے ڈھیروں ٹھنڈک مل گئی تھی۔ آنسوؤں کو قرار مل گیا۔ اندر باہر سکون سا اُتر گیا۔ اور اس کے بعد جیسے گھری خاموشی چھا گئی۔

سارے ماتم دم توڑ گئے تھے۔ اسے صبر آہی گیا تھا۔ اب رونے کا پھر تمام ہوا تھا۔ کتاب اللہ اس کے پاس تھی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ”امتنی“ تھی، دین کا علم اسے عطا کیا گیا تھا۔ اب کسی شکوئے کی گنجائش باقی نہ تھی۔ دور جاہلیت سے نکلنے والے انسان کی زندگی میں مکہ کی سختیاں، مدینہ کی جھرت، بدر کی جیت اور أحد کی شکست آتی ہے۔ طائف کے پتھر بھی آتے ہیں اور اسری اور معراج کی بلندیاں بھی۔ مگر آخر میں ایک فتح کا ضرور آتا ہے اور اس سفر میں کسی کا کمی دور بعد میں آتا ہے اور مدنی دور پہلے آ جاتا ہے۔

وہ ایک سال، جو اس نے ہمایوں کے ساتھ اپنے گھر میں گزارا، ایک پُر سکون، من چاہی ریاست تھی۔ وہ دور ختم ہو چکا تھا۔ اس کا مکہ اب شروع ہوا تھا۔ طائف کے پتھر اب لکھنے تھے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اگر وہ کمزوروں کا رب اس کے ساتھ ہے تو اسے بھی کسی عتبہ اور شبیہ کے باغ میں پناہ مل جائے گی۔ اسے بھی انکوڑ کے خوشے مل جائیں گے۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف کی دعا یاد آئی اور اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ تب ہی دروازہ کھول کر سڑا اندر داخل ہوئی۔ اسے جا گتا دیکھ کر ذرا سا مسکراتی اور آگے بڑھی۔

”کیا فیل کر رہی ہیں آپ؟“ وہ اسے لگی ڈرپ کو چیک کرنے لگی تھی۔

”ہوں.....“ وہ جیسے کسی خیال سے جاگی۔ ”فائز..... الحمد للہ!“

”آپ کو بہت نام بعث ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹر ڈھوب کھو چکے تھے۔“

”معلوم نہیں.....“ وہ قدرے بے بسی سے مسکراتی۔ ”میں نے تو وقت کا تعین بھی کھو دیا تھا۔“

”مايوسی کی باتیں مت کریں میم! خداوند آپ کی مدد کرے گا۔“
وہ ذرا سی چونگی۔ یہ انگور کے خوشے لے کر ہمیشہ نینوا کے عداس کیوں آتے
ہیں؟... اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

”ہاں، مجھے یقین ہے، وہ میری مدد کرے گا۔“ وہ کھل کر مسکرا دی۔ شاید پہلی دفعہ وہ
بیوں مسکرائی تھی۔ ”تمہارا اس کی مدد پہ کتنا ایمان ہے ستر؟“

”بہت زیادہ میم!..... کرائست مدد مانگنے والوں کو خالی نہیں لوٹاتا۔“

”ہوں۔“ وہ نرمی سے مسکراتی اس کا پُر یقین چہرہ دیکھے گئی۔ ”تم جانتی ہو، عیسیٰ علیہ
السلام کے بارے میں یہ قرآن کیا کہتا ہے؟“

نگل کو تھاے ستر میرین کے ہاتھ لمحے بھر کو تھے۔ اس نے ٹلکیں اٹھا کر اسے دیکھا،
اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت بھرا سوال اُبھرا تھا۔

محمد نے ایک ثانیے کو اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔

”ہینڈسم..... اے دیری ہینڈسم میں۔ ہی واڑ تج، عیسیٰ بن مریم۔“

”ترسلی؟“ ستر میرین کی آنکھوں میں دیپ سے جل اشے۔

”آف کوس! ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بے حد ہینڈسم تھے۔ بہت وجہ۔
صرف بیان نہیں، ان کے پاس رائٹنگ پاؤر بھی تھی۔ قلم کی طاقت۔ وہ بہت اچھا لکھتے
تھے۔ اور جانتی ہو، وہ اپنے ان مریکلز اور ٹیلنٹس کے بارے میں کیا کہا کرتے تھے؟“
”کیا؟“ وہ دم بخود، ہنا پلک جھکپے سن رہی تھی۔

”وہ کہتے تھے، یہ مجھے میرے رب نے سکھایا ہے۔“ وہ سافس لینے کو رکی، پھر جیسے
یاد کر کے بتانے لگی۔ ”جب سے مجھے یہ پڑھا چلا، میں اپنی کوئی بھی تعریف سن کر عیسیٰ
علیہ السلام کو کوٹ کرتی تھی۔ کوئی میری تعریف کرتا، تو میں کہتی یہ مجھے میرے رب نے
سکھایا ہے۔“

”بیوٹی فل.....!“ ستر میرین بے خودی کہہ اٹھی۔ پھر آہستہ سے چیزیں سمیٹنے لگی۔
”مسز ہمایوں! آپ پہلی مسلم ہو، جس نے بتایا ہے کہ آپ کی ہوئی بچک ایک بیو ع
سج کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ ورنہ مسلم ہمیشہ بہت سختی سے کہتے ہیں کہ تمہارا عقیدہ

غلط ہے۔“

”السلام علیکم!“ فرشتے نے جھانگا۔ ”تم اٹھ گئیں؟“

”ہاں، کب کی۔“ وہ چونکی، پھر سن بھل گئی۔ فرشتے اندر چلی آئی۔ عبا یا اور سیاہ جاپ کو چہرے کے گرد لپیٹنے ہمیشہ کی طرح تازہ اور خوب صورت۔

”آپ نے شادی نہیں کی فرشتے!“ محل نے کہا اور پھر اس نے دیکھا کہ فرشتے کی شہری آنکھوں میں سایہ سالہ رایا ہے۔

”شادی میں کیا رکھا ہے محل؟“ وہ پھیکا سامسکرائی۔

”سنست سمجھ کے کر لیں۔“

وہ سر جھکا سئے، چادر پر انگلی سے نادیدیہ لکیریں کھینچنے لگی۔

”پھر..... آپ شادی کر لیں گی نا؟“

”جب تک تم نجیک نہیں ہوتیں، میں شادی نہیں کروں گی۔“

”اور اگر میں بھی نجیک نہ ہوئی، تو؟“

”تو میرے لئے تم، ہمایوں اور تیمور بہت ہو۔ مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو، تمہاری فزیو تھراپی آنے والی ہوگی۔ اس سے بنانا کر رکھو، اب اس کو بھگانا نہیں ہے۔ گھر شفت ہو کر بھی روز اس کی ٹھکل دیکھنا تو ہوگی نا۔“ فرشتے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اور وہ ایک خیال اسے اطمینان بخش گیا۔

گھر..... اس کا گھر..... اپنا گھر..... اس ہفتے وہ واپس چلی جائے گی۔

اس نے ٹھانیت سے سوچا۔



سڑ میرین فائل ہاتھ میں پکڑے، پین سے اس میں کچھ اندر راج کر رہی تھی۔

محل، ٹکیوں کے سہارے نیک لگائے خاموش، گم صمری بیٹھی تھی۔ اس کے بھورے سیدھے بے بال شانوں پر پھلسنے کر پڑ رہے تھے۔ یہ بال بھی بے حد گھنے اور سلکی ہوتے تھے، مگر طویل بیماری نے انہیں بے حد پتلہ اور مر جھائے پھول کی پتیوں جیسا کر دیا تھا۔

”میڈم.....!“ لکھتے لکھتے ایک دم ستر نے سراٹھا یا۔ اس کے چہرے پر یک دھیر دل تھکر آئا تھا۔

”ہوں۔“ وہ چونگی۔ آج کل وہ پکارے چانے پر یوں ہی چونک اٹھتی تھی۔

”کافی دن ہو گئے، وہ نہیں آئے۔“

”کون؟“

”وہ کوئی صاحب ہیں۔ کافی عرصے سے آپ کو دیکھتے آ رہے ہیں۔ کافی بڑی عمر کے ہیں، اتنی لمبی داڑھی بھی ہے۔ بہت کاسنڈ اور جینفل سے ہیں۔“

”کب سے آ رہے ہیں؟“

”میں تین سال سے ادھر ہوں، جب سے انہیں آتا دیکھتی ہوں۔ عموماً فرائی ڈے کو آتے ہیں، بس ادھر سے جھاٹک کر۔“ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور مجھ سے آپ کا حال پوچھ کر چلے جاتے ہیں، کبھی آپ کے پاس رکے نہیں۔“

”کیا میرے کوئی رشتے دار ہیں؟“ سوال کرنے کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے پردے پر بہت سے چہرے ابھرے۔ آغا ہاؤس کے خوش حال و مطمئن چہرے۔ ایک کسی دل میں اٹھی۔ کیا ان کو وہ یاد ہو گی؟..... کیا کبھی اپنے عیش و آرام سے فرصت پا کر انہوں نے اس کے لئے چند لمحے نکالے ہوں گے؟
”نہیں..... وہ کہتے تھے کہ وہ آپ کے رشتے دار نہیں ہیں۔ بس یوں ہی جانے والے ہیں۔“

”فرشتے اور میرے ہر بینڈ ان کو جانتے تھے؟“

”ان کے ہوتے ہوئے تو وہ کبھی نہیں آئے۔ ہمیشہ ان کی غیر موجودگی میں آتے ہیں۔ مگر اب کافی دن ہو گئے، نہیں آئے۔“

”کوئی نام، اتنا پتہ؟“

”کبھی بتایا نہیں۔“ ستر اب دوبارہ فائل پر جگہی اندراج کرنے لگی۔ وہ ماہیوں سی ہو گئی۔ جانے کون تھا؟ کیوں آتا تھا؟
رات میں فرشتے آئی تو اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”مجھے ادھر دیکھنے کون کون آتا ہے فرشتے؟“

”ہم سب۔“ وہ اس کے بھورے بالوں میں برش کر رہی تھی۔

”آغا جان لوگ کبھی نہیں آئے؟“

”پتہ نہیں۔“ دونوں ہاتھوں میں اس کے بال پکڑ کر اس نے اوپر نچے کئے اور پونی پاندھی، پھر سیدھی لمبی پونی ٹیل کو احتیاط سے آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے برش کرنے لگی۔

”کوئی تو آیا ہو گا۔“

”میں تو ان لوگوں کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی محمل! پلیز، مجھے ذکر ملت دو۔“ اس کے انداز میں منت بھرا احتجاج تھا۔ پھر محمل کچھ نہ پوچھ سکی۔ سر جھکائے بال بنواتی رہی۔

”یہ دیکھو۔“ فرشتے نے پاکٹ مر اس کے چہرے کے سامنے کیا۔ اس نے جھکا سراٹھایا، آئینے میں اپنا عکس دکھائی دیا تو لمحے بھر کو وہ پہچان ہی نہ پائی۔

بے حد کمزور چہرہ، اندر کو دھنسے ہوئے گال، زردی مائل پھیکی رنگت، آنکھوں کے نیچے گبرے جامنی حلقة، پژمردہ، یمار، روکھا پھیکا سا چہرہ، اوپر اوپر نچی پونی ٹیل، جو کبھی اس تروتازہ سی محمل ابرا ہیم پر بہت اچھی لگتی تھی، اس یمار، لا غر محمل پر یہ بہت بری لگ رہی تھی۔

”رہنے دیں، مجھے یہ بال نہیں بنانے۔“ اس نے ہاتھ سے پونی پکڑ کر کھینچی۔ بال نکلنے سے نکل کر شانوں پر بکھر گئے اور پونی اس کے ہاتھ میں آگئی۔

”کیوں کھول دیئے؟“ فرشتے کو تاسف ہوا۔

”میں ایسے بال نہیں بنانا چاہتی۔ پلیز! مجھے دکھ ملت دیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے الفاظ لوٹا گئی۔ فرشتے چپ سی ہو گئی اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ اس وقت محمل کو تنہا چھوڑ دینا ہی بہتر ہو گا۔



ہمایوں کا گھر..... محمل کا گھر..... ہمایوں اور محمل کا گھر۔

وہ دیساہی تھا، جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ خوب صورتی سے آرائست، کونہ کونہ چکتا ہوا، فانوس کی روشنیاں، جگر جگر کرتی بتیاں، قیمتی پرے..... یہ ہی سب پہلے بھی اس کے گھر میں تھا، اب بھی تھا۔ مگر رنگ بدل گئے تھے۔ لاڈنخ کے صوفے، پرے، یہاں تک کہ گلے بھی بدل گئے تھے۔ چیزیں رکھی گوت تیب میں تھیں، مگر ان کا رنگ پہلے جیسا نہ تھا۔

ہر شے نئی تھی۔ جیسے ہمایوں تھا۔ اپنی جگہ پر یہی موجود، مگر پھر بھی بدل چکا تھا۔

”کیسا گا تمہیں اپنا گھر؟“ اس کی وہیل چیز یچھے سے ہکیلتی فرشتے خوش دلی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ گم صہم سی، خالی خالی آنکھوں سے درود دیوار کو دیکھئے گئی۔ سات سال پہلے وہ اس کا گھر تھا۔ اب شاید وہ صرف ہمایوں کا تھا۔

ڈاکٹر ز نے اس کا مزید ہسپتال میں رہنا بے فائدہ کہہ کر اسے گھر منتظر کر دیا تھا۔ اس کی بیماری وہیں تھیں۔ دایاں ہاتھ ٹھیک، بایاں ہاتھ و بازو ذرا سست اور نچلا دھر مکمل طور پر مغلون۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اچانک بھی ٹھیک ہو سکتی ہے اور ساری عمر بھی اسی طرح رہ سکتی ہے۔ بس آپ دعا کریں۔ اب وہ کیا کہتی، آپ کو لگتا ہے کہ ہم دعائیں کرتے؟ مگر اسکی باشیں کہی کہاں جاتی ہیں۔

فرشتے اسے لاڈنخ کے ساتھ بننے کرے کی طرف لے گئی۔ اس نے وہ اس کے مطابق سیٹ کر دادیا تھا۔

”مگر میرا کمرہ تو اور پر تھا فرشتے!“

”محمل! سیر ہیاں چڑھنا اس دلیل چیز کے ساتھ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

”اور ہمایوں کا سامان؟“ کچھ دیر بعد چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھی۔

”ان کا سامان کدھر ہے؟“

”ہمایوں تو..... میں نے اسے کہا تھا۔ مگر..... آئی تھنک، وہ اپنے کمرے میں زیادہ کفر نیبل ہے۔“

”تو وہ یہاں نہیں آئیں گے؟“ محمل شش درہ گئی۔

”کوئی بات نہیں محمل! وہ اسی گھر میں رہتا ہے، کسی بھی وقت آ، جا سکتا ہے۔“ فرشتے خواخواہ شرمende ہو رہی تھی۔

”نہیں فرشتے! تم ان سے کہو کہ وہ مجھے یوں اکیلا تو نہ کریں۔“

اس نے بے اختیار فرشتے کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد وہ صرف ایک دفعہ اس سے ملنے آیا تھا، پھر کبھی نہیں آیا۔

”محمل! پلیز..... میرے لئے تم دونوں بہت عزیز ہو۔ وہ کزن ہے اور تم بہن، اس لئے میں نہیں چاہتی کہ میری کسی بات سے وہ یا تم ہرث ہو۔ پلیز، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں تم دونوں کے پر سلوو میں دخل دوں۔ مجھے اس کا کوئی حق نہیں ہے۔“ اس نے بہت زمی سے اسے سمجھایا۔ وہ اس کے ہاتھ تھامے گھٹنوں کے مل اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ محمل لا جواب کی ہو گئی۔

”اور تیمور؟..... اس کا کمرہ کدھر ہے؟“ بے اختیار اسے یاد آیا۔

”لا دُنخ کے اس طرف والا کمرہ۔“

”ہمایوں اسے اپنے ساتھ نہیں سلاتے؟ وہ اتنا چھوٹا ہے، وہ اکیلا کیسے سو سکتا ہے؟“ اس کا دل تُرپ کر رہا گیا۔

”جن بچوں سے بچپن میں بھی ان کے ماں باپ دونوں چھن جائیں، وہ عادی ہو جاتے ہیں محمل! اگر وہ مجھے پسند کرتا ہوتا تو میں اسے ساتھ سلاتی مگر..... وہ مجھے پسند

نہیں کرتا۔“

”کیوں؟“ وہ نا سوچے بول اٹھی۔ جواباً فرشتے اُداسی سے مکرائی۔

”وہ تو تمہیں بھی پسند نہیں کرتا۔ کیا اس میں تمہارا قصور ہے؟“

محمل کا سرا آہستہ سے نفی میں مل گیا۔

”سواس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، اگر وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔ تم بیٹھو، میں کچھ کھانے کے لئے آتی ہوں۔ اب تم ناریل فوذ لے سکتی ہو، میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی تھی۔“ وہ جانے کے لئے کھڑی ہوئی تو محمل بے اختیار کہہ اٹھی۔

”آپ بہت اچھی ہیں فرشتے! میں بھی آپ کی اس کیسر کا بدلہ نہیں دے سکتی۔“

”میں نے بدلہ کب مانگا ہے؟“ وہ زی ہے اس کا گال تھپتھا کر باہر شکل گئی۔



دن پڑ مردگی سے گزرنے لگے۔

وہ سارا دن کمرے میں پڑی رہتی، یا فرشتے کے زبردستی مجبور کرنے پر باہر لان میں آتی اور وہاں بھی گم صم ہی رہتی۔ فرشتے ہی کوئی نہ کوئی بات کر کے اس کا ذہن بثا رہی ہوتی اور یہ باتیں عموماً فرشتے اس سے نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کی وہیل چیزِ دھکیلتے ہوئے بھی وہ کیا رہی میں گوڑی کرتے مالی سے مخاطب ہوتی تو بھی برآمدے کا فرش دھوتی ملازمہ سے۔ فرشتے اب اتنا نہیں بولتی تھی، جتنا پہلے بولتی تھی۔ اس کا انداز پہلے سے زیادہ سمجھیدہ ہو گیا تھا۔ اور یہ وقت کا اثر تھا۔ وہ اثر جونہ چاہتے ہوئے بھی وقت ہر انسان پر چھوڑے ہی جاتا ہے۔

فرشتے نے گھر کو اچھی طرح سے سنپھالا ہوا تھا۔ گوکہ ہر کام کی جزویتی ملازمائیں رکھی ہوئی تھیں، مگر تمام انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود وہ نہ کسی پر حکم چلاتی، نہ اس گھر کی پرائیویسی میں دخل دیتی تھی۔ محمل یا ملازموں سے بات کرنے کے علاوہ وہ زیادہ کلام بھی نہ کرتی تھی۔ تیمور اور ہمایوں کے کمرے کے اندر وہ بھی نہیں جاتی تھی، بلکہ دوازے پر کھڑے ہو کر صفائی کرواتی۔ ملازموں کو تشوہہ ہمایوں دیتا تھا۔

فرشتے گیست روم میں ہی قیام کرتی تھی۔ وہ بھی شدید ضرورت میں۔ اور تیمور تو ویسے بھی

ہر شے سے چوڑا ہوا لڑکا تھا۔ سو وہ اسے مخاطب نہیں کرتی تھی۔ بھی جو کر لے تو تیور اس بد تیزی سے پیش آتا کہ الامان۔

محمٰل نے نوٹ کیا تھا کہ تھوڑی دیر بد تیزی کر کے تیور چینخے چلانے پا آ جاتا تھا اور اگر مزید کچھ کہا جائے تو وہ چیزیں اٹھا کر توڑ پھوڑ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔

فرشتے بہت محتاط طریقے سے اس گھر میں رہ رہی تھی، جیسے اس کے ذہن میں تھا کہ اسے جلد ہی یہاں سے چلے جانا ہے۔ ملازمہ بلقیس نے اسے بتایا تھا کہ فرشتے اپنے پیسوں سے ماہانہ راشن کی چیزیں لے کر آتی تھی۔ خصوصاً چکن اور گوشت ہمیشہ وہ خود ہی خریدتی تھی۔ جب ہمایوں کو پتہ چلا اور اس نے اسے روکنا چاہا تو فرشتے نے صاف کہ دیا کہ اگر اس نے اسے روکا تو وہ واپس اسکاٹ لینڈ چلی جائے گی۔ نتیجتاً ہمایوں خاموش ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ اور شاید اس کے ذہن میں ہو گا کہیں کوئی اسے مفت خورانہ سمجھے۔ اپنی عزت نفس اور وقار کو اس نے ہمیشہ قائم رکھا تھا۔ محمٰل خود کو اس کا زیر بار محسوس کرنے لگی تھی۔

ہمایوں سے اس کی ملاقات نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ وہ بھی دوپھر میں گھر آتا اور بھی رات کو۔ کھانا وہ اپنے کمرے میں کھاتا۔ اور پھر وہیں رہتا۔ اکثر بہت رات گئے گھر آتا۔ وہ انتظار میں لا دُنج میں دھیل چیز پہ بیٹھی ہوتی۔ وہ آتا، سرسری سا حال پوچھتا اور اپر سیڑھیاں چڑھ جاتا اور وہ اس کی پشت کو نم آنکھوں سے دیکھتی رہ جاتی۔

تیور دوپھر میں اسکول سے آتا تھا۔ وہ کھانا ڈائننگ ٹیبل پر اکیلے کھاتا تھا۔ اگر محمٰل کو ادھر بیٹھے دیکھتا تو فوراً واپس چلا جاتا۔ نتیجتاً بلقیس اسے اس کے کمرے میں کھانا دے آتی۔ وہ جنک فوڑ کھاتا تھا۔ برگ پیٹر کے ڈبوں سے فریزر اور فرنچ فراز کے لئے آلوؤں سے بزری والی ٹوکری بھری رہتی۔ کھانے پینے کا وہ بہت شوقیں نہ تھا۔ اسکول سے لائے چیس کے پیکش اور چاکٹیش عموماً کھاتا نظر آتا۔ شام کوئی وی لا دُنج میں کارٹون لگائے بیٹھا رہتا۔ اگر محمٰل کو آتے دیکھتا تو اٹھ کر چلا جاتا۔

وہ جان ہی نہ پار رہی تھی کہ وہ اتنا ناراض کس بات پر ہے؟ آخر اس نے کیا ہی کیا

ہے؟

اس گھر کے وہ تین لکھیں اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے اور اب وہ چوتھی اجنبی ان کی اجنبیت بیان نہ کو آگئی تھی۔

فرشته شام میں شاید مسجد جاتی تھی۔ وہ غالباً اب شام میں کلاسز لے رہی تھی۔ محل نے ایک دفعہ پوچھا تو وہ اداسی سے مسکرا دی تھی۔

”صبح کی کلاسز لینا ہسپتال کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔“ مختصرًا بتا کر وہ جواب درست کرتی باہر نکل گئی تھی۔

وہ محل کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کی دوا، مساج، مفلونج اعضاء کی ایکسرسائز، فرنیچر اپٹ کے ساتھ اس پر محنت کرنا، پھر غذا کا خیال۔ وہ ان تھک لگی رہتی۔ بلا کسی اجر کی تمنا کئے یا احسان جتائے۔

اس شام بھی فرشته مسجد گئی ہوئی تھی، جب سیاہ بادل آسمان پر چھانے لگے۔ ہمیوں تو کبھی بھی شام میں گھر نہیں ہوتا تھا۔ تیمور جانے کہاں تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر منظر دیکھ رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دن میں رات کا سماں بندھ گیا، بادل زور سے گرجنے لگے۔ موٹی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں۔ بجلی کٹ کر تو ایک لمحے کو خوف ناک سی روشنی بکھر جاتی۔

اسے بارش سے پہلے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ مگر آج لگ رہا تھا۔ ہمیوں نہیں تھا، فرشته بھی نہیں تھی، اسے لگا وہ بہت اکسلی ہے، تہا ہے۔

بجلی بار بار کڑک رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی تھی۔ بے اختیار اسے پسند آنے لگا۔ کیا کرے؟..... کسے بلائے؟

وہ تیزی سے دھیل چیز کے پہنچے دونوں ہاتھوں سے چلاتی لاڈنچ میں آئی۔ فون ایک طرف تپائی پر دھرا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چٹ بھی تھی، جس پر ہمیوں اور فرشتے کے نمبر لکھے تھے۔ وہ غالباً تیمور کے لئے لکھے گئے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے رسیور اٹھایا اور فرشتے کا نمبر ڈائل کیا، پھر رسیور کان سے لگایا۔

گھنٹی جا رہی تھی، مگر وہ اٹھانے رہی تھی غالباً کلاس میں تھی۔ اس نے ماہی سے فون

رکھ دیا۔ تب ہی نگاہ دوبارہ اس چٹ پ پڑی۔

پچھے سوچ کر اس نے دھڑ کتے دل کے ساتھ ریسیور دوبارہ اٹھایا۔ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔

تیری گھنٹی پہ ہمایوں نے ہیلو کہا تھا۔

”ہے..... ہیلو..... ہمایوں!“ وہ بمشکل بول پائی تھی۔

”کون؟“

”میں.... محمد۔“

دوسرا جانب ایک لمجھ کو سنانا چھا گیا۔

”ہاں بولو!“ مصروف، سرد مہر سی آواز اُبھری۔

”آپ..... آپ کہہ رہے ہیں؟“

”پر ابلیم کیا ہے؟“ قدرے بے زاری۔

”وہ..... وہ باہر اسٹورم (طوفان) آ رہا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز! آپ گھر آ جائیں۔“ اس کا گلارندھ گیا، آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”اوہو..... میں مینگ میں بیٹھا ہوں۔ ابھی کہاں سے آ جاؤں؟“

”مجھے نہیں پتہ، پلیز آ جائیں، جیسے بھی ہو۔“ باہر طوفان کا شور بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی۔

”میں نہیں آ سکتا۔ فرشتے یا کسی ملازمہ کو بلا لو۔“ وہ جھلکایا تھا۔

”فرشتے گھر پر نہیں ہے۔ آپ آ جائیں ہمایوں! پلیز.....“

”کیا بکواس ہے؟ اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم مخذولی کا ڈرامہ رچا کر میری ہمدردی حاصل کر سکتی ہو تو اس خیال کو دل سے نکال دو اور مجھے میری زندگی بھینے دو۔ خدا کے لئے اب چیچھا چھوڑ دو میرا۔“ اور ٹھک سے فون بند ہو گیا۔

وہ سکتے کے عالم میں ریسیور ہاتھ میں لئے سن سی پیشی رہ گئی۔ کتنے لمجھے گزرے، کتنے بادل گر جے، کتنی بجلی چمگی، کتنے قطرے بر سے، وہ ہرشے سے غافل، دنا پلک جھپکے شل سی پیشی تھی۔ لب ادھ کھلتے، آنکھیں پھٹی پھٹی اور ہاتھ میں پکڑا ریسیور کان سے لگا.....

وہ کوئی مجسمہ تھا جو ٹیلی فون اسٹینڈ کے ساتھ اس وہیل چیز پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پھر کتنی دیر بعد ریسیور اس کے ہاتھ سے پھلا اور نیچے لٹھک گیا۔ اس کے زمین سے ٹکرانے کی آواز پر بے اختیار اس نے پلکیں جھپکیں اور آن کی آن میں اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں..... اس کی بھی بندھ گئی تھی اور پورا وجہ لرز رہا تھا۔ وہ پھوپ کی طرح بلک بلک کر رہی تھی۔

ہمایوں نے اسے وہ سب کہا تھا؟..... اتنے غصے اور بے زاری سے، جیسے وہ اس سے اکتا چکا تھا۔ ہاں، وہ مرد تھا۔ وجیہ، شاندار سامرو، کب تک ایک کوئے میں بے ہوش پڑی، تم مژدہ بیوی کی پیٹ سے لگا رہتا؟ اس کو اب محمل کی ضرورت نہ تھی۔ اسے اب محمل کے وجود سے بھی اکتا ہٹ ہوتی تھی۔ شاید وہ اب اس سے شادی کرنے پر بچھتا رہا تھا۔ اپنی وقتی جذبہ انتیت پر ناوم تھا۔ دفعہ آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں۔

تیمور سامنے صوفی کے اس طرف کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ چھپتی، خاموش نگاہیں.... جن میں عجیب ساتھ رکھتا تھا۔

”تیمور.....!“ اس کی زخی مامتا بلبلائی۔ ”ادھر میرے پاس آؤ پیٹا!“ اس نے دونوں ہاتھ پھیلانے، شاید وہ اس کے گلے سے لگ جائے، شاید کہ ہمایوں کے روئیے کی پیش کچھ کم پڑ جائے۔

”آلی ہیٹ بُو۔“ وہ ترک کر بولا اور اسے دیکھتے ہوئے دو قدم چھپے ہٹا۔ ہمایوں کے الفاظ کیا کم تھے جو اور پر سے اس سات سالہ لڑکے کا انداز۔ اس کی روح تک چھلنی ہو گئی۔

”میں نے کیا کیا ہے تیمور؟ تم ایسے کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ؟ کیوں نہ ارض ہو مجھ سے؟“

”یو لیفت می دین آلی نیڈ ڈیو۔“ (آپ نے مجھے اس وقت چھوڑ دیا جب مجھے آپ کی ضرورت تھی) وہ زور سے چینا تھا۔ ”آلی ہیٹ یو فار ایوری تھنگ۔“

وہ مڑ کر بھاگتا ہوا اپنے کرے میں چلا گیا۔ لمحے بھر بعد اس نے زوردار آواز سے

تیمور کے کمرے کے دروازے کو بند ہوتے سن۔

”کیا تمہیں چھوڑنے میں میرا اپنا اختیار تھا تیمور؟..... تم اتنی سی بات پر مجھے ناراض نہیں ہو سکتے۔ شاید تمہارے باپ نے تمہیں مجھے سے بدٹن کیا ہے۔“

وہ ذکھی دل سے سوچتی واپس کمرے تک آئی تھی۔ اس کے ripple بیڈ کی سائیڈ نیبل پر سفید کور والاقرآن رکھا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اسے اٹھایا اور دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے سامنے کیا۔

سفید کور پر مدھم سا، مٹا مٹا سا ”م“ لکھا تھا۔ جانے اس نے کیوں اور کب ادھر لکھا تھا؟ وہ کوشش کے باوجود یاد نہ کر پائی۔ پھر سر جھٹک کر اسے وہاں سے کھولا، جہاں سے فجر کے بعد تلاوت چھوڑی تھی۔ اس نے وہ آیت دیکھی، جہاں بک مارک لگا تھا، پھر تعوذ و تسلیمہ پڑھا اور اگلی آیت سے پڑھنا شروع کیا۔

”ہم جانتے ہیں کہ تمہیں ان کی بات غمگین کرتی ہے۔“

اس نے بے قینی سے اس آیت کو دیکھا۔

”ہم جانتے ہیں کہ تمہیں ان کی بات غمگین کرتی ہے، پس بے شک وہ تمہیں نہیں جھلاتے، بلکہ وہ ظالم تو اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں۔“ اس نے پھر سے پڑھا اور پھر دم بخودی ہو کر ایک حرف کو انگلی سے چھونے لگی۔ کیا وہ واقعی ادھر لکھا تھا؟

”اوہ....اللہ تعالیٰ!“ اس کے آنسو پھر سے گرنے لگے تھے۔ آپ کو....آپ کو ہمیشہ پتہ چل جاتا ہے، میں.....میں بھی بھی آپ سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔ وہ بری طرح رو دی تھی۔ اب کی باریہ دکھ کے آنسو نہ تھے، بلکہ خوشی کے تھے۔ سکون کے تھے، رضا کے تھے۔

”اگر آپ مجھے سے یوں ہی بات کرتے رہیں تو پھر مجھے جس حال میں بھی رکھیں، میں راضی! میں راضی!“ اس نے چہرہ اٹھایا اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کئے۔

اب اسے رونا نہیں رکھا۔ اب اسے صبر کرنا تھا۔ طائف کے پھر دراصل اب لگنے شروع ہوئے تھے۔

جبر اور شکر..... اس نے ان دو سہاروں کو بالآخر تھام ہی لیا تھا۔



شام بہت سہانی سی اُتری تھی۔ کالونی کی صاف سڑک کے اطراف بزرگ ختوں کے تازہ پتوں کی مہک، سخنڈی ہوا سے ہر سو بکھر گئی تھی۔

بلقیس اُس کی وہیل چیزِ دلکشی سڑک کے کنارے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی چھوٹی موٹی باتیں بھی کر رہی تھی۔ مگر محمل کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ گم ہم سی ذور افیق کو دیکھ رہی تھی، جہاں پرندوں کے غول اثر ہے تھے۔ اس روز کے طوفان کے بعد موسم بہت سخنڈا ہو گیا تھا اور اس سخنڈی ہوا میں باہر گلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

بلقیس اُس کی وہیل چیزِ دلکشی ذور پارک تک لے آئی تھی۔ اس سے آگے ان کے سکنٹر کا مرکز تھا۔ وہاں بوتیکس، شاپس اور ریسورنٹ کی چیل پہل ہوتی تھی اور اسکی جگبؤں پر جاتے ہوئے اس کا دل گھبرا تا تھا، سواس نے بلقیس کو آگے جانے سے منع کر دیا۔

”بس میں پارک تک نہیں ہے، اسی میں چلتے ہیں۔“

بلقیس سر ہلا کر وہیل چیزِ اندر لے جانے لگی۔

”جب آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو انہیں محمل بی بی! تو صاحب بہت روئے تھے۔ میں نے خود انہیں روئے دیکھا تھا۔ بہت دھچکا لگا تھا ان کو۔“

”کون..... ہمایوں؟“ وہ چونکی تھی۔

”ہاں جی۔ انہوں نے چیزی لے لی تھی۔ کئی ماہ تو وہ ہسپتال میں آپ کے پاس عی رہے تھے۔ تیمور بابا کو تو مخلص ہی دیا تھا۔ میں نے بڑا کیا ہے جی تیمور بابا کو۔ بڑا پیارا بچہ تھا ہمارا بابا۔ جب چار سال کا تھا تو آپ کے لئے پھول لے کر جاتا تھا، اور وہاں ہسپتال میں آپ کے سرہانے بیٹھ کر گھنٹوں بولا کرتا تھا۔“

”پھر اب کیا ہوا ہے اسے بلقیس؟“ اس نے دکھ سے پوچھا تھا۔

بلقیس آہستہ آہستہ پارک کی پتھریلی روشن پر وہیل چیز چلا رہی تھی۔ ذور گھاس پر پچے کھیل رہے تھے۔ ایک طرف ایک بچہ ماں کی انگلی پکڑے رورہا تھا۔ اسے ہر پچے میں اپنا تیمور نظر آ رہا تھا۔

”تیمور بابا ایسا نہیں تھا بلی! وہ تو بہت پیار کرنے والا بچہ تھا۔ مگر پھر اب چھپلے وہ ایک سالوں میں وہ بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ صاحب بھی تو اسے توجہ نہیں دیتے۔ پہلے تو چھوٹا تھا، پر اب بہت سمجھہ دار ہو گیا ہے۔ ساری باتیں سمجھتا ہے، اسی لئے سب سے ناراض رہتا ہے۔“

”اور تمہارے صاحب؟ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟“

”پتہ نہیں بلی! وہ شروع میں آپ کا بہت خیال رکھتے تھے، پھر آپ کے حادثے کے چوتھے برس ان کی کراچی پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ وہ سوا سال ادھر رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو بہت بدل گئے تھے جی۔ اب تو ڈیڑھ سال ہو گیا ہے ان کو واپس آئے ہوئے، مگر اب تو وہ آپ کا یا تیمور بابا کا حال بھی نہیں پوچھتے۔“

”کراچی میں ایسا کیا ہوا تھا، جو وہ بدل گئے؟“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی تھی۔

”معلوم نہیں بلی! اگر.....“ وہ لمجھے بھر کو چکچائی۔ ”ان کے کراچی جانے سے کوئی دو ہفتے پہلے مجھے یاد ہے، ادھر آپ کے گھر آپ کے کوئی رشتہ دار آئے تھے۔ ان سے بہت..... بہت لڑائی ہوئی تھی صاحب کی۔“

”کون؟..... کون آیا تھا؟“ اس نے وحشت زدہ سی ہو کر گردن گھمائی۔ بلقیس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔

”اصل میں بلی! آپ کے رشتہ دار کبھی آئے نہیں، تو وہ جو بس ایک ہی دفعہ آئے تو مجھے یاد رہ گیا۔ آپ کے تایا کے بیٹے تھے۔“

”کون؟..... فو..... فواد؟“ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

”نام و ام تو نہیں معلوم، مگر صاحب نے ان سے بہت جھگڑا کیا تھا۔ دونوں بہت دریتک او نچا او نچا لڑتے رہے تھے۔“

”مگر ہوا کیا تھا؟..... جھگڑا کیوں ہوا ان کا؟“ وہ مضطرب اور بے چینی ہو گئی تھی۔

”میں کچن میں تھی بلی! کچھ سمجھہ میں تو نہیں آیا کہ وہ کیوں لڑ رہے تھے، مگر شاید کوئی کچھری دغیرہ کا معاملہ تھا۔ اور دونوں آپ کا نام بار بار لیتے تھے۔ پھر صاحب نے رشتے بلی بلی کو بھی ادھر بلوالیا۔ وہ پتہ نہیں کچھ بولیں یا نہیں، ان کی آواز ہی نہیں آئی۔“

مجھے۔ پھر وہ آپ کے تایا زاد چلے گئے اور صاحب دیر تک فرشتے بی بی پہ چھنے رہے۔ میں لھانے کا پوچھنے کی تو دیکھا کہ فرشتے بی بی رو رہی تھیں اور اپنا سامان پیک کر رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ جا رہی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کہہ تو بولیں، پتا نہیں۔ وہ رو تی جا رہی تھیں۔ پھر اگلے دن رشید نے بتایا کہ صاحب اپنا ٹرانسفر کراچی کروار ہے ہیں۔ پھر صاحب چلے گئے اور فرشتے بی بی رک گئیں۔“

وہ دم سادھے ساری تفصیلات سن رہی تھی۔ اس کے پیچھے کیا کیا ہوتا رہا، اسے خبر ہی نہیں ہو سکی۔ کیا فواد نے ہمایوں کو اس کے خلاف بہکایا تھا؟ اور فرشتے کو اس نے ایسی کیا بات کی کہ وہ روئی؟ وہ تو بہت مضبوط لڑکی تھی، یوں کبھی نہیں روئی تھی۔ اس نے تو اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔

”اوہ خدا یا!“ اس نے سرد نوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

وہ کیا کرے؟ کس سے پوچھئے؟..... فرشتے تو کبھی نہ بتاتی۔ ہمایوں سے بھی امید نہیں تھی۔ اور تیمور تو اسے دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ پھر؟..... کیا کرے.....؟

”صبر اور نماز کا سہارا۔“

اس کے دل سے آواز اٹھی تھی۔

بلقیس کو کوئی جاننے والی مل گئی تو وہ اس سے باشیں بگھارنے ذرا فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔

محل نے قرآن اٹھا لیا۔ وہ قرآن لئے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اسے آہستہ سے کھولا۔ کل جدھر سے تلاوت چھوڑی تھی، ان آیات پہ نشان لگا تھا۔ وہ غور سے، دھیان سے آگئے سے پڑھنے لگی۔

”آے وہ لوگو! جو ایمان!“ ہے ہو، تم ان چیزوں کے پارے میں سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔“ (ماائدہ-10)

لئے پھر کو اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا، مگر پھر فوراً خود کو سرزنش کی۔

”یہ کوئی فال نکالنے کی کتاب تو نہیں ہے، اسی لئے اس نے مجھے ایسے سوال کرنے سے منع کیا ہے۔ میں بھی خواخواہ..... وہ سر جھک کر آہستہ سے آگے تلاوت کرنے لگی۔“

اگلی آیات دوسری چیزوں سے متعلق تھیں۔ اس کی سوچوں پر بالکل خاموش، لب سے کسی اور طرف توجہ مبذول کرواتیں..... اس کے انجھے دماغ کو سکون آنے لگا۔ جو بھی ہوا، کبھی نہ کبھی کھل ہی جائے گا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ زیر لب تنہ سے تلاوت کرنے لگی۔

۴۰۶

رات کے دونج پکے تھے اور ہمایوں ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ وہ مضطرب سی لاونج میں بیٹھی تھی۔ بار بار دیوار پر آویزان گھڑی کو دیکھتی اور پھر دروازے کو۔ گھڑی کی سویاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ مگر دروازہ ہنوز ساکت و جامد تھا۔ باہر بھی خاموشی تھی۔

اس کے دل میں دسوئے سے آنے لگے۔ نہ جانے وہ تھیک بھی ہے یا نہیں، کیا پتہ اس کی گاڑی خراب ہو گئی ہو، کیا پتہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہو۔ اس نے بے اختیار اس کے لئے دعا کی تھی۔

دفعہ گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور پھر گیٹ کھلنے کی آواز۔ وہ مژکر دروازے کو پیاسی نظرؤں سے دیکھنے لگی۔

قدموں کی آواز اور پھر..... بھاری چੋپاہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا کیپ اور اسٹک ہاتھ میں لئے وہ تھکا تھکا سایونی فارم میں چلا آ رہا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے مژکر دروازہ بند کیا اور پھر چند قدم آگے آیا۔ دفعہ اسے بیٹھا دیکھ کر ہمایوں کے قدم تھے۔ چہرے پر حیرت بھری تا گواری اٹھ آئی۔

”تم ادھر کیوں بیٹھی ہو؟“

”السلام علیکم!..... آپ کا دیکھ کر رہی تھی۔ آپ نے بہت دیر لگا دی۔“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

”میں دیر سے آؤں یا جلدی آؤں، خدا کے لئے میرے انتظار میں ادھر مت بیٹھا کرو۔“

اس نے بہت تحمل سے اس کا پیزار لہجہ سنا، پھر دیرے سے بولی۔ ”میں پریشان ہو گئی تھی کہ خیریت....“

”منہیں گیا تھا میں، سو کام ہوتے ہیں۔ اگر آئندہ تم مجھے ادھر پیشی ملیں تو میں گھر ہی نہیں آیا کروں گا۔ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو محمل!“ وہ جھٹک کر کہتا تیزی سے اوپر سڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

اس نے بڑے صبر و ضبط سے آنسو پی لئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دروازے کے پیچھے گم ہو گیا۔ تب اس نے گود میں دھرے ہاتھ اٹھائے اور اپنی وہیل چیز کو کمرے کی طرف موڑنے لگی۔

بھی تو اسے احساس ہو گا کہ یہ وہی محمل ہے جو کبھی اس کی من چاہی بیوی تھی۔ اور جب وہ یہ محسوس کرے گا تو پلٹ آئے گا۔ اسے یقین تھا۔ اور یہی یقین اس نے دل میں اٹھتے درد کو دلا کر دبا یا تھا۔



وہ تارکوں کی سڑک پر آج پھر بلقیس کے ساتھ اپنی وہیل چیز پر جا رہی تھی۔ باہر کا موسم اس کی طبیعت پر بہت اچھا اثر ڈالتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی معدودی میں رتی برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔

بلقیس ادھر ادھر کی باتیں کرتی اس کی وہیل چیز وہ کیل رہی تھی۔ وہ آج بھی اسے نہیں سن رہی تھی۔ بس خاموش مگر پر سکون نگاہوں سے دور افق کو دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ تھہرا دا اس کی شخصیت کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔

”بلقیس! تمہیں میرے تایا کے گھر کا پتہ ہے؟“ ایک دم ہی کسی خیال کے تحت وہ چوکی اور پھر پوچھ دیا۔

”نہ بی بی! میں تو ادھر بھی نہیں گئی۔“

”اچھا..... مگر مجھے راستہ یاد ہے، تم مجھے ادھر لے چلوگی؟“

”پیدل؟“ وہ حیران ہو گئی۔

”ہاں..... زیادہ دور نہیں ہے۔ جتنا فاصلہ یہاں سے مرکز تک کا ہے، اتنا ہی ہے۔ میں پیدل بھی آ جایا کرتی تھی۔“ اسے بے اختیار وہ شام یاد آئی، جب ویسے اپنے رشتے کا سن کر وہ روتوی ہوئی، پیدل ہی مسجد کے سامنے سڑک پر آگئی تھی۔ اور اس نے

ہمایوں سے کہا تھا کہ وہ نیچ راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے نہیں۔ اور پھر.....
”چلیں پھر نہیک ہے۔ آپ راستہ بتائیں۔“ بلقیس کی آواز پہ وہ یادوں کے ہجوم
سے نکلی اور راستہ بتانے لگی۔ چھوٹی سڑک سے ایک راستہ نہیں سے ہوتا ہوا ان کے سیکھر
میں جا اترتا تھا، جس سے وہ بیس منٹ میں ادھر پہنچ سکتی تھیں۔

آج وہ بیس منٹ ایک پوری صدی لگ رہے تھے۔ وہ اس راستے پر جاتے ہی دور
کہیں کھو گئی تھی۔ نہ جانے وہ سب کیسے ہوں گے؟ اتنے ہی عیش و آرام سے رہ رہے
ہوں گے جتنے پہلے تھے؟ کیا ان میں سے کسی نے اس کو یاد بھی کیا ہو گا؟..... بھی وہ
ہسپتال بھی آئے ہوں گے یا نہیں؟ اور نہ جانے فواد نے جا کر ہمایوں سے کیا کہا تھا،
جس پر فرشتہ روئی رہی؟ بہت یاد کرنے پر بھی ایسی کوئی بات ذہن میں نہیں آئی، جو وہ
ہمایوں سے یوں کہہ سکتا یا شاید اس کی سوچنے کی صلاحیت اب سست ہوتی جا رہی تھی۔
”یہ آپ کا گھر ہے جی؟..... یہ اسوہ ہنا ہے۔“

بلقیس کہہ رہی تھی۔ اور وہ چونک کر اس اونچے عالیشان محل نما گھر کو دیکھنے لگی۔ اس
کا پینٹ، کھڑکیوں کے شیشے اور بیروفی گیٹ بدل گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب
صورت ہو گیا تھا۔

یہ وہ گھر تھا، جہاں اس نے اپنی زندگی کے ایکس سال گزارے تھے اور پھر اسی سے
وہ ایک رات نکالی گئی تھی۔ بظاہر خصتی کی آڑ میں اسے اس گھر سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔
”بیتل بجاوَ بلقیس!“

بلقیس آگے بڑھی اور سمجھنی بھیجی۔ چند ہی لمحوں بعد قدموں کی چاپ سنائی دی، جیسے
کوئی دوڑتا ہوا گیٹ کھولنے آرہا ہو۔ اس کے دل کی دھڑکن خبری گئی۔ وہ اتنے سالوں
بعد کسے دیکھنے جا رہی تھی؟..... فواد؟ حسن؟ آغا جان؟

در دواز آہستہ سے کھلا اور کسی نے سر باہر نکال کر دیکھا۔

”جی، کس سے ملتا ہے؟“ وہ حلیے اور بچے سے ملازم لگتا تھا۔

بلقیس نے جواباً محمل کو دیکھا تو ہمت مجتمع کر کے بولی۔

”آغا کریم گھر پر ہیں؟“

لازم کے چہرے پر ذرا سی انجھن ابھری۔

”کون آغا کریم؟“

”آغا..... آغا کریم۔ جو اس گھر کے مالک ہیں۔ جن کا یہ گھر ہے اور یہ
ہاؤس نمبر ٹو تھرٹی ہے نا؟“

”آہو جی۔ یہ ٹو تھرٹی ہے۔ مگر یہ تو چودھری نذیر صاحب کی کوئی کوئی
آغا کریم نہیں رہتے۔“

”لبی! کہیں ہم غلط گھر میں تو نہیں آگئے؟“ بلقیس نے ہولے سے کہا تو اس نے
نخنی سے نخنی میں سر ہلاایا۔

”نہیں، یہی گھر ہے۔ آغا کریم سات سال پہلے ادھر ہی رہتے تھے۔“

”سات سال تو بڑاuba عرصہ ہوتا ہے میڈم جی! خدا جانے وہ اب کدر گئے ہوں
گے۔ اچھا، آپ ٹھہرو، میں بیگم صاحبہ سے پوچھ کر آتا ہوں۔“ وہ انہیں دیں چھوڑ کر اندر
چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ایک نوجوان کے ہمراہ ہوئی۔

”جی فرمائیے؟“ وہ بیس برس کا مہذب اور شاستر سانو جوان تھا۔

”وہ..... ادھر آغا کریم اور ان کی فیملی رہتی تھی، وہ لوگ کدر گئے؟“

”میں! ہم دو سال سے ادھر رہ رہے ہیں۔ دو سال پہلے ہم نے ایک شخص عامر
صاحب سے یہ گھر خریدا تھا۔ ہو سکتا ہے، ان کو آغا کریم نے یہ بیچا ہو، مگر میں ان کے
بارے میں قطعی لا علم ہوں۔“

”آغا جان نے یہ گھر بچ دیا؟..... مگر کیوں؟“ وہ شاکڑی رہ گئی۔

”معلوم نہیں میں! کیا میں آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟“

اس کا سر نخنی میں دائیں سے باسیں ہلا۔ لڑکا مخذلت کر کے واپس چلا گیا اور وہ
پریشان سی بیٹھی رہ گئی۔

”لبی! ہمسایوں سے پوچھتے ہیں۔“ اور اس کے منع کرنے سے قبل ہی بلقیس ساتھ
والے گھر کی گھنٹی بجا چکی تھی۔ اس گھر میں کون رہتا تھا؟ خاصا جانا پہچانا سا گھر تھا، مگر یاد
نہیں آ رہا تھا۔

بمشکل ایک منٹ بعد ہی گیٹ کھل گیا۔ محمل نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

ادھر کھلنے گیٹ کے اس پار بریگیڈ یور فرقان کھڑے تھے۔

شلووار قیض میں لمبیں، چہرے پر نفاست سے تراشیدہ داڑھی اور بھرپور مسکراہٹ لئے وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔

”السلام علیکم لٹل گرل! میں کافی دری سے آپ کو نیرس سے دیکھ رہا تھا۔ آئیے، اندر آ جائیں۔“ انہوں نے گیٹ پورا کھول دیا اور ایک طرف کو ہٹ گئے۔

بلقیس اس کی وہیل چیز و حکیمتی اندر روشن پہنچ لے آئی۔

”ادھر آ جائیے۔“ وہ لان میں گھاس پر رکھی لان چیز ز کو جوڑنے لگے، یوں کہ وہیل چیز کی جگہ بن جائے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے اور بہت شاگردی سے پوچھنے لگے۔ ان کا مخصوص لب والہ اسی طرح بھاری تھا، البتہ سختی کی جگہ زمی نے لے لی تھی۔

”ٹھیک ہوں، الحمد للہ!“ وہ ذرا سما مسکرائی اور سر جھکا لیا۔ پھر کچھ سوچ سوچ کر اسی جھکے سر کے ساتھ کہنے لگی۔

”میرا کچھ سال پہلے ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا، تو.....“

”میں جاتا ہوں۔ میں آپ کو دیکھنے، ہسپتال آتا تھا۔“

اس نے ہولے سے سر اٹھایا۔ سنہری آنکھوں میں حیرت اتر آئی تھی۔

”چھا؟“ اور پھر اسے یاد آ گیا۔ ”ہاں، مجھے زس نے بتایا تھا۔ تو وہ آپ تھے؟“

”مجی ہاں۔“ وہ دستی سے مسکرائے۔ ”آپ کی امانت نے میری زندگی بدل دی بیٹا!“

وہ ڈنالپک جھکے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”میں نے دو سال وہ پمپلٹ نہیں کھولے، پھر زندگی میں ایک موڑ ایسا آیا کہ ہر جگہ اندر ہیرا دیکھنے لگا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ان کو کھول لیا۔ میرا خیال تھا، ان میں کسی تنظیم کا لٹریچر ہو گایا کسی سیاسی پارٹی کا منشور، مگر ان میں تو صرف قرآن کی آیات تھیں اور ان کا سادہ ترجمہ۔ میں پڑھتا گیا اور پھر..... پھر سب بدلتا گیا..... سب ٹھیک

ہو گیا۔“

مختصر الفاظ میں انہوں نے ساری بات سمیٹ دی۔ وہ چپ چاپ انہیں منتی گئی۔

”آپ کچھ عرصہ پہلے گھر شفت ہو گئی تھیں، مجھے پڑھا تھا۔ اب طبیعت کسی ہے آپ کی؟“

”ایم فاسن۔“ پھر مجھے بھر کے توقف کے بعد بولی۔ ”آغا جان وغیرہ کدھر ہیں؟ انہوں نے گھر کیوں نجح دیا؟“

”جن دنوں وہ گئے تھے، میں ملک سے باہر تھا۔ بس ملازم سے ہی تھوڑا بہت سنا تھا کہ شاید تینوں بھائیوں نے جائیداد کا بٹوارہ کیا ہے اور گھر نجح کر، رقم تقسیم کر کے الگ الگ جگہوں پر شفت ہو گئے ہیں۔ آپ کے ایکیڈنٹ کا بھی میرے ملازم نے ہی بتایا تھا۔“

”کب کی بات ہے یہ؟..... کب بیجا انہوں نے گھر؟“

”آپ کے ایکیڈنٹ کے تقریباً سال ڈیڑھ بعد۔“

”اوہ!“ اس کے لب سکرے اور پھر اس نے گھری سانس لی۔ ”کوئی اندازہ ہے آپ کو کہ وہ کہاں گئے؟ اب میں ان سے کدھر ملوں؟“

”اوہ انہوں، قطعی نہیں۔“ انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں سرنگی میں ہلا کیا۔

”ہمارے کبھی اتنے تعلقات تھے ہی نہیں۔ ہاں، آغا اسد کے بارے میں، میں نے ایک دوست سے سنا تھا۔ وہ کلب میں آغا اسد کے ساتھ ہوتا تھا۔“

”آن کے الفاظ پر وہ چونگی۔ دل زور سے دھڑکا۔“

”کیا..... کیا سنا تھا؟“

”یہی کہ ان کو کینسر ہو گیا تھا، پھر ان کی ڈستھن ہو گئی۔ آپ کو نہیں پڑھا تھا؟“

”وہ سانس روکے، ہنکا بکا سی بیٹھی رہ گئی۔“

”آئی ایم ویری سوری محمل!“ نہیں افسوس ہوا۔

”کب؟..... کب ہوا یہ؟“ چند لمحے بعد اس کے لب پھر پھرائے۔ آنکھیں پھرا کی گئی تھیں۔

غالباً پانچ سال قبل۔ ان کے گھر بیٹھنے کے چھوٹے سات ماہ بعد۔“

”اور..... اور ان کے بچے؟..... معاذ اور معیز تو بہت چھوٹے تھے۔“

”معلوم نہیں۔ یتیم بچے تو پھر مجبوراً رشتہ داروں کے تسلط میں ہی رہتے ہیں۔ اللہ ان پر حرم کرے۔“

اور وہ لفظ ”یتیم بچے“ محمل کے دل میں کھب گیا۔ بہت پہلے پڑھی گئی ایک آیت ذہن میں گونجی۔

”ان لوگوں کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور یتیم اولاد چھوڑ جاتے۔“ (نساء۔ ۹)

”یتیم بچے؟..... اسد پچاکے بچے یتیم ہو گئے؟..... آرزو، معاذ، معیز۔“ وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

اور پھر کب وہ بر گیڈیز فرقان کو خدا حافظ کہہ کر بلقیس کے ہمراہ باہر آئی، اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ دل و دماغ بس ایک ہی نقطے پر منجد ہو گئے تھے۔ اسد پچاکے بچے یتیم ہو گئے۔

بے اختیار اسے اس لاونج کا وہ منظر یاد آیا۔

صوفی پر گری محمل اور اس کو تھپڑوں اور جوتوں سے مارتے اسد پچا اور غفران پچا۔ غفران پچا..... نہ جانے وہ کہاں گئے؟ اور آغا جان..... سب کدھر چلے گئے؟..... وہ ان لوگوں کو کدھر ڈھونڈے؟

مگر وہ ان کو کیوں ڈھونڈنا چاہتی تھی؟ اس نے خود سے پوچھا، کیا وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ان کو ان کے کئے کی سزا ملی یا نہیں؟ کہ آخر یہ قانون فطرت ہے۔ یا وہ ان خون کے رشتوں کی محبت میں ان کو یاد کر رہی تھی؟ شاید خون کی محبت غالب آگئی تھی۔ یا شاید اپنے سب سے قریبی رشتوں شوہر اور بیٹے کے ٹھکرائے جانے کے بعد اسے کسی رشتے کی ضرورت تھی۔ ہاں، شاید یہ بات تھی۔

وہ ان ہی سوچوں میں اُبھستی گھرو اپس آئی تھی۔



سارے میں فجر اتری تھی، جب وہ دلیل چیز کو خود گھستی، کھینچتی لان میں آئی۔
شبیم کے قطرے گھاس پر بکھرے تھے۔ دور کہیں پرندوں کی حمد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مختلف بولیاں۔ مگر ایک ہی بات انسانوں کی سمجھ میں نہ آئے، وہ اور بات ہے۔
تب ہی وہ آہستہ آہستہ دلیل چیز چلاتی دیوار کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ دیوار کے اس پار مسجد کی عمارت تھی۔ صبح کے وقت مسجد کے صحن میں بچوں کی ناظرہ کلاس ہوتی تھی۔
وہاں پچے بلند آواز میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔ ان کی تجوید کی بلکل آوازان کے لان میں بھی سنائی دیتی تھی۔

وہ آواز آج بھی آرہی تھی۔ وہ دیں، دیوار کے ساتھ دلیل چیز روکے، کان لگا کر سننے لگی۔ وہ سب مل کر بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔

ترجمہ: ”اور داخل ہو جاؤ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اور کہو حطة۔ ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے، اور عنقریب ہم احسان کرنے والوں کو زیادہ دیں گے۔“
آج اس نے بہت عرصے بعد وہ آیت سنی تھی۔ بے اختیار وہ گود میں رکھے قرآن کے صفحے پلٹنے لگی۔

وہ بنی اسرائیل کے ہیکل میں داخل ہونے کا قصہ تھا۔ سورۃ البقرہ کی 58 آیت۔
جب انہوں نے حطة کے بجائے حنطة کہا تھا۔ محمل کو کبھی یہ قصہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
اب بھی وہ الجھی گئی اور وہ صفحہ نکالا۔

اس میں اس نے کوئی خاص نوش نہیں لکھے تھے۔ شاید پرانے رجسٹر میں ہوں، جو الگ سے تھے۔ اس نے اپنی دلیل چیز کا رخ موڑا اور اندر لے گئی۔ اسٹڈی میں ایک

جگہ اس نے اپنے پانے نوش رکھے تھے۔ وہ ان ہی کوڈھونڈ نے اسٹدی میں آئی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ وہ اندر آگئی۔

ہمایوں اس کی طرف پشت کئے، ریکٹ میں سے کوئی کتاب نکال رہا تھا۔ آہٹ پر پٹا۔ ایک نظر اسے دیکھا اور پھر واپس کام میں لگ گیا۔ اجنبیت، سرد مری، بے حسی، مگر زیادہ دل جلانے بغیر وہ کمرے کے مطلوبہ حصے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے نوش وہیں رکھے تھے۔ گرد کی ایک تان پر جمی تھی، جیسے ان گزرے برسوں میں بس واجبی سی صفائی کی جاتی رہی ہو۔ ظاہر ہے، فرشتے کیا کیا دیکھے۔ اسے کسی دن اسٹدی کی صفائی کروانا چاہئے۔ وہ سوچتی ہوئی مطلوبہ رجسٹر ڈھونڈنے لگی۔

بغیر کسی وقت کے اسے وہ رجسٹر سامنے ہی مل گیا۔ اس پر ہلکی گرد کی تھی تھی۔ محمل نے وہ ترچھا کر کے چہرے کے سامنے کیا اور پھونک ماری۔ گرد اڑ کر دور بکھر گئی۔ ”میں تمہیں چھوڑنا چاہتا ہوں۔“ ہمایوں بغیر کسی تمہید کے کھڑے کھڑے، کتاب کے صفحے الٹ پلت کرتے ہوئے بولا تھا۔

لمحے بھر کو محمل کو لگا، وہ دھول مٹی رجسٹر سے اڑ کر ہر طرف چھانے لگی ہے۔ اس نے بمشکل رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بے نیاز سا کتاب کے درق پلت رہا تھا۔

”میرا مطلب، مکمل علیحدگی سے ہے۔ میں اب یہ رشته مزید نہیں نبھانا چاہتا سو بجھے اپنے پیروں کی زنجیر کھولنے دو۔ سنی ہم دونوں کا بیٹا ہے اور سات سال کا ہو چکا ہے۔ اس کی کسٹڈی اسے خود دیا یا نہ کرنے دینا۔“

دھول شاید اس کی آنکھوں میں بھی پڑ گئی تھی۔ وہ رخ پڑنے لگی تھی۔ وہ لب کھلتی اس کی بات سن رہی تھی۔

”اگر سنی تمہارے ساتھ رہنا چاہے تو میں اسے مجبور نہیں کروں گا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو تم اسے مجبور مت کرنا۔ جو بھی فیصلہ کرو، مجھے بتا دینا۔ لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“ اس نے کتاب ریکٹ میں رکھی اور پنا اس کو دیکھے لیے لبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

وہ شدید صدمے کے زیر اثر پھر بنی ہیں پیشی رہ گئی۔

کیا ہمیوں اس طرح اسے اپنی زندگی سے دور کر سکتا ہے؟
اگر کرتا ہے تو کرنے دو، میں مرنہیں جاؤں گی اس کے بغیر۔ ایک دم اس نے سر
جھکا۔

آنکھ آنسو بہاتی ہے
اور دل غمگین ہے
سُکر.....

ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے، جس پر ہمارا ربت راضی ہو۔
بے اختیار ہی وہ دھمکی آواز اس کی ساعت سے ٹھکرائی تھی۔ اس کے دل کو جیسے قرار
لے آگیا۔

اس نے رجسٹر کھولا۔ نوش میں اس واقعہ کے متعلق بس اتنا لکھا ہوا تھا کہ یہیکل میں
داخل سے قبل جب بنی اسرائیل کو کہا گیا کہ سواریوں پر جھکتے ہوئے عاجزی سے جھٹکہ
یعنی ”بخشش“ کہتے ہوئے داخل ہو، تو وہ تسلیخ اڑاتے ہوئے، زپانیں مردڑ کر جھٹکہ
جھٹکہ (Hinta'tun) کہتے ہوئے دروازے سے داخل ہوئے۔
”جھٹکہ کا مطلب ہوتا ہے گند....“ اس سے آگے صفحہ ختم تھا۔

اس نے ذہن سے تمام سوچوں کو جھٹک کر ان الفاظ پر غور کیا اور پھر نئے سرے
سے الجھ گئی۔ وہ واقعہ اسے بہت عجیب سالگ رہا تھا۔ بنی اسرائیل جیسی ٹینکس اور عتعل
مندوں نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے گند کس چیز کو کہا؟ جب ان کو سیدھے طریقے سے
 بتایا گیا تھا کہ وہ بخشش مانگیں تو انہوں نے ”گند، گند“ کیوں کہا؟ ایک طرف وہ اتنے
ذہن تھے کہ جھٹکہ سے ملا جلا لفظ ڈھونڈ لائے، اور دوسری طرف اس لفظ کو کہنے کا
مطلوب ہی نہیں بتتا تھا۔ آخر کیوں انہوں نے سچے لفظ نہ بولا؟ جھٹکہ کیوں کہا؟
وہ سمجھنے پائی اور پھر قرآن بند کر کے رکھ دیا۔ دل اتنا خالی تھا کہ تغیر کھول کر تفصیل
پڑھنے کو بھی نہیں چاہا۔ کانوں میں ابھی تک ہمیوں کے الفاظ کوئی خرابی تھے۔
ایک آنسو اس کی آنکھ سے لکھا اور رخسار پر پھسلنا چلا گیا۔
ٹو جس حال میں بھی رکھے، میرے مالک! میں تھوڑے راضی۔ اور نہایت بے

دردی سے اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑا لاتھا۔



تیمور، تو س کے چھوٹے چھوٹے لقے لے رہا تھا۔ ڈائینگ نیبل پر اس کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔

وہ اپنی دھیل چیز گھستی ڈائینگ ہال میں داخل ہوئی تو وہ آہٹ پر چونکا۔ لقمہ توڑتے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کے اور سر اٹھایا۔ محمل کو آتے دیکھ کر اس کے ماتھے پر مل پڑ گیا۔ اس نے تو س کا بچا مکڑا ازور سے پلیٹ میں واپس پہینکا اور کسی پیچھے کو دھکیلی۔

”بیٹھو تیمور! مجھے تم سے بات کرنا ہے۔“

”آئی ڈونٹ وانٹ ٹوٹاک ٹو یو۔“ (میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا) وہ کسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”مگر مجھے کرنا ہے۔ اور یہ تمہارے ڈیڈ کا میش ہے، میرا نہیں۔“

”وانٹ؟“ وہ لمحے بھر کو رکا، ماتھے پر مل اور بھنویں تی ہوئی۔

”شاید میں اس گھر سے چلی جاؤں۔ شاید اب ہم ساتھ نہ رہیں۔ میں اور تمہارے ڈیڈی۔“

”آئی ڈونٹ کیسر۔“

”تیمور! تم کس کے ساتھ رہنا چاہو گے؟..... میرے ساتھ یا ڈیڈی کے ساتھ؟“ وہ جانتی تھی کہ تیمور کا جواب کم از کم اس کے حق میں نہیں ہو گا، پھر بھی پوچھو لیا۔
”کسی کے بھی ساتھ نہیں۔“ اس نے بے زاری سے شانے اچکائے تھے۔

”مگر بیٹا! آپ کو کسی کے ساتھ تو رہنا ہی ہو گا۔“

”میں آپ کا نوکر ہوں جو کسی کے ساتھ رہوں؟ جسٹ لیو گی الون۔“ وہ ایک دم زور سے چینا تھا اور پھر کسی کوٹھوکر مارتا اندر چلا گیا۔

وہ تاسف سے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ یہ تنخ لہجہ، یہ بد مزاجی، یہ اندر بھرا ذہر.... یہ کس نے تیمور کے اندر ڈالا؟

اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے باپ کو مورِ الزام خبراتی، ایک منظر سا اس کی

نگاہوں کے سامنے بننے لگا۔

جیز، گرتے میں ملبوس، اوپنجی پونی ٹیلی والی ایک لڑکی، چہرے پر ڈھیروں بے زاری سجائے چلا رہی تھی۔

”میں آپ کے باپ کی نوکر ہوں، جو یہ کروں؟“

اس کے مخاطب بہت سے چہرے تھے۔ کبھی تائی مہتاب، کبھی سرت، کبھی کرزز، تو کبھی کوئی چچا۔

اسے وہ منہ پھٹ، بد مزاج اور تلنخ لڑکی یاد آئی اور اس کا روایاں روایاں کانپ آٹھا۔

”ہاں..... جو اپنے بڑوں سے جیسا کرتا ہے، اس کے چھوٹے بھی اس کے ساتھ

دیساہی کرتے ہیں۔“ کوئی اس کے اندر بولا تھا۔

راستہ ایک ہی ہے، اس پر انسان ایک وقت تک چلتا ہے، اور پھر آخر وہ واپس اپنے قدموں کے نشانوں پر لوٹتا ہے۔ جو بول آگا کر جاتے ہیں، ان کو لہو لہان کرنے والے کانٹے ہی ملتے ہیں۔ اور جنہوں نے پھول بکھیرے ہوں، ان کا انتظار گلستان کر رہے ہوتے ہیں۔

”محمل؟“ کسی نے پکارا تو وہ خیالوں سے جاگی اور پھر سختی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

”کیا میں نے ٹھیک سننا؟“ فرشتے چیسے بے یقین سی اس کے سامنے آئی۔

”کیا؟“ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے سراخایا۔

”محمل! تم اور ہمایوں..... تم الگ ہو رہے ہو؟“ وہ متغیر سی کہتی اس کے سامنے زمین پر گھٹنوں کے مل پیٹھی اور دونوں ہاتھوں اس کی گود میں دھرے ہاتھوں پر رکھے۔

”ہاں..... شاید۔“

”مگر..... مگر تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟“ وہ مضطرب سی اس کی آنکھوں میں دیکھتی، جواب تلاش کر رہی تھی۔

”میں نے نہیں کیا..... ہمایوں نے کیا ہے۔“

”کیا اس نے خود تمہیں ایسا کہا ہے؟“

”ہاں۔“

”تو..... تم نے مان لیا؟“ وہ بے یقین تھی۔

”میرے پاس چوائس بچی ہے کیا؟“

فرشتبکر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

فرشتبکر اس کا چہرہ تھا، نہ آج ہے۔ ہمایوں نے فیصلہ سنانا تھا، سنا دیا۔ اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تو کیا میں اسے مجبور کروں؟..... نہیں۔“ اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر وہ علیحدگی ہی چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں مصالحت کی آخری کوشش ضرور کروں گی۔ مگر اس سے بھیک نہیں مانگوں گی۔“

”پھر..... پھر کیا کرو گی؟ کدھر جاؤ گی؟“

”فرشتبکر! میں ہمایوں کی محتاج نہیں ہوں۔ اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔“

”تم اس کے بغیر رہ لو گی؟“

”کیا وہ میرے بغیر نہیں رہ رہا؟“ وہ پھیکا سامسکرائی۔

”مگر کیا تم خوش رہو گی؟“

”اگر اللہ نے میرے مقدر میں خوشیاں لکھی ہیں تو وہ مجھے مل ہی جائیں گی۔ بھلے ہمایوں میرے ساتھ ہو یا نہ ہو۔“

فرشتبکر اسے دیکھتی رہی۔

”آئی ایم ویری سوری محمل! اگر تم کہو تو میں اسے اس کا فیصلہ بد لئے کو.....“

”نہیں۔“ اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”آپ اس معاملے میں نہیں بولیے

”گا۔“

”مگر ایک دفعہ مصالحت کی ایک کوشش تو.....“

”پلیز فرشتبکر! مجھے بھکاری مت بنائیں۔“ اس نے کچھ ایسی بے بسی سے کہا تھا کہ فرشتبکر کاٹتی رہ گئی۔

”مگر..... وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کیا اس نے تمہیں وجہ بتائی ہے؟“

”کیا میں نہیں جانتی؟ ہونہہ!“ اس نے لہنی سے سر جھکا۔ ”وہ ایک معذور عورت کے

ساتھ کب تک رہے؟ کب تک میری خدمت کرے؟ وہ میری بیماری سے اکتا گیا ہے، میں جانتی ہوں۔“

”کیا یہی واحد وجہ ہے؟“

”اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”واللہ اعلم۔ خیر، جو بھی کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔ اگر تم نے فیصلہ کرہی لیا ہے تو اس پر اپنے دل کو بھی راضی کر لینا۔ تو یوں سڑ؟“ اس نے اپنے ہاتھ محمل کے ہاتھوں سے ہٹائے اور ہولے سے اس کا گال تھپتھپاتی کھڑی ہو گئی۔

”بس یہ یاد رکھنا کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور جب تک تم صحیک نہیں ہو جاتیں، میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی، اوکے؟“
محمل نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔



جب سے ہمایوں نے علیحدگی کی بات کی تھی، وہ لاکھ فرشتے کے سامنے خود کو صابر شاکر ظاہر کرتی، اندر سے وہ مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اس کی یادداشت میں ہمایوں کے ساتھ بیتا ایک ہی سال تھا۔ باقی کے ماہ و سال ذہن کے پردے پر اترے بغیر ہی سرک گئے تھے۔

اور وہ ایک سال جو اس نے اس گھر میں محبوں اور چاہتوں کے بیچ گزارا تھا.....
جب وہ دونوں گھنٹوں باقی کرتے تھے۔ وہ کینڈل لائٹ ڈنزر، وہ لاگ ڈرائیور، وہ روز ہمایوں کے لئے تیار ہونا، وہ تیرس پہ جا کر رات کو باقی کرنا، وہ ایک ساتھ کی گئی شانگر..... ہر شے اس کی یادداشت پر سے کسی فلم کی طرح گزرتی تھی اور ہر یاد اس کے دل پر مزید آنسو گراتی جاتی تھی۔

اور اگر تیمور بھی اس کے ساتھ نہ رہا، تب وہ کیا کرے گی؟ کہہ جائے گی؟ اگر ہمایوں نے اسے گھر سے نکال دیا، تو وہ کہاں رہے گی؟ کیا اپنے بچاؤں کے پاس؟.....
کیا وہ اسے رکھیں گے؟..... یا فرشتے کے ساتھ؟ مگر فرشتے تو خود تباہ تھی۔ ہمایوں کے گھر میں مہمان تھی۔ پھر وہ کیا کرے گی؟

یوں لگتا تھا کہ چلپاتی دھوپ میں اسے لاکھڑا کیا گیا تھا۔ نہ چھٹ، نہ سائبان۔ مستقبل کا خوف کسی بھی ایک آسیب کی طرح اس کے دل سے چھٹ گیا تھا۔ بار بار یہ سوال ذہن میں اٹھتے اور وہ بمشکل ان کو جھٹلا پاتی۔

اور پھر آخر تک وہ ان کو یوں جھٹکے گی؟ کبھی نہ کبھی تو اسے ان کا جواب چاہئے ہوگا۔ اور جس کتاب سے جواب مل جایا کرتے تھے، اس کے صفحے بار بار ایک ہی آیت سے کھل جاتے تھے۔ کبھی ایک جگہ سے کھل جاتی تو کبھی دوسری جگہ سے۔ اور یہی قصہ سامنے آ جاتا۔

”اور داخل ہو جاؤ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اور کہو حطفہ۔“
مگر ہیکل سلیمانی کا دروازہ کہاں تھا؟ وہ تو دن سواری کے شہر سے نکال باہر کی جا رہی تھی۔ اندر کیسے جاتی؟

وہ سہ پہر بہت زردی اتری تھی۔ بلقیس نے اسے بیٹھ سے وہیل چیر پ پٹھایا اور باہر لے آئی۔

تیمور لاونج میں صوفے پہ کتابیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی، اور پھر نگاہیں کتاب پہ جمادیں۔ وہ پیاسی نظروں سے اسے تکتی رہی، یہاں تک کہ بلقیس وہیل چیر لاونج کے داخلی دروازے تک لے آئی۔

دروازے کی چوکھت پہ گلے گلاں میں بیل بوٹوں اور نقش و نگار کے درمیان اسے صوفے پہ بیٹھے تیمور کا چہرہ نظر آیا جو بہت غور سے اسے باہر جاتے دیکھ رہا تھا۔

بلقیس، وہیل چیر لان میں لے آئی۔ تازہ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو بھورے بال پیچھے کو اڑنے لگے۔ اس نے آنکھیں موند کر لمحے بھر کو موسم کی تازگی اپنے اندر آتا رہا چاہی۔ تب ہی دیوار کے اس پار سے دھممدھمی بھینٹنا ہٹ سماحت میں اتری۔

”اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جاتی ہے۔“

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اسے گھر آئے مہینہ ہونے کو آیا تھا، مگر وہ کبھی مسجد نہیں گئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟
”بلقیس! مجھے مسجد لے چلو۔“ ایک دم سے اس کا دل چل گیا۔

بلقیس نے فرمان برداری سے مرہلا کروئیل چیز کا رخ موز دیا۔

”فرشتے کدھر ہیں؟“ اس نے سوچا کہ اسے بھی ساتھ لے لے۔

”وہ کھانا کھا کر سوگئی تھیں۔“

”چلوٹھیک ہے۔“ وہ جانتی تھی، فرشتے تھکی ہوئی ہو گی۔ صحیح بھی وہ فزیو تھراپیٹ کے ساتھ محل کی ایکسر سائز اور پھر مساج کرنے میں لگی رہی تھی۔ پھر بزری لانا اور گھر کی نگرانی۔ وہ شام کو مسجد جائے گی۔ پھر ابھی اسے کیوں تھکائے؟ سواس نے فرشتے کو بلا نے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مسجد کا ہر ابھر، گھاس سے مزین لان ویسا ہی خوب صورت تھا، جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ سفید ستونوں پر کھڑی عالیشان، اوپنجی عمارت۔ چمکتے سنگ مرمر کے برآمدے..... کونوں میں رکھے بزر لہبھاتے گلے۔ شور مچاتی دنیا سے دور، ہنگامے سے پاک، ٹھہرا ہوا، کونہ کونہ سکون میں ڈوبتا ماحول۔

مسجد کے اندر کوئی اور ہی دنیا تھی۔ ٹھنڈی، تازگی بھری، باوقاری دنیا۔ اس کے درو دیوار سے سکون پیکتا تھا۔

وہ جیسے بچوں کی طرح محل اٹھی تھی۔ آنکھوں میں چک آگئی اور پھر بے اختیار ادھر ادھر گردن گھماتی وہ ہر ہر شے دیکھ لینا چاہتی تھی۔ بلقیس آہستہ آہستہ وہیل چیز آگے بڑھا رہی تھی۔

برآمدے میں سنگ مرمر کی چمکتی سیڑھیاں اترتی تھیں۔ ان پر مسلسل اوپر نیچے لٹکیاں آ جا رہی تھیں۔ سفید یونیفارم کے اوپر لائٹ گرین اسکارف، پارسٹ گلر کے اسکاف پہنے وہ مسکراتی ہوئی، خوش پاش لٹکیاں، ہاتھوں میں قرآن اور کتابیں پکڑے ہر کسی کو مسکرا کر سلام کرتیں آس پاس نظر آ رہی تھیں۔

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ!..... وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ!“ وہ مسکرا کر ہر ایک کے سلام کا جواب دے رہی تھی۔ وہ وہاں کسی کو نہیں جانتی تھی اور کوئی اسے نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی سلام کرنا اور سلام میں پہل کرنے کی حرکت رکھے ہر کوئی پاس سے گزرتے ہوئے سلام کرتا تھا۔ اس کا پور پور خوشی میں ڈوب رہا تھا۔ یہ ماحول، یہ درودیوار..... یہ تو اس کی ذات کا حصہ تھے۔ وہ

کیسے اتنا عرصاں سے کٹی رہی؟
وہ نم آنکھوں سے مگراتے ہوئے، وہیل چیز پر بیٹھی مسلسل سب کے سلام کا جواب
دے رہی تھی۔ نہ کسی نے رک کر ترس سے پوچھا کہ اس کو کیا ہوا ہے۔ نہ کسی نے ترجم
بھری نگاہ ڈالی۔ نہ کوئی تجسس، نہ گرید۔ وہ کونے میں وہیل چیز پر بیٹھی ساری چیل پہل
دیکھ رہی تھی۔

پھر کتنی ہی دیر وہ ادھر ہی بیٹھی رہی، یہاں تک کہ بلقیس نے مرکز تک جانے کی
اجازت مانگی۔

”رات صاحب کے کوئی سرکاری مہمان آنے ہیں۔ اور فرشتے بی بی نے مجھے
گوشت بنانے کو کہا تھا، میں بھول ہی گئی۔ آپ بیٹھو، میں لے آتی ہوں۔“
”نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ آج دل کر رہا ہے، دنیا کو پھر سے دیکھنے
کا۔“

ایک الوہی چمک نے محمل کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ وہ اس ماحول میں آکر
جیسے بہت خوش تھی اور اس خوشی کو اپنے اندر سمیت کر اب وہ دنیا کا مقابلہ کرنے کو تیار
تھی۔

آج اسے بازار جانے سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

بلقیس عادتاً چھوٹی مولیٰ، ادھر ادھر کی باتیں کرتی اس کی وہیل چیز چلاتی مرکز تک
لے آتی۔ مرکز وہاں سے بہت قریب پڑتا تھا۔ وہ گوشت بنانے دکان میں چل گئی جبکہ
محمل باہر بیٹھی رہی۔

گاڑیاں بہت تیزی سے گزر رہی تھیں۔ لوگ بہت اونچا بول رہے تھے۔ موڑ
سائیکلیں بہت شور پھاڑ رہی تھیں۔ روشنیاں بہت تیز تھیں۔

ذراسی دیر میں سارا سکون ہوا ہو گیا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

”جلدی کرو بلقیس؟“ وہ لفافے تھامے دکان سے باہر آئی تو محمل سخت اکتا چکی
تھی۔

”بس، بس۔ یہ سامنے والے پلازا میں ہوں گے۔ تیمور بابا کے لئے پڑا لے لوں۔“

ورنه بابا کھانا نہیں کھائے گا۔ بس بی بی! پانچ منٹ۔“

وہ تیز تیز دھیل چیز دھکلیتی کہہ رہی تھی۔ محمل نے بے زاری اور بے چینی سے سڑک کو دیکھا۔ وہ فرائٹ بھرتی گاڑیاں اسے بہت بری لگ رہی تھیں۔ ایسی ہی کسی گاڑی نے بھی اسے ٹکر ماری تھی۔

بلیں ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کے سامنے اسے کھڑا کر کے اندر چلی گئی اور وہ اس ریسٹورنٹ کی گلاں والٹ کو سمجھتے اس گاڑی کو یاد کرنے لگی، جس نے اسے ٹکر ماری تھی۔ نہ جانے وہ کون تھا یا تھی؟ پکڑا بھی گیا یا نہیں؟.... کیا ہمایوں نے اس پر مقدمہ کیا ہوا؟ اسے جیل بھیجا ہو گا؟ مگر یوں مقدمہ کرنے سے اس کا نقصان پورا تو نہیں ہو سکتا تھا۔

”خیر جانے دو.... میں نے معاف کیا سب کو،“

اس نے سر جھکا اور پھر بے چین و منتظر نگاہوں سے ریسٹورنٹ کی گلاں وال کو دیکھا۔ بلیں جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

وہ یونہی بے زاری سے نگاہ ادھر ادھر گھماتی رہی اور واقعٹا بری طرح ٹھیکی۔ ریسٹورنٹ کی گلاں وال کے اس طرف کا منتظر صاف واضح تھا۔

کونے والی میز پر بیٹھا دھمکاتے ہوئے، والٹ کھولتا ہمایوں ہی تھا۔ وہ یک ٹک اس کی مسکراہٹ کو دیکھے گئی۔ کیا اسے مسکرانا یاد تھا؟.... کیا اسے مسکرانا آتا تھا؟ اور تب اس کی نظر ہمایوں کے مقابل بیٹھی لڑکی پر پھسلی۔ شولڈر کٹ بال، سلیویس شرٹ، دوپٹہ مدارد، کمان کی طرح پکی آئی بروز..... وہ مسکراہٹ ہوئے پکھہ کہہ رہی تھی اور ہمایوں سر جھک کر مسلسل سکرائے جا رہا تھا۔

اس لڑکی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ آرزوی تھی..... اور واقعی آرزو ہی تھی۔

ہمایوں اب والٹ سے چند نوٹ نکالتے ہوئے پکھہ کہہ رہا تھا جبکہ وہ ہستے ہوئے نہیں سر پلا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان بے تکلفی واضح اور عیاں تھی۔

”تو یہ بات تھی ہمایوں داؤ! تمہیں آرزو ہی ملی تھی؟“

اس نے غم سے لب کاٹتے ہوئے سر جھکا تھا۔ فرشتے ٹھیک کہتی تھی۔ یقیناً وجہ کوئی

اور تھی۔ اس کی معدودی کا توبہ نہ تھا۔ اصل وجہ تودہ پتلی کمان سی ابر و والی شاطر لڑکی تھی، جو اس کے شوہر کے ساتھ سر عام لنج کر رہی تھی۔

اس نے کہا تھا، وہ ہمایوں کو اس سے چھین لے گی، اس نے نجیک ہی کہا تھا۔
محمل نے کرب سے سوچا۔

مغرب کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، جب بلقیس اس کی دلیل چیز دھکیلتی گھر کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

اس کے سامنے ایک ہی منظر تھا۔ کونے کی نیل پہ بیٹھے، ہنتے مگر اتے دونفوس۔
ایک جانا پہچانا سافر، اور ایک جانی پہچانی سی عورت۔

وہ اجزی اجزی سی صورت لئے، گم صمی دلیل چیز پہ بیٹھی تھی۔ بلقیس کب اسے کمرے تک لائی، اسے سچھے علم نہ تھا۔

کسی نے اس کا شانہ ہلا�ا تو وہ چوکی، اور پھر گردن اٹھا کر سامنے دیکھا۔

فرشتے حیران سی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ زرد شلوار قمیض میں مبوس، دوپٹہ شانوں پہ پھیلانے اس نے گیلے بھورے بال سمیث کر دائیں شانے پر ڈال رکھے تھے۔ شاید ابھی وہ نہا کر آئی تھی۔

”کدر گم ہو محمل؟..... کب سے تمہیں بلا رہی ہوں؟“ وہ بخوبی کے مل اس کے سامنے کارپٹ پہ بیٹھی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ دائیں شانے پہ پڑے اس کے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک کر دامن کو بھگور ہے تھے۔

”آپ نجیک کہتی تھیں فرشتے!“ وہ جیسے ہار گئی تھی۔ فرشتے کو لگا، وہ رورہی ہے، مگر اس کے آنسو باہر نہیں، اندر گر رہے تھے۔

”میں نے آج خود ان دونوں کو دیکھا ہے۔“

”کن دونوں کو؟“ وہ بڑی طرح چوکی۔

”ہمایوں اور..... اور آرزو کو۔“

”آرزو؟..... اسد انگل کی بیٹی آرزو؟“

”ہاں وہی۔ کیا اسد چچا کی ڈیتھ ہو گئی ہے؟“

”تم نے انہیں کدھر دیکھا؟“ وہ اس کا سوال نظر انداز کر گئی تھی۔

”مرکز کے ایک ریسٹورنٹ میں۔ وہ دونوں لمحے کر رہے تھے یا شاید ہائی ٹی۔

فرشتے! ہمایوں بنس رہے تھے۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ ہنسنا ہی بھول گئے ہیں۔“

”مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ..... پتہ نہیں مگر.....“ وہ متذبذب تھی، کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”مجھے پتہ ہے، وہ آرزو کی وجہ سے میرے ساتھ یوں کرو رہے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہمایوں کو مجھ سے چھین لے گی۔ اور اس نے یہ کر دکھایا۔ کیا وہ بھی اس گھر میں آئی ہے؟“

”ہاں..... وہ اکثر آتی رہتی ہے۔ مگر تمہارے گھر شفت ہو جانے کے بعد وہ بھی نہیں آتی۔“

”واقعی.....؟“ اسے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ آخر وہ کس حیثیت سے آئی تھی اس کے گھر؟

”آپ نے اسے نکالا کیوں نہیں؟ اندر کیوں آئے دیا؟“

”یہ میرا گھر نہیں ہے محمل! مجھے اس کا حق نہیں ہے۔“

محمل چپ سی ہو گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔

”ہمایوں کے کچھ گیست آنے ہیں کھانے پر۔ ابھی چینچنے والے ہوں گے، میں ذرا کچن دیکھ لوں۔“ وہ اس کے ہاتھوں سے ہاتھ نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گیلے بال شانے سے پھسل کر کمر پہ جا گرے۔

”آپ..... آپ بہت اچھی ہیں فرشتے!“ وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”وہ تو مجھے پتہ ہے۔“ وہ زمی سے مسکرائی اور زرد دوپے کا ٹپو سر پہ ڈالا، پھر اچھی طرح چہرے کے گرد حصہ سا بنا کر دایاں ٹپو بائیں کندھے پہ ڈال دیا۔ یوں کہ بال اور کان چھپ گئے۔

”تم آرام کرو۔“ وہ باہر نکل گئی اور محمل وہیں اُداس، ویران سی بیٹھی رہ گئی۔

باہر سے چہل پہل کی مدھم مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ کافی دیر بعد اس نے کھڑکی

سے ہمایوں کی گاڑی کو آتے دیکھا تھا۔ اس کے ہمراہ دو تین معزز اشخاص بھی تھے۔ ہمایوں اسی لباس میں تھا جس میں انھی شام میں آرزو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گویا وہ واقعی وہی تھا، یہ اس کا وہ مہنہ تھا۔

وہ حسرت ویاس سے کھڑکی سے لگی ان کو اندر جاتے دیکھتی رہی۔ اس کے کمرے میں اندر ہیرا اُتر آیا تھا۔ باہر روشنی تھی۔ باہر والے اسے نہیں دیکھ سکتے تھے اور وہ ”باہر والا“ تو شاید اب کبھی بھی اسے نہ دیکھ سکے۔ اس کے پاس اب بہتر انتساب تھا۔ جوان، اشاملش، زندگی سے بھر پور عورت، بے شک وہ محمل کی طرح خوب صورت نہ تھی، مگر اس کی تراش خراش کی گئی شکل ”اب“ کی محمل سے حسین لگتی تھی۔

کیا کبھی حالات بد لیں گے؟ کیا کبھی ہمایوں لوئے گا؟ کیا کبھی اس کی معدودی ختم ہوگی؟ کیا کبھی تیمور اس کے پاس آئے گا؟ کیا یہ گھر اس کا رہ سکے گا؟ کیا وہ در بذر کر دی جائے گی؟ کیا وہ بے سہارا چھوڑ دی جائے گی؟

اندر کا خوف اور بے بسی، آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے نکل کر چہرے پر لاٹکنے لگی۔ مستقبل ایک بھی انک سیاہ پردے کے مانند ہر طرف چھاتا دکھاتی دے رہا تھا۔ اس نے کرب سے آنکھیں بیچ لیں۔

”اللہ ہر اس چیز سے بڑا ہے، جس سے میں ڈرتی اور خوف کھاتی ہوں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا وہ ایک کلمہ وہ بار بار زیر لب دہرا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اندر کرب قدرے کم ہوا اور ذرا سا سکون آیا تو اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

اگر ان لوگوں نے مجھے چھوڑ ہی دینا ہے، نکال ہی دینا ہے تو مجھے کسی بے قدرے کے حوالے مت کرنا، میرے مالک! کوئی امید کا سرا دکھادے، کوئی روشنی دکھادے، وہ بنا لب ہلانے دعا کے لئے اٹھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو اسی طرح بپہ رہے تھے۔

پھر جب بہت روچکی تو چہرہ پوچھا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سفید کور والا قرآن اٹھایا، اس کے فرنٹ کو پر مٹا مٹا سا ”م“ اسی طرح لکھا تھا۔

اسے یاد نہ تھا کہ اس نے آخری دفعہ تلاوت کدھر چھوڑی تھی، پتہ نہیں نشان کہیں لگایا تھا یا نہیں۔ بس جہاں سے صفحہ کھلا، اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔ لاشعوری طور پر وہ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی چاہتی تھی۔

”اور کس کی بات اس شخص کی بات سے زیادہ اچھی ہو سکتی ہے، جو اللہ کی طرف بلائے اور اچھے عمل کرے اور کہے، بے شک میں مسلمانوں میں سے ہوں۔“
اس نے اگلی آیت پڑھی۔

”اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں سو (برائی کو) اس طریقے سے دور کرو جو بہترین ہو، پھر دفعۂ وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے، یوں ہو جائے گا کویا کہ تمہارا حیم (گہرا جاں شار دوست) ہو۔“

اس نے اچھبے سے ان آیات کو دیکھا، کیا اب بھی کوئی امید تھی کہ وہ شخص اس کا حیم (گہرا جاں شار دوست) بن سکتا ہے؟ اب تو کچھ باتی نہیں رہا تھا، سب ختم ہو گیا تھا۔
اس نے اس آیت کو دوبارہ پڑھا۔

بہت ہی عجیب ماجرا تھا۔ آج وہ اپنے شوہر کو ایک دوسری عورت کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے دیکھ آئی تھی۔ اپنے اس شوہر کو جو بر ملا اس سے علیحدگی اختیار کرنے کا کہہ چکا تھا۔ اس کا اپنا بچہ اس سے بد کتا تھا، اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی بے انتہا نہ امید رہنے والی بہن بھی آج خاموش تھی، آج اس نے بھی امید نہیں دلائی تھی کہ ہمایوں کا روئیہ سب کے سامنے تھا۔

اس نے پھر سے پڑھا۔

”پھر دفعۂ وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے، یوں ہو جائے گا کویا تمہارا حیم ہو، اور اس (خوبی) کو ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں حاصل کر سکتا جو بہت میر کرتے ہیں اور اس (خوبی) کو ان کے علاوہ کوئی نہیں حاصل کر سکتا جو بڑی قسمت والے ہوتے ہیں۔“

”میں اتنی میر کرنے والی اور بڑی قسمت والی کہاں ہوں اللہ تعالیٰ؟“ اس نے یاں سے سوچا تھا۔ کیا وہ واقعی کبھی بھی ان عداوتوں کو پکھلانہیں سکے گی؟ کیا اسے مایوس ہو جانا

چاہئے؟

باہر سے چہل پہل کی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ محمل کے کمرے کے سامنے ہی ڈرائیکٹ ہال اور ڈائیکٹ روم تھا۔

اس نے قرآن بند کر کے شیلف پر رکھا اور وہیل چیز کو گھستی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی۔ قد آور کھڑکی کے شفاف شیشوں کے اس پار ڈوٹی شام کا منظر نمایاں تھا۔ دور اور پر کہیں آدھا چاند بادلوں سے جھاک رہا تھا۔ یہاں تک کہ شام ڈوب گئی اور چاندنی سے کھڑکی کے شیشے روشن ہو گئے۔ وہ اسی طرح اندر ہیرے میں ڈوبے کمرے میں پیشی، گردن اٹھائے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

”ادفع بالتی ہی احسن۔“ (دور کرواتے اس طریقے سے جو بہترین ہو جو بہترین ہو۔

جو بہترین ہو۔

ایک آواز پار بار اس کی ساعت میں گونج رہی تھی۔
وہ چپ چاپ چاند کو دیکھتی کچھ سوچے گئی۔



اس نے دیوار پہ آویزاں گھری پہ نگاہ دوڑائی۔ ایک بجھے میں ابھی چند منٹ تھے اور ہمایوں ڈریڑھ بیچے تک گھر آ جاتا تھا۔

وہ وہیل چیزِ گھستی سنگھار میز کے سامنے لے آئی اور قد آور آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہیل چیز پہ بیٹھی ایک کمزوری لاکی جس کے گھنٹوں پہ چادر پڑی تھی اور گیلے بال شانوں پہ بکھرے تھے۔ چہرے کی سپید رنگت میں زردی کھنڈی تھی اور بھوری آنکھوں تملے حلقت تھے۔

اس نے بیٹر برش اٹھایا اور آہستہ آہستہ بالوں میں اوپر سے نیچے کنکھی کرنے لگی۔ گیلے بالوں سے موتویوں کی طرح پنکتے قطرے اس کی سرخ قمیض کو بھگورہے تھے۔ خوب صورت جوڑا فرشتے نے اس کے لئے بنایا تھا، اور آج بہت شوق سے اس نے پہتا تھا۔ بال سلیج گئے تو اس نے چہرے پہ بلکا سافاؤٹرنس لگایا، پھر گابی سا بش آن بکھیرا، آنکھوں میں گھرا کا جل اور اوپر لاست پنک سا آئی شیڈو، پھر پنک اور ریڈ لپ اسٹک ملا کر لبوں پہ لگائی، یوں کہ اور بھی نہ لگے اور بہت پھیلی بھی نہیں۔ بال ذرا ذرا سوکھنے لگے تھے۔ اس نے ان کو برش سے سہیتا، پھر دونوں ہاتھوں میں پکڑے اوپنچا کیا اور پونی میں باندھا، یوں کہ اوپنچی پونی ٹیل اس کی گردن پہ جھولنے لگی۔

محمل کی یادگار پونی ٹیل۔

وہ اسے دیکھ کر اُداسی سے مگر اُدی۔ پھر ڈرینگ ٹیبل پر رکھا جیولری بَاکس کھولا اور لئکٹے سرخ یا قوت کا سونے کا سیٹ نکالا، کانوں میں آویزے پہننے اور گردن میں نازک سائیکل۔ اب اپنا عکس دیکھا تو خوشگواری حیرت ہوئی۔ وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

تروپاڑہ اور خوب صورت۔

جیولری باکس کے ساتھ ہی اس کی کانچ کی سرخ چوڑیاں رکھی تھیں۔ وہ ایک ایک چوڑی انٹھا کر کلائی میں ڈالتی گئی۔ یہاں تک کہ دونوں کلائیاں بھر گئیں اور جب اس نے سرخ بڑے سے یاقوت کی انگوٹھی انٹھائی تو اسے پہنچتے ہوئے چوڑیاں بار بار کھنک انٹھتیں۔

ذیرِ ہد بخنے والا تھا۔ اس نے ایک نظر گھڑی کو دیکھا اور پھر پر فوم اپرے کر کے خود کو باہر نکال لائی۔

ہمایوں ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ بے چین سی لاونچ میں بیٹھی تھی۔ کبھی آؤزے درست کرتی، کبھی چوڑیاں ٹھیک کرتی اور بار بار دروازے کو دیکھتی۔

دو بخنے والے تھے جب اس نے گاڑی کی آواز سنی۔ ایک دم اس کا دل زور زور سے دھڑ کنے لگا۔

یہ ہی طریقہ اسے ”بہترین“ لگا تھا، سواس نے اسی کو اپنایا تھا۔

قدموں کی چاپ قریب ہوتی سنائی دی۔ وہ خواخواہ گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ وہ نرود ہو رہی تھی اور وہ یہ جانتی تھی۔

دروازہ کھلا اور اسے ہمایوں کے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ مگر نہیں، ساتھ میں نازک ہیل کی ٹنک ٹنک بھی تھی۔

اس نے حیرت سے سراخایا اور اگلے ہی پل زور کا جھٹکا لگا۔

ہمایوں اور آرزو آگے پیچھے اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ یونیفارم میں ملبوس تھا، ہاتھ میں ایک خاکی لفاف تھا اور وہ آرزو سے بغیر کچھ نہ چلا آرہا تھا۔ وہ اس کے ہم قد، سروری چل رہی تھی۔ وائٹ ٹراؤزر پہ پنک گھننوں تک آتی شرٹ، اور دو پسہ ناپید، کمان کی سی ٹکلی ابروز اور تیکھی نکا ہیں۔

اسے سامنے بیٹھئے، گردن انٹھائے خود کو دیکھتے، ان دونوں کے قدم ذرا سے ست ہوئے۔

چند لمحے وہ شدید صدمے کی حالت میں رہی تھی، مگر پھر منجل گئی۔

بظاہر سکون سے ان دونوں کو آتے دیکھا اور اسی سکون سے سلام کیا۔

”السلام عليكم!“

”وعليكم السلام۔“ ہمایوں نے جواب دے کر ایک نظر آرزو کو دیکھا جو سینے پر بازو باندھے تکھی نگاہوں سے محمل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں واضح استہزا تھا۔

”میں آپ کا انتظار کر رہی تھی ہمایوں! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ آرزو کو یکسر نظر انداز کئے سپاٹ لجھے میں ہمایوں سے مخاطب تھی۔

”مجھے بھی تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا، خاکی لفافہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”ٹھیک ہے، آپ بتائیں۔“

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور آرزو اسی طرح سینے پر بازو لپیٹنے اُکھڑی اُکھڑی سی کھڑی تھی۔ چند لمحے خاموشی حاکل رہی۔ ہمایوں ہاتھ میں پکڑے خاکی لفافے کو دیکھتا رہا، جیسے کچھ کہنے کے لئے الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ اس نے سراہیا اور انہی سنجیدہ نگاہوں سے محمل کا چہرہ دیکھا۔

”میں شادی کر رہا ہوں۔“

ایک لمحے کو سکوت چھا گیا، مگر نہ آسان گرا، نہ زمین پھٹی، نہ ہی کوئی طوفان آیا۔ اس نے بہت سبر سے اس کی بات سنی اور پھر سوالیہ ابرداشتھا۔

”تو....؟“

”تو یہ کہ ہم دونوں کو الگ ہو جانا چاہئے۔ یہ لو۔“ اس نے خاکی لفافہ محمل کی طرف بڑھایا، جسے اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر تھاما۔ دونوں لمحے بھر کوڑ کے، دونوں نے اس وقت خاکی لفافہ تھام رکھا تھا۔ مگر وہ بس ایک لمحے کا فسون تھا۔ پھر ہمایوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور محمل نے سفا کی سے لفافہ چاک کیا۔

”کیا ہے اس میں ہمایوں صاحب؟ کیا میرا طلاق نامہ ہے؟“ اندر سے ٹھہر دے کا غذ نکلتے ہوئے وہ بہت آرام سے بولی تھی۔ وہ خاموش رہا۔ محمل نے کاغذ کی جہیں کھو لیں۔

وہ واقعی طلاق نامہ تھا۔ ہمایوں کے دستخط، محمل کا نام۔

نہ اس کے ہاتھ سے کاغذ پھسلا، نہ وہ چکرا کر گئی۔ بس ایک نظر میں پورا صفحہ پڑھ ڈالا اور پھر گردن اٹھائی۔ لمحوں میں ہی اس نے سارے فیصلے کر لئے تھے۔

”اس پہلی طلاق کا شکریہ ہمایوں داؤد!..... جس عالم نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ تم طلاقیں اکٹھی دینا ایک قبیح عمل ہے، سو طلاق ایک ہی دینا بہتر ہے، تو اس نے یقیناً یہ بھی بتایا ہوگا کہ اب عدت کے تین ماہ میں اسی گھر میں گزاروں گی۔ کیا نہیں بتایا؟“

”مجھے معلوم ہے۔ تم تین ماہ ادھر رہ سکتی ہو، اس کے بعد میں شادی کر لوں گا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ محمل نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا، جس کے بے وفا چہرے پے کوئی پچھتاوا، کوئی ملال نہ تھا۔

”پوچھ سکتی ہوں، آپ دوسری شادی کس سے کر رہے ہیں؟“
ہمایوں نے ایک نظر سامنے کھڑی آرزو کو دیکھا اور پھر شانے جھکے۔

”یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ میں ذرا چیخ کر کے آتا ہوں۔“ آخری فقرہ آرزو سے کہہ کر وہ تیزی سے اوپر سڑھیاں چڑھتا گیا۔

وہ چند لمحے اسے اوپر جاتے دیکھتی رہی۔ زندگی میں پہلی بار اسے ہمایوں داؤد سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ شدید نفرت۔

”آپ تو اپاچی ہو کر بھی خوب نی سنوری رہتی ہیں۔“ آرزو کی طنزیہ آواز پہ اس نے چہرہ اس کی جانب موڑا۔

”اگر شکل اچھی ہو تو معذوری میں بھی اچھی ہی لگتی ہے، آرزو بی بی! ورنہ لوگ تو گھنٹوں کی تراش خراش کے بعد بھی خوب صورت نہیں لگتے۔“

”چچچ..... رستی جل گئی، مل نہیں گے۔“ وہ اس کے سامنے والے صوفے پے بیٹھ گئی۔ دائیں ٹائگ بائیں پے چڑھائی اور بڑے اتحاقاً سے سائیڈ نیبل پر رکھا، ہمایوں کا موبائل اٹھایا جو اس نے بیٹھتے ہوئے ادھر رکھا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نامحمل! مجھے اس سے پیار ہو گیا ہے، تو ایسے فرست سائٹ۔ میں اسے حاصل کر ہی لوں گی۔“

”اور میں نے بھی تب کہا تھا آرزو! کہ تم خدا نہیں ہو جو ہر چیز تمہاری مرضی سے ہو۔ آج وہ تمہارے لئے مجھے چھوڑ رہا ہے، کل کوئی اور کے لئے تمہیں بھی چھوڑ دے گا، تب میں تمہاری آہیں سننے ضرور آؤں گی۔“

آرزو بے اختیار محفوظی پس پڑی۔

”دیلیس ہو رہی ہو..... ہے نا؟“

اس کا اندازِ محمل کے اندر آگ لگا گیا۔ مگر اس نے وہ آگ چڑے پہنہ آنے دی۔ وہ بہت کمال ضبط کا وقت تھا۔

”تمہارے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے، جس سے میں جیلس ہوں۔ رہا ہمایوں، تو شوق سے اسے لے لو، مجھے کھنکتی مٹی کے اس پٹلے کا کیا کرنا ہے، جس میں وفا ہی نہ ہو۔“

”تمہاری اکڑا بھی سک نہیں گئی محمل؟“

”اور میری یہ اکڑا جائے گی بھی نہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے، محمل، ہمایوں کے بغیر مر جائے گی؟ ہونہے۔“ اس نے تختی سے سر جھکا۔ ”میں سات سال کو ماں پڑی رہی، تب میرے پاس ہمایوں نہیں تھا، میں تب بھی نہیں مری، تو اب اس کے بغیر کیوں مروں گی؟ خیر..... اگر تم نے بیٹھنا ہے تو بیٹھو، کھانے پینے آئی ہو تو سامنے کچن ہے۔ ویسے بھی دوسروں کے مال کھانے کی تمہاری خاندانی عادت ہے اور ہمایوں کی خیرات کرنے کی۔ جو کھانا ہو، کھا لیتا۔ ٹیک کیسر۔“

اس نے دانستہ السلام علیکم کہنے سے احتراز بردا۔ کم از کم اس وقت وہ آرزو پر سلامتی نہیں بیسیج سکتی تھی اور وہیل چیز کارخ اپنے کمرے کی طرف موڑ دیا۔

دشده زرد کاغذ ادھ کھلا اس کی گود میں دھرا تھا۔

اسے آرزو کے بڑبڑا نے، اٹھنے اور بیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اب کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا گمراہش کے چوں کی طرح بکھر چکا تھا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لاک نہیں لگایا۔ اب کس کو اوہر آتا تھا بھلا؟ سب کچھ بکھر گیا تھا۔

وہ وہیل چیز کے پہلوں کو دونوں ہاتھوں سے گھستی سنگھار میز کے سامنے لائی۔
کمرے کی تی بھجھی تھی۔ کھڑکی کے آگے پرده گرا تھا، کہیں درزوں سے زردی روشنی
جھانک رہی تھی، جس سے کمرے میں نیم اندر ہمراستھا۔

وہ اس نیم تاریک ماحول میں اپنا عکس آئینے میں دیکھے گئی۔

ہر شے اجز گئی تھی۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ راکھ کا ذہیر لگا تھا اور اس میں کوئی چنگاری
نہیں پہنچی نہیں۔

اپنے عکس کو دیکھتے اس کا دل چاہا، وہ کافیوں سے آویزے نوج پھیکے، نازک سا ہمار
آثار کر دیوار پر مارے، چوڑیاں توڑ دے۔ زور زور سے چلائے، دھاڑیں مار مار کر
روئے۔

اس نے ہاتھ آویزوں کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ دفعۃ نیم تاریک کمرے میں ایک
مدھمی آواز اُبھری۔

”آنکھ آنسو بہاتی ہے۔

اور دل غمگین ہے۔

مگر ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے جس پر ہمارا رب راضی ہو۔“

آویزے کو پکڑے اس کا ہاتھ بے دم سانچے گر گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ صبر، صدمے کی پہلی چوت پر ہوتا ہے۔ اور
انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو شخص گریبان چاک اور رخساروں پر ٹلانچے مارے اور
جاہلیت کی بذریعہ بنی (نوحہ) کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس نے سز وہیل چیز کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ قطرہ قطرہ آنسو بند
آنکھوں سے ٹکنے لگے۔ وہ بے آواز روئی رہی، بلکہ تی رہی۔ اندر ہمراستھے کمرے میں بیٹھی ایک
معدور، کمزور لڑکی جو بے آواز روئتے ہوئے بس ایک ہی لفظ بار بار دہرائے جا رہی تھی۔

”یا رب المستغفین“.... (اے کمزوروں کے رب.... اے کمزوروں کے رب)

دوپہر دم توڑ گئی، شام ڈوب گئی اور ہر سو رات چھانے لگی۔ جانے رات کا کون سا
پھر تھا، جب کسی نے دروازے پر دستک دی اور پھر چچاہٹ کی آواز کے ساتھ وہ

کھلتا چلا گیا۔

اس نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا۔ اسے اب کوئی خوش نہیں تھی کہ ہمایوں کبھی اس کے پاس آئے گا۔

قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایک بیولہ سا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
”محمّل!“ وہ فرشتے کی آواز تھی۔

وہ چپ چاپ، آنکھیں چھٹ پہ جمائے بیٹھی رہی۔
”محمّل! کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟“

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس کی تنگری آواز اُبھری۔
”محمّل! تم ٹھیک ہو؟“

اس نے دھیرے سے چہرہ انھایا اور متورم آنکھوں سے اندر میرے میں کھڑی فرشتے کو دیکھا۔ اس نے سیاہ جوڑا پہن رکھا تھا۔ سیاہ دوپٹے کے ہالے میں مقید اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔
”محمّل!“

”ہمایوں نے مجھے طلاق دے دی ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی تو آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

کتنے ہی بلی ماہول پہ سکتہ سا چھایا رہا۔
”کب؟“

”آج دوپھر میں..... میں عدت اس گھر میں پوری کروں گی، پھر اس کے بعد میں چلی جاؤں گی اور وہ شادی کر لے گا۔“ اس نے رخ فرشتے سے موڑ لیا، تاکہ وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

”آئی ایم ویری سوری مھمل!“ وہ متاسف کھڑی تھی۔ ”تم عدت کے بعد کہاں جاؤ گی؟“

”اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے۔ کہیں بھی چلی جاؤں گی۔“

”کیا تم خود کو اتنا اسٹر ونگ فیل کرتی ہو کہ حالات کا مقابلہ کر لو گی؟“

”ہاں، میں کرلوں گی۔ آپ جائیں، مجھے اکیلا چھوڑ دیں پلیز۔“

فرشتے نے سمجھ کر سر بلایا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے بند ہونے کی آواز پر اس نے چہرہ واپس موڑا۔

کمرہ پھر سے سنان ہو گیا تھا، وہ جا چکی تھی۔

وہ رات بہت عجیب رات تھی۔ محل نے اتنی ویران رات کبھی نہیں گزاری تھی۔ تب بھی نہیں، جب وہ مسجد کی دیوار پھلانگ رہی تھی۔ تب بھی نہیں، جب اسے اس کی جائیداد اور مگر سے محروم کر کے باہر نکال دیا گیا تھا۔ تب بھی نہیں جب اس کی ماں مری تھی اور تب بھی نہیں جب وہ سات سال بعد کوئے سے جا گئی تھی۔ ایسی رات پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔

وہ وہیل چیز کی پشت سے سرٹکائے، نم آنکھوں سے چھٹ کو دیکھتی رہی۔ پر دوں سے چھن چھن کر اندر آتی چاندنی میں پردے یوں چمک رہے تھے جیسے چاندنی کے درق ہوں۔

زندگی ایک دم گویا ختم ہی ہو گئی تھی۔ ہر طرف اندر ہرا تھا۔ اس کے پاس آگے چلنے کو کوئی امید نہ رہی تھی۔ ہمایوں اس کا نہیں رہا تھا، تیمور اس کا نہیں رہا تھا، نہ کسی رشتہ دار کا آسرا تھا۔ اور رہی فرشتے تو وہ اس کے جانے کے بعد مسجد شفت ہو جاتی۔ وہ کب تک فرشتے کو اپنی وجہ سے پابند رکھتی؟

وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں۔

رات یوں ہی خاموشی سے بیتی گئی۔ وہ اسی طرح برف کا مجسم بنی وہیل چیز پر پڑی رہی۔ پر دوں کی چمک ختم ہوتی گئی اور کمرے میں مہیب گھپ اندر ہرا چھا گیا۔ اسے اس اندر ہرے سے خوف آنے لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھنے کی سعی کرنے لگی۔ اور تب ہی کھڑکی کے کناروں میں صبح کا ذب کی نیلا ہٹ اُبھرنے لگی۔ ڈور کہیں فجر کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔

اس کے برف بینے وجود میں پہلی بار جنش ہوئی۔ اس نے اپنے سُن ہوتے ہوئے ہاتھ اٹھائے اور پہیوں کو آگے کی طرف گھسیٹا۔ شیلف پر ایک طرف وضو کے پانی کا

برتن رکھا تھا۔

محمد نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ پھر جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو کوئی دعا ذہن میں نہ آئی، بس ایک وہ ہی لفظ۔

”اے کمزوروں کے رب!“ بوس پے اترا۔ اس نے کئی بار اسے دہرا�ا۔ آنکھوں سے شپ شپ آنسو گرنے لگے تو اس نے آمین کہا کہ چہرے پے ہاتھ پھیر لئے۔

کمرے میں بلکل بلکل نیلا ہٹ اٹرنے لگی تھی۔ وہ وہیل چیز کو شیلف کے قریب لائی، جہاں شیپ ریکارڈر اور ساتھ کیسٹوں کا ذوبہ رکھا تھا۔ اس نے پناہ کیجئے ایک کیسٹ کا لی اور شیپ میں ڈال کر پلے کا بٹن دبایا۔

کہیں درمیان سے تلاوت شروع ہو گئی تھی۔

”اور کس کی بات اس شخص کی بات سے زیادہ اچھی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے؟“

وہ حیرت سے چونکی۔ یہ آیت تو پرسوں اس نے پڑھی تھی، پھر یہی کیوں لگ گئی؟

”اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں۔“

وہ حیران سی سن رہی تھی۔ اللہ اسے یہ آیات پھر سے کیوں سنوارا تھا؟ یہ آیات تو گزر چکی تھیں، پھر دوبارہ کیوں؟

”برائی کو اس طریقے سے دور کرو، جو بہترین ہو۔“

قاری صاحب کی آواز پڑھتے ہوئے بھرا گئی تھی۔

وہ ابلجھ کی گئی۔ اللہ اسے کیوں پھر سے وہی بات بتا رہا تھا؟ وہ شخص تو اب سارے تعلق کاٹ چکا تھا، اب تو کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ پھر کیوں اسے برائی کو بہترین طریقے سے دور کرنے کو کہا جا رہا تھا؟

وہ میرا حیسم (جاں شار دوست) نہیں بن سکتا، اللہ تعالیٰ! اس نے مجھے طلاق دے دی ہے، وہ مجھے تین ماہ بعد گھر سے نکال دے گا۔ اب تو درمیان کا کوئی راستہ نہیں رہا گیا، پھر آپ کیوں مجھے اس عداوت کو دور کرنے کا کہہ رہے ہیں؟ وہ ایک دم رو پڑی تھی۔

پردوں کے دوسری طرف سے روشنی جماعتے گئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پردے

ہشادیے۔

باہر لان میں صبح اتر رہی تھی۔ گہری سیاہ رات کے بعد اتری صبح۔

”برائی کو اس طریقے سے دور کرو، جو بہترین ہو۔“

گھاس پر تیمور بیٹھا تھا۔ نیکر شرٹ میں ملبوس، سوئی سوئی آنکھیں لئے وہ گھاس پر بیٹھی تھیں کی مرپ پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ شاید اس کے ہاتھ میں کچھ تھا، جو وہ تھیں کھلانے لایا تھا۔

”پھر دھندا وہ شخص.....“

”پھر دھندا وہ شخص.....“

”پھر دھندا وہ شخص.....“

قاری صاحب کی آواز اور اس کی سوچیں آپس میں گذشتہ ہو رہی تھیں۔

تیمور اب تھی کے منہ میں روٹی کا ٹکڑا ذائقے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے۔“

وہ الفاظ کمرے کی دیواروں سے ٹکرار ہے تھے۔

وہ پنا پلک جھپکے تیمور کو دیکھ رہی تھی۔ اس اتری نئی صبح میں اس پر اچانک سے کچھ آشکار ہوا تھا۔

”وہ شخص“..... ہمایوں نہیں تھا، نہیں تھا، نہیں تھا۔

”وہ شخص“..... تیمور تھا۔

اس کا بیٹا، اس کا خون، اس کے جسم کا ٹکڑا۔ کیا وہ اس کا حیم (جاں نثار دوست) بن سکتا تھا؟..... کیا واقعی؟..... کیا وہ ایسی قست دالی ہے؟..... کیا ایسا ممکن ہے؟

وہ ایک نئی آگئی کے احساس کے ساتھ حیرت میں گھری بیٹھی تھی۔

تیمور اب روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے سامنے گھاس پر ڈال رہا تھا۔ تھیں لپک کر آگئی اور گھاس پر منہ مارنے لگی۔



بلقیس کری پہ چڑھی، اور پہنچنے کی بست کو کھولے کھڑی تھی، جبکہ وہ سامنے وہل چیز پہ بیٹھی، گردن اور پر اٹھائے اسے ہدایات دے رہی تھی۔ اس کے اور ہمایوں کے ٹوٹے تعلق کی بات ابھی ملازموں تک نہیں پہنچی تھی۔

”بیوکلر کا ولیوٹ کور کا الیم ہو گا۔ سائیڈ پر دیکھو۔“

”یہ والا بی بی؟“ اس نے ایک الیم نکال کر وہیں سے لہرایا۔

”یہ میرون ہے بلقیس! میں بیوو کہہ رہی ہوں۔ نیلا آسمانی رنگ۔“ وہ اس الیم کی تلاش میں اسٹڈی کے کئی دراز اور خیلف چھوڑ چکی تھی۔ اب اور واپس کی پاری آئی تھی۔

”ایک منٹ جی۔“ اسے شاید کچھ نظر آیا تھا۔ کچھ دیر اندر سرگھائے ہاتھ مارتی رہی، پھر کہیں پہنچے سے کھینچ کر الیم نکالا۔

”یہ ہی ہے، لا دُنگھے دو۔“ اس نے سکون کی گہری سانس اندر کو کھینچی۔

”یہ لیں جی۔“ بلقیس نے ننگے پاؤں زمین پر رکھے اور الیم اس کو تھما کر چپل اڑانے لگی۔ ”میں ذرا ہائی دیکھو لوں۔“

”ہاں جاؤ۔“ اس نے الیم دونوں ہاتھوں میں لیا، اس پر جمی گرد جھاڑی اور پہلا صفحہ کھولا۔

یہ آغا ہاؤس میں کھینچی گئی تیلی جملی تصاویر کا الیم تھا، جب وہ اپنی شادی کے بعد آغا

ہاؤس گئی تھی تو واپسی پہ اپنی کچھ دوسری چیزوں کے ہمراہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس میں زیادہ تصادیر اس کی اپنی تھیں۔ کہیں وہ تیرہ سال کی تھی تو کہیں انہیں سال کی۔ کچھ تصادیر خاندان میں ہونے والی شادیوں کی بھی تھیں۔ وہ محosi ان کو دیکھتی صفحے پلٹنے لگی۔ معلوم نہیں، یہ سب لوگ اب کہہ رہتے۔ سوائے آرزو کے، کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اور آرزو سے ان کا پتہ وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی اس روز کے بعد آرزو ادھر نہیں آئی تھی۔ ہاں، ہر شام ہمایوں کہیں باہر نکل جاتا تھا۔ ایک دفعہ پوچھنے پہ بقیس نے بتایا کہ وہ کسی ”دوست“ کے ساتھ اس وقت شام کی چائے پیتے ہیں۔ اور دوستی کا ایک نظارہ تو وہ اس روز مرکز کے ریسٹورنٹ میں دیکھا ہی چکی تھی، سواب مزید کریڈنے کی حاجت نہیں رہی تھی۔

اور رہے یہ لوگ تو ان کی تصویریں دیکھتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح یہ ہی سوچ رہی تھی کہ ان کا کیا بنا؟ کیا وہ ابھی تک بے مہار گھوم رہے ہیں یا اللہ نے ان کی رستی کھینچی؟ ٹلم اور والدین کی نافرمانی تو دو ایسے گناہ ہیں جن کی سزا دنیا میں بھی لازماً ملتی ہے۔ تو کیا ان کو سزا ملتی؟ کیا ان کو احساس ہوا؟ اور سب سے بڑھ کر کیا اس شخص کو سزا ملی جو اس وقت اس کے سامنے تصویر میں مسکرا رہا تھا؟

آغا فوادِ کریم..... آغا جان کا ولی عہد، جس نے اس کو بکاؤ مال بنایا۔ بلیک میل کر کے تمام جائیداد اپنے نام لکھوائی اور پھر اس کی گردن پہ پستول رکھ کر فرشتے کو دھکایا، مگر سے نکلوایا اور بعد میں جانے والے ہمایوں کو آکر کیا کہہ گیا تھا کہ ہمایوں اس کی نکل دیکھنے کا روادار نہ رہا تھا۔

”ہائٹی نہیں گلی تھی، شگرِ مالک کا۔“ بقیس تیزی سے واپس اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے خیالات سے چونک کر سراخایا۔

”ہائے، کتنے سو بنے فوٹو ہیں۔ یہ آپ کے گھر والوں کے ہیں جی؟“ وہ کھلے الہم کو دیکھ کر اشتیاق سے اس کے کندھے کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور سر جھکائے دیکھنے لگی۔

”ہاں، میرے رشتہ دار ہیں۔“ اس نے صفحہ پلٹا۔ اگلے صفحے پہ آرزو اور فواد، ہائی مال کے ساتھ کھڑے تھے۔ یہ خاندان کی کسی شادی کا فوٹو تھا۔

”یہ تو وہ ہیں!“ بلقیس گویا حیرت زدہ رہ گئی۔

تب اسے یاد آیا، بلقیس نے ہی تو اسے فواد کے آنے کا بتایا تھا، شاید وہ اسے پہچان گئی تھی۔

”یہ آپ کی رشته دار ہیں جی؟ یہ تو ادھر آتی رہتی ہیں۔ کمال ہے، مجھے پتہ ہی نہیں تھا۔“

”کون؟..... یہ لڑکی؟“ اسے حیرت ہوئی۔ وہ تو سمجھی تھی کہ بلقیس، فواد کی بات کر رہی ہے۔

”ہاں جی، یہ آرزو بی بی!“ اس نے آرزو کے چہرے پر انگلی رکھی۔

”ہاں، یہ میری کزن ہے اور یہ ساتھ فواد ہے جو ہمایوں کے پاس آیا تھا۔“

”آیا ہو گا جی۔“ وہ ابھی تک اشتیاق سے آرزو کے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز میں ذرا سی لاپرواں تھی۔ یک دم محمل کو کچھ کھلا۔ اسے لگا، وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔

”بلقیس! یہ وہی بندہ ہے جو اس روز ہمایوں کے پاس آیا تھا، جب ہمایوں نے فرشتے کو ڈالنا تھا؟“ اس نے الہم ذرا اس کے قریب کیا۔ ”تمہیں یاد ہے، تم نے مجھے بتایا تھا؟“

”نہ جی، یہ تو کبھی نہیں آیا۔“

”یہ..... یہ کبھی نہیں آیا؟“ اسے جھٹکا لگا تھا۔ ”تو پھر وہ کون تھا؟“

”پتہ نہیں جی۔ کوئی آپ کا رشته دار تھا۔ آپ کے پچھا، تایا..... کسی کا بیٹا تھا۔“

”میرے پچھا کا بیٹا؟ ایک منٹ، یہ..... یہ دیکھو۔“ وہ جلدی جلدی الہم کے صفحے پیچھے کو پلٹنے لگی۔ پھر حسن کی تصویر پر رُکی۔

”یہ تھا؟“

”نہیں جی، یہ تو بڑا بابو لوگ ہے بی بی! وہ تو تم میں کم تھا۔“

”کیا مطلب، کم تھا؟“ وہ ابھی۔ بلقیس متذبذب سی کھڑی تھی، جیسے اپنی بات صحیح نہ پہنچا پا رہی ہو۔

”اچھا، یہ تو نہیں؟“ اس کے ساتھ لگی وسیم کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ بلقیس پہلے نہ جی میں سر ہلانے لگی، پھر یک دم رک گئی اور چہرہ جھکا کر غور سے تصویر کو دیکھا۔ کافی دری وہ تصویر کو بغور دیکھے گئی۔

”ہاں جی، یہ والا تھا..... یہ ہی ہوا تھا۔“

تو کیا وسیم؟..... وہ ابھی حیران بھی نہ ہو پائی تھی کہ بلقیس نے معیز کی شکل پہ انگلی رکھی، جو تصویر میں وسیم کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ سدرہ کی مشکنی کی تصویر تھی۔

معیز؟..... وہ معیز تھا؟..... معیز آیا تھا؟ وہ ششدہ رہ گئی۔

”یہ ہی تھابی بی! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ابھی ذرا بچہ لگ رہا ہے، مگر یہ شاید پرانی تصویر ہے جی، جب ادھر آیا تھا تو اس سے بڑا تھا۔ میں بھیگ رہی تھیں، قد بھی اونچا المبا تھا، میں آپ کو کہہ رہی تھی ناکہ عمر میں کم تھا۔“

اور وہ تو ایسی دم بخود بیٹھی تھی کہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ تصویر میں معیز بارہ سال کا تھا، اب میں کا ہو گا اور جب وہ ادھر آیا تھا تو یقیناً سترہ برس کا ہو گا۔ مگر وہ کیوں آیا؟ وہ کیوں ہماں سے لڑا؟ وہ دونوں کیوں بلند آواز میں لڑتے جھگڑتے رہے؟

بہت سے سوال تھے، جن کے جواب اسے معلوم نہ تھے۔ بلقیس سے پوچھنا بے کار تھا۔ اس نے پہلے جب اس کے کزن کا ذکر کیا تھا تو ایسے تعظیم سے ”ان“ اور ”وہ آئے“ جیسے الفاظ استعمال کئے تھے کہ وہ بالکل غلط سمجھہ بیٹھی۔ مگر خیر، بلقیس کا قصور نہیں تھا۔ اور پتہ نہیں کس کا قصور تھا۔

اس نے بے ولی سے الہم بند کیا اور میز پر رکھ دیا۔



چمکیلی صبح برآمدے پہ بھسل رہی تھی۔ بلقیس پاپ لگائے سفید سنگ مرمر کا چمکتا برآمدہ دھور رہی تھی۔

وہ صبح ناشستے کا وقت تھا۔ ہماں کو اس کے کمرے میں ناشستہ دے کر بلقیس اب ادھر مصروف تھی۔ تیمور کو دھر تھا، اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ آج اپنی جمر کی تلاوت نہیں کر سکی تھی اور اب ادھر و جمل چیز پر بیٹھ کر وہ ہی کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر بار بار دھیان بٹ جاتا تھا۔

بلقیس، پائپ اٹھائے برآمدے سے نیچے اتر گئی۔ اب وہ ڈرائیورے پے پانی ڈال رہی تھی۔ برآمدے کے فرش پر کہیں کہیں پانی چک رہا تھا۔
دفعتنا دروازہ کھلا تو وہ چونک کرو یکھنے لگی۔

ہمایوں عجلت بھرے مصروف انداز میں کف بند کرتا باہر آ رہا تھا۔ اس نے محمل کو ادھر بیٹھے دیکھا یا نہیں، اس کے بے نیاز انداز سے یہ پڑھانا مشکل تھا۔ وہ سیدھا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

بلقیس نے جھاڑو اٹھائی اور بھاگ کر پائپ ڈرائیورے سے ہٹایا۔ چوکیدار جو گھاس کاٹ رہا تھا، پھرتی سے آگے بڑھا اور گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیئے۔
وہ گاڑی میں بیٹھا، زور سے دروازہ بند کیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے گاڑی نکال کر لے گیا۔

گیٹ کے دونوں پٹ کھلے رہ گئے۔ چوکیدار نے ابھی انہیں بند نہیں کیا تھا۔ وہ واپس درانتی اٹھائے گھاس کی طرف آ گیا تھا۔

بلقیس پھر سے پائپ کا فوارہ سفید بھری کے ڈرائیورے پے ڈالنے لگی۔ وہ سر جھنک کر اپنی آیات کی طرف متوجہ ہوئی۔

مگر پھر پڑھتے پڑھتے نگاہ پھسلی، پہلے ناخنوں کے کناروں کو دیکھا، پھر ہاتھوں کو، پھر ان سے ہوتی ہوئی پیروں پہ جائیکی اور پھر سے پائپ کے پانی کی طرف بھنک گئی۔
کھلے گیٹ کے اس پار سامنے والوں کا گیٹ بھی کھلانظر آ رہا تھا۔ وہ بے دھیانی میں کسی سوچ میں گم ادھر دیکھے گئی۔ سامنے والوں کے گیٹ کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی، اس کے کندھے پر پیارا سا پھولے پھولے گالوں والا بچہ تھا۔ ساتھ ہی گاڑی کا دروازہ کھولے ایک گڈل لگ سا آدمی مسکرا کر انہیں کچھ کہہ رہا تھا۔ لڑکی ہنس رہی تھی۔ پھر وہ آدمی جو غالباً اس کا شوہر تھا، گاڑی میں بیٹھ گیا اور لڑکی پیچے کا ہاتھ پکڑ کر بائی بائی کے انداز میں گاڑی کی طرف ہلانے لگی۔ بچہ قلقاریاں مار رہا تھا۔ آدمی نے مسکرا کر ہاتھ ہلا کیا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

ایک مکمل اور خوب صورت فیملی۔

وہ چپ چاپ ان تینوں کو دیکھئے گئی، یہاں تک کہ گاڑی فرائی بھرتی سڑک پر آگئے نکل گئی اور لڑکی بچے کو کندھے سے لگائے گیٹ بند کرنے لگی۔

اس نے ہولے سے سر جھکا اور اپنی خاموش، بالکل خاموش نظریں واپس قرآن پر جھکا دیں اور پڑھا کہ آگے کیا لکھا ہوا تھا۔

”اس کی طرف مت دیکھا کرو جو ہم نے دوسرے جوڑوں کو عطا کیا ہے۔“

محل نے بے اختیار شہنشدی سانس لے کر سراٹھایا۔ پھر ادھر ادھر گردن گھمائی۔ بلقیس اپنے کام میں مگن تھی اور چوکیدار اپنے کام میں۔ وہاں کسی نے اس کی ایک لمحے کی وہ نظر نہیں پکڑی تھی..... مگر..... مگر۔

اس نے ذرا سی گردن اوپر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

مگر کوئی تھا جو اس کی لمحے بھر کے لئے بھکی نگاہ بھی پکڑ لیتا تھا اور کسی دوسرے کو بتاتا بھی نہیں تھا، خاموشی سے اسے تنبیہ کر دیتا تھا، سمجھا دیتا تھا۔ بہت احسان تھے اس کے اس پر۔ وہ تو شکر بھی ادا نہیں کر سکتی تھی۔

”بلقیس! آج کون سادن ہے؟“ ایک دم اسے خیال آیا تو اسے پکارا۔

”جمعہ ہے جی۔“ وہ اب پاپ بند کر کے اسے سمیٹ رہی تھی۔

”اوہ اچھا!“ اسے یاد آیا۔ آج تو سورہ کہف پڑھنی تھی۔ جانے وہ کیسے بھول گئی۔ وہ خود کو سرزنش کرتی قرآن کے صفحے پلنے لگی۔

چوکیدار گیٹ بند کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا اور بلقیس اندر۔ وہ برآمدے میں تھا رہ گئی تھی۔ پہلے قرآن سے پڑھنے کا سوچا، مگر سورہ کہف یاد تھی ہی، سور قرآن میز پر رکھا اور سر کری کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

کبھی کبھی اس کو لگتا تھا، اس کی زندگی مصحف قرآنی کے گرد ہی گھونٹنے لگی ہے۔ اس کا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں اس کا کردار نہ ہو۔ ہر لمحے، ہر وقت وہ قرآن کو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اب اس کے بغیر اس کا گزارہ بھی نہ تھا۔

آنکھیں موندے وہ بسم اللہ پڑھ کر سورہ کہف پڑھنے لگی۔

اس شہنشدی صحیح میں ہر طرف خاموشی اور میٹھی سی چاشنی چھا گئی تھی۔ وہ آنکھیں

موندے اپنی علاوت کر رہی تھی۔

”ام حسبت ان اصحاب الکھف.....“

”والرقیم.....“

ابھی اس نے فویں آیت ”اصحاب الکھف“ تک ہی پڑھی تھی کہ کسی نے اگئے لفظ ”والرقیم“ پڑھ دیا۔ اس کے ملئے لب رک گئے۔ بہت حیرت سے چونکتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔

سامنے کھلے دروازے میں تیمور کھڑا تھا۔

اپنے نائٹ سوٹ میں مبوس، کچی نینڈ سے خمار آلود آنکھیں لئے وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

چند لمحوں کے لئے سارے میں سناثا چھا گیا۔ وہ دونوں بنا پتلوں کو حرکت دیئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

اور پھر اسی طرح تیمور کی بھوری آنکھوں کو نگاہوں میں لئے اس نے ہولے سے لب کھولے اور پھر سے وہ آیت دہرائی۔

”ام حسبت ان اصحاب الکھف.....“ وہ دانستہ رکی تو تیمور کے نخے سرخ ہونٹ حرکت کئے۔

”والرقیم.....“

”کانو من ایتنا عجباً“ اس نے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لئے آیت مکمل کی۔

تیمور اسی طرح ساکت سا مجھتے کی طرح کھڑا تھا، جیسے برآمدے اور لان میں بہوت ہوئی خلق کا حصہ ہو۔

”ادھر آؤ۔“ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ کسی معمول کی طرح آہستہ سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا۔

اس نے اس کے ہاتھ تھامنے کو دونوں ہاتھ بڑھائے اور کسی سحر زدہ شخص کی طرح

تیمور نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیئے۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اصحاب الکھف کے بعد والر قیم آتا ہے؟“

وہ خاموش کھڑا رہا، جیسے اسے خود بھی نہ معلوم ہو۔

”تمہیں سورہ کھف آتی ہے؟“ نزی سے اس کے ہاتھ تھامے محمل نے پوچھا تو اس نے آہستہ سے سر کرنگی میں ہلا کیا۔

”پھر تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”It.... it just slipped“ (میرے منہ سے نکل گیا) وہ انک انک کر بول

رہا تھا۔ آنکھیں ابھی تک محمل کے چہرے پر جمی تھیں۔

اسے یاد تھا کہ تیمور کی پریشانی میں وہ ہر جعد کو یوں ہی بیٹھ کر آنکھیں موندے بلند آواز میں سورہ کھف پڑھا کرتی تھی، تاکہ وہ جنم لینے سے قبل ہی قرآن کا عادی ہو اور شاید وہ واقعی عادی ہو گیا تھا اور شاید سات سال بعد اس نے یہ آواز سنی تھی۔

”تمہیں اور سورتیں آتی ہیں؟“

اس نے پھر نگنی میں سر ہلا کیا۔ وہ اپنے ہاتھ ابھی تک محمل کے ہاتھوں میں دیئے کھرا

تھا۔

”تمہیں قرآن پڑھنا آتا ہے؟“

اس نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

”مسجد جاتے ہو یا کہیں اور سے سیکھا ہے؟“

”گھر پر قاری صاحب لگوانے تھے ذیڈی نے۔“

”کتنی دفعہ قرآن ختم کیا ہے؟“

”ٹوٹا نہیں۔“

”اوہ! کیا قاری صاحب کا قرآن بھی یونہی سنا کرتے تھے، جیسے میرا سنتے ہو؟“

”نہیں۔ وہ بالکل اچھا نہیں بولتے تھے۔“

”اور میں؟“

”آپ..... آپ اچھا بولتی ہو۔“ وہ اب بھی انک انک کر بول رہا تھا۔

”اور فرشتے کا اچھا لگتا ہے؟“

”وہ کبھی نہیں پڑھتی“ (She never reads)

”وہ recite (تلادت) کو read (پڑھنا) کہہ رہا تھا۔ مگر وہ وقت اس کی غلطی نکالنے کا تھا، نہ ہی یہ بتانے کا کہ وہ کون ساتھارے ساتھ پڑھتی ہو گی، وہ لمحے تو بہت خاص تھے، ان کو ضائع نہیں کرنا تھا۔

”تم ایسا پڑھ سکتے ہو؟“

”تو!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”پڑھنا چاہتے ہو؟“

”وہ خاموش کھڑا سے دیکھتا رہا۔

”محل نے آہستہ سے اس کے ہاتھ چھوڑ دے۔

”چلو، کل صبح پھر پڑھیں گے۔“ اور سر دہیل چیسر کی پشت سے ملا کر آنکھیں مود لیں۔ اس نے سوچا کہ اسے کھلا چھوڑ دے۔ اگر وہ اس کا ہوا، تو واپس آجائے گا، نہ ہوا تو نہیں آئے گا۔

کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو تمور ادھر نہیں تھا۔ فرش کا پانی سوکھ چکا تھا۔ چڑیاں اڑ گئی تھیں۔ سرخ کیڑے اپنے پلوں میں جا چکے تھے، چیونٹیاں بھر گئی تھیں، سفید ملی بھی واپس چلی گئی تھی۔

اور اللہ کی طرف بلا نے والی بات سے اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے بھلا؟

اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ دشمن کو دوست بنانے کا ”احسن“ طریقہ تو اسی آیت میں دے رکھا تھا، اس کی سمجھہ میں ذرا دیر سے آیا تھا۔



اگلی صبح وہ لان میں پلے سے موجود تھا۔ لان میں لاونج کی کھڑکی کھلتی تھی اور اس کے سامنے تیمور کا کمرہ تھا۔ آواز کاراسٹہ صاف اور کھلا تھا۔

پچھلا پورا دن اس نے دانستہ تیمور کا سامنا نہیں کیا تھا۔ وہ بھی کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ اس کی غالباً چھیاں تھیں، سو آج کل گھر پہ ہی ہوتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کل قرآن سن کر اس نے تیمور کو ذہنی طور پر ڈشرب کر دیا ہے۔ اگر وہ واقعی قرآن کی چاہ رکھتا ہے تو اس کے اندر مزید سنشے کی خواہش ضرور بھڑکے گی اور وہ خود ہی چل کر آئے گا۔ اس نے فو ماہ سے قرآن سنایا تھا۔ وہ سات سالوں میں اسے کیسے بھول سکتا تھا؟

بلقیس نے اسے لان میں ہی شیپ ریکارڈر سیٹ کر کے دے دیا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ تیمور جاگ چکا ہے یا ابھی سورہ ہا ہے، پھر بھی اس نے پلے کا ٹین دبایا اور آواز اوپھی کر دی۔

قاری المشاری کی سورہ کہف چلنے لگی تھی۔ گوکر قاری حضرات اور بھی بہت اچھے تھے۔ مگر جو بات قاری مشاری کے دیھنے، پر سوز انداز میں تھی، وہ اسے دنیا میں کہیں نہیں ملی تھی۔ سورہ کہف شروع ہوتی اور اس کے آنسو بننے لگتے تھے۔

پہلا رکوع ابھی ختم ہی نہیں ہوا تھا کہ برآمدے کا دروازہ کھلا اور تیمور بھاگتا ہوا برآمدے کی سیرہ میاں اُتر کر گھاس پ آیا۔ پھر اسے بیٹھنے دیکھ کر اس کے قدم سست پڑ گئے۔

وہ کہیوں تک آستینیں فولاد کئے ہوئے تھا، جن کے کنارے اور اس کے بازو گلے

تھے۔ چہرے اور مانچے پر گرے بال بھی گیلے تھے۔ پاؤں بھی ذہلے لگ رہے تھے۔ شاید وہ وضو کر کے آیا تھا۔

اس نے سکرا کر سرخم کر کے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلا ہوا قریب آیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

دونوں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے وہ مدھر، مترجمی آواز سنتے رہے جو غار والوں اور کتنے والوں کا قصہ بیان کر رہی تھی۔ ان چند نوجوانوں کا قصہ جو کہیں چلے گئے تھے۔ اور دو باغوں کے مالک کا قصہ، جسے اپنے مال اور اولاد پر بہت غرور تھا اور مویٰ علیہ السلام کا قصہ جو اللہ کے ایک بندے سے ملنے اس جگہ کو ڈھونڈ رہے تھے، جہاں مجھلی نے سمندر میں راستہ بنایا تھا۔ اور اس گردش کرنے والے آدمی کا قصہ جو سفر کرتا ہوا مشرق و مغرب تک جا پہنچا تھا۔

وہ چار قصے تھے جو قرآن کے درمیان میں رکھ دینے گئے تھے۔ جب وہ ختم ہوئے تو تیمور نے سراٹھایا۔ محل اب اشاعت کا بیٹھنے دبارہ تھی۔

”تمہیں پتہ ہے، یہ کس کی آواز ہے؟“

تیمور نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”یہ قاری مشاری تھے۔ تمہیں پتہ ہے وہ کون ہیں؟“

اس نے پھر گردن دائیں بائیں ہلانی۔

”پہلے وہ سنگر تھے۔ پھر انہوں نے قرآن پڑھا تو گلوکاری چھوڑ دی اور قاری بن گئے۔ ان کے گیارہ مختلف ٹوٹیں قرآن موجود ہیں، مگر مجھے یہ والی ٹون سب سے زیادہ پسند ہے۔ تمہیں پسند آئی؟“

”می!“ وہ بے ساختہ کہہ کر اٹھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی چیختا، بد تیزی کرتا پچھتا تھا، جواب جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔

چند لمحے وہ خاموشی سے اپنے بیٹھے کو دیکھتی رہی۔ (آخر تھا تو وہ پچھے ہی، کتنا ناراض رہ سکتا تھا بھلا؟) اور پھر آہستہ سے بولی۔

”مجھ سے ابھی تک خفا ہو؟“

تیمور نے آنکھیں اٹھا کر خاموشی سے دیکھا، منہ سے پچھناہ بولا۔

”کیوں خفاقتھے مجھ سے؟“

”وہ چپ رہا۔ بالکل چپ۔

”تمہیں میں بہت بڑی لگتی ہوں؟ تمہارا دل کرتا ہے کہ تم مجھے قتل کر دو؟“

”نو..... نہو!“ وہ گھبرا کر کہا، پھر ایک دم چپ ہو کر لب کاٹنے لگا۔

”تم پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ تم میرے لئے ہسپتال پھول لے کر آتے تھے، مجھ سے اتنی باتیں کرتے تھے، میرے ہاتھوں پہ پیار کرتے تھے، تمہیں بھول گیا ہے؟“
اس کی بھوری آنکھوں میں استعجاب پھیل گیا۔

”آپ کو سنائی دیتا تھا سب؟“ زندگی میں پہلی بار اس نے محمل سے یوں بات کی۔
وہ اندر سے ٹرپ کر رہ گئی۔

”تمہیں لگتا تھا کہ میں اپنے تیمور کی بات نہیں سنوں گی؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ اس نے الٹا سوال پوچھا۔ تردید نہیں کی، نہ وہ جھوٹ بولنا چاہتی تھی، نہ ہی اسے مایوس کرنا چاہتی تھی۔

”آپ..... آپ پھر اس رات بلوتی کیوں نہیں تھیں جب ڈیڈی نے مجھے مارا تھا؟
آپ کو سب سنتا تھا تو آپ بلوتی کیوں نہیں تھیں؟“ اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ غصے سے نہیں، دکھتے۔

”میں بول نہیں سکتی تھی۔ میں بیمار تھی۔ اور.... اور.... ڈیڈی نے تمہیں کیوں مارا تھا؟“

وہ ٹرپ کر رہ گئی تھی، مگر بظاہر خود کو کپوزڈ رکھا۔

”وہ اس چریل (چڑیل) سے شادی کر رہے تھے۔ میں نے ان سے بہت لڑائی کی تھی۔“ اس کی مولیٰ موٹی، بھوری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ”وہ کہتے تھے، وہ اس ویج سے شادی کر لیں گے۔ وہ آپ کو ڈائیورس کر دیں گے۔ میں ان سے بہت لڑا تھا۔“ اور ایک دم وہ جھوٹ پھوٹ کر دنے لگا۔

”تیمور!“ وہ تحریر رہ گئی۔ اس نے کبھی اسے روتنے نہیں دیکھا تھا۔

”ادھر آؤ میرے پاس۔“

وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ چڑے پر رکھے رو رہا تھا۔ محل نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھا۔

”میرے پاس آؤ۔“ اسے ہاتھوں سے تھام کر کھڑا کیا اور خود سے قریب کیا۔

”ڈیڈی نے کیوں مارا تمہیں؟“

”میں نے کہا تھا، میں ان کو اور اس وچ کو گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری ماں بری عورت ہے۔ میں نے ان پر بہت شاؤٹ کیا تو انہوں نے مجھے ادھر تھپٹر مارا۔“ اس نے ہاتھ اپنے آنسوؤں سے بھیکے گال پر رکھا۔ محل نے بے اختیار اس کا گال چوما۔ وہ بیٹھی تھی اور وہ اس کے ساتھ کھڑا رہا تھا۔

”تم پھر میرے پاس آئے تھے؟“

”ہاں، میں اتنی دیر تک آپ کے پاس روتا رہا تھا، بٹ یوورسلینگ۔ آپ نے مجھے جواب نہیں دیا۔ آپ نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ آپ بولتی نہیں تھیں۔ آپ نے مجھے پیار نہیں کیا۔“

”اور تم مجھ سے ناراض ہو گئے؟“ وہ ہپکیوں کے درمیان آنسو پوچھ رہا تھا۔

”میں تب بیمار تھی۔ بول نہیں سکتی تھی، لیکن اب میں تمہارے پاس ہوں گا، اب تو تم ناراض نہیں ہو؟“

ہمیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلاایا۔ اس نے بے اختیار اسے گلے سے لگایا۔

ایک دم، ہی اس کے ادھورے وجود میں شندک اتر آئی۔ اسے لگا، وہ مکمل ہو گئی ہے، اب اسے کسی ہمایوں داؤ دنائی شخص کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اس کا تیمور واپس مل گیا تھا۔



وہ دن بہت خوب صورت تھا، جب وہ دونوں خوب رو چکے، تو پھر مل بینہ کر خوب باشیں۔ کبھی لان میں، کبھی ڈاگنگ نیل پر، کبھی لاونچ میں اور پھر تیمور کے کمرے

میں۔

اس سے بات کر کے محمل کو پتہ چلا تھا کہ اس کا یہ روزیہ اس رات کا عمل تھا، جو اس نے ہمایوں سے تھپٹر کھانے کے بعد محمل کو پکارتے گزاری تھی۔ شاید وہ ساری رات روتا رہا تھا، مگر اس کی ماں نے جواب نہیں دیا تو وہ اس سے بدھن ہو گیا۔ مگر بچہ تھا، آخر کتنی دری ناراض رہ سکتا تھا۔ بالآخر اپنے اندر کا سارا لاوا نکال کر اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور یہ بدگمانی کی عادت تو اس نے اپنے ماں اور باپ دونوں سے درٹے میں لی تھی۔ اس کا قصور نہیں تھا۔

اس کی باتوں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ آرزو اور ہمایوں کے تعلق کو بھی جانتا ہے، مگر محمل دانستہ اس موضوع کو نہیں چھیڑتی تھی۔ محمل کو اب احساس ہوا تھا کہ تیمور غیر معمولی ذہین اور سمجھہ دار لڑکا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کے بارے میں خبر رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کب ہمایوں نے اسے طلاق دی، کب اسے جھپڑا، کب اس پر چلایا اور دوسری ہرشے جو ان دونوں کے درمیان تھی، وہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے اس سے نفرت ہے، مگر اس کے باوجود وہ اس کے ہر بیل کی خبر رکھتا تھا۔

”اگر ڈیڈی نے آپ کی ڈائیورس واپس نہ لی تو آپ یہاں سے چلی جائیں گی؟“
وہ دونوں تیمور کے کمرے میں بیٹھے تھے، جب اس نے بے حد اداسی سے کہا۔

”جانا تو ہے۔“

”پا بھی ٹو اینڈ آف ملٹھ آپ ادھر ہی ہیں نا؟ آپ کی ڈائیورس کے تھری ملٹھس بعد تک آپ نے تھیں رہنا ہے نا؟“
وہ اپنی باتوں سے اسے جیران کر دیتا تھا۔ اس کی عمر اتنی نہیں تھی، مگر وہ ہر بات سمجھتا تھا۔

”ہاں.....“

”ابھی تو ہاف ملٹھ ہوا ہے۔ ابھی تو بہت نائم ہے، کیا پتہ ڈیڈی، ڈائیورس واپس لے لیں۔“

اس نے سوچا کہ اسے سمجھائے کہ پہلی طلاق واپس نہیں ہوتی، بلکہ اس میں رجوع

ہو سکتا ہے، مگر اس کے نئے دماغ کو خواجہ کہاں دکھاتی؟ سوبات بدل دی۔
”مجھے اپنی بکس دکھاؤ۔“

”آپ تاپک مت چینج کریں۔ میں آپ کو ساری بکس دکھا چکا ہوں۔“
”اوہ..... میرا مطلب تھا کہ کاپیز دکھاؤ۔“

”محمٰل!..... محمٰل!“ اس سے پہلے کہ تیمور جواب دیتا، اس نے فرشتے کی آوازی جو باہر سے پکار رہی تھی۔ اس کی وہیل چیز درازے سے ذرا ذور تھی، سواس نے تیمور کو اشارہ کیا۔

”بیٹا! دروازہ کھولو۔“

”پلیز نو!“ اس نے براسامنہ بنایا اور وہیں بیٹھا رہا۔
”محمٰل!“ فرشتے کی آواز میں پریشانی تھی۔

”تیمور! پلیز دروازہ کھولو، خالہ بلا رہی ہیں۔“ وہ چاہتی تو فرشتے کو آواز دے لیتی، مگر ابھی وہ تیمور کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”شی از ناث مائی خالہ۔“ وہ منہ ہی منہ میں بدبداتا اٹھا، دروازہ آدھا کھول کر سر باہر نکلا اور غصے سے بولا۔

”واش رائگ و دیو؟“

”اوہ، سوری سنی! میں مھمل کو ڈھونڈ رہی تھی۔“ فرشتے کی جملی آواز آئی۔
”شی از و د عی۔ پلیز ڈوٹ ڈشرب اس۔“ (وہ میرے ساتھ ہیں، پلیز ہمیں ڈشرب نہ کریں) اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر واپس مڑا تو مھمل قدرے خفا سی اس کو دیکھ رہی تھی۔

”وہ میری بہن ہے۔ تم اسے مجھ سے بات بھی نہیں کرنے دو گے جیٹا؟“
”آپ کیوں اس وجہ نمبرٹو کو پسند کرتی ہیں؟ میرا تو دل کرتا ہے، اس سے کہوں اپنا بروم اسٹک اٹھائے اور یہاں سے چلی جائے۔“ بگڑ کر کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر دروازہ کھولا۔

”آ جاؤ۔“ فرشتے کا چہرہ دکھائی دیا تو مھمل نے مسکرا کر کہا۔

وہ حیران کی دروازے میں کھڑی تھی۔

”تم اور سنی.....اوہ گاڑ.....یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ حیرت زده بھی تھی اور خوش بھی۔

”بس، اللہ کا شکر ہے۔“ اس نے مکراہٹ دبا کر کندھے اچکائے، جیسے خود بھی اس خوشگوار واقعے پر لا جواب ہو گئی ہو۔

”آئی ایم سوپھی محمل!“ فرط جذبات سے فرشتے کی آنکھیں ڈبڈ با گئیں۔ اور اس سے پہلے کہ محمل جواباً کچھ کہہ پاتی، تیمور زور سے بولا۔

”تو، یو آرنٹ۔ آپ جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے سب پتہ ہے۔“

فرشتے کا چہرہ ماند پڑ گیا۔

”سنی! میں.....“

”یو کین گوناؤ، جست گوا بے۔“ وہ ایک دم زور سے چلا یا۔ فرشتے لب کاٹتی ایک دم پلٹتی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

تیمور بھی خصے میں مٹھیاں بھینچے بیٹھا تھا۔ وہ گئی تو اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور قریب رکھا کاغذ اٹھا کر پھاڑ ڈالا۔ پھر اس کے ٹکڑے دروازے پر دے مارے۔

محمل بغور اس کا روپیہ دیکھ رہی تھی۔ وہ واپس آ کر بیٹھ پہ بیٹھا تو اس نے اس کی رف کاپی اٹھائی، تین صفحے پھاڑے اور تیمور کی جانب بڑھائے۔

”لو، ان کو بھی پھاڑو۔“ تیمور نے پہلے ذرا حیرت سے اسے دیکھا، پھر جھپٹ کر کاغذ ٹکڑے اور ان کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

”یہ بھی پھاڑو۔“ وہ اس کی کاپی سے ایک ایک صفحہ نکال کر اسے پکڑاتی جا رہی تھی اور وہ وحشیانہ انداز میں اسے پھاڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گیا اور سر ہاتھوں پر گرا دیا۔

محمل نے اس کی کاپی بند کر کے بیٹھ پہ ڈال دی۔

”اٹھوا پانی پیو اور مجھے بھی پلاو۔“

اس کے اندر کالا وا باہر آ چکا تھا۔ سو خاموشی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد

واپس آیا تو ہاتھ میں پانی سے بھرا شش کا گلاس تھا۔ محمل نے گلاس تھاما، پانی پیا اور پھر گلاس واپس اس کی طرف بڑھایا۔

”اس کو بھی دیوار پر مارو اور توڑ دو۔“

تیمور لب کاٹتے اسے دیکھتا رہا، گلاس لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”اسے توڑنا چاہتے ہو؟“

”نہ.....“ اب وہ شہنشاہ پڑھ کا تھا

”چلو۔ لان میں چلتے ہیں۔ میں تمہیں ایک اسشوری بھی سناؤں گی۔“

اس کی بات پر وہ مسکرا دیا اور گلاس اس سے لے کر دروازہ کھولا، پھر ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ وہ آسودگی سے مسکراتی، وہیل چیز کے پہلوں کو دونوں ہاتھوں سے گھماتی آگے بڑھنے لگی۔



وہ دونوں لاڈنخ میں بیٹھے تھے۔ محمل کے ہاتھ میں قرآن کے قصوں کی کتاب تھی اور وہ موئی علیہ السلام کا قصہ تیمور کو سنارہی تھی۔ ان گزرے کچھ دونوں میں اس نے آہستہ آہستہ بہت سارے قصے اسے سنا ذالے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ تیمور میں قرآن کا شوق بیدا ہو جائے۔

”اور پھر موئی علیہ السلام کی ماں کا دل خالی ہو گیا۔“

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ لاششوری طور پر رک گئی۔ جانتی تھی، اس وقت کون آیا ہو گا۔ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔

”آگے بتائیں نا، ماما!“ تیمور چند لمحوں کے انتظار کے بعد بے چین ہو گیا، اسی میں ہمایوں اندر داخل ہوا۔ بے ساختہ ہی محمل نے سر اٹھا لیا۔

وہ تھکا تھا سا، سرخ آنکھیں لئے، آستین کہیوں تک فولڈ کئے چلا آ رہا تھا۔ ان دونوں کو یوں اکٹھا بیٹھے دیکھ کر ایک دم ثٹھک کر رکا۔ آنکھوں میں واضح حیرت اور انجھن اُبھری۔ وہ چچھلے دونوں کافی دیر سے سے گھر آ رہا تھا اور سوئے اتفاق وہ ان دونوں کی اس دوستی کے بارے میں کچھ جان نہ سکا، نہ ہی دیکھ سکا۔

محمل نے نگاہیں کتاب پر جھکا لیں اور آگے پڑھنے لگی۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ تیمور صوفی سے اٹھا اور لپک کر ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو!“ کچھ دیر تک وہ دوسری طرف ستارہ، پھر سر ہلایا۔ ”بھی، وہ ہیں۔ ایک منٹ۔“

وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے محمل کی طرف گھوما۔ اسی پل ہمایوں کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

”ماما! آپ کا فون ہے۔“

”کون ہے؟“ وہ ذرا حیران ہوئی۔ اس کے لئے بھلا کہاں فون آتے تھے؟

”وہ کہہ رہے ہیں، ان کا نام آغا فواد ہے۔“ تیمور نے ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔ تاریخی تھی، ریسیور اس تک پہنچ ہی گیا۔

”آغا فواد؟“ وہ بے یقینی سے بڑا بڑا، پھر ریسیور تھاما۔ کتنی ہی دیر وہ سن سی اسے کان سے لگائے بیٹھی رہی۔

”ہے..... ہیلو!“ اور پھر بمشکل لفظ لیوں سے نگل ہی پایا تھا کہ کسی نے سختی سے ریسیور اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ محمل نے بری طرح چونک کر پیچھے دیکھا۔

”میرے گھر میں یہ سب نہیں ہو گا۔ یہاں سے جا کر جو بھی کرنا ہو، کر لینا۔“ ریسیور ہاتھ میں لئے درشتی سے کہتا وہ محمل کے ساتھ آغا فواد کو بھی سنا چکا تھا۔

وہ ششدری سی بیٹھی رہ گئی۔ ہمایوں نے ایک شعلہ بار نگاہ اس پر ڈالی اور ریسیور کھاک سے کریڈل پر ڈال دیا۔ پھر جیسے آیا تھا، اسی طرح تیز تیز سڑھیاں چڑھتا گیا۔ تیمور خاموشی سے مگر بغور سب دیکھ رہا تھا۔ ہمایوں واپس ہولیا تو وہ آہستہ سے محمل کی طرف بڑھا۔

”ماما!“ اس نے ہولے سے محمل کا ہاتھ چھووا، پھر ہلایا۔

وہ اسی طرح شل سی بیٹھی تھی۔

”ایک دفعہ پہلے بھی ان کا فون آیا تھا آپ کے لئے، ڈیڑی نے تب ان کو کہا تھا کہ یہاں کوئی محمل نہیں رہتی۔ ماما! ڈیڑی ان کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ وہ تو آپ

کے کزن ہیں نا؟“

وہ ابھی تک سن تھی۔ پہلی دفعہ ہمایوں نے اتنی زہریلی بات کی تھی۔ یہ اتنا سارا زہر اس کے اندر کس نے بھر دیا تھا؟

”اچھا چھوڑیں نا، مجھے اس نوری آگے سنائیں۔“ وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ ہلا کر اس کو متوجہ کیا۔ محمل نے سر جھک کر کتاب اٹھا لی۔

④ ⑤ ⑥

وہ لان میں بیٹھی تھی اور تیمور پانی کا پاپ اٹھائے گھاس پر چھڑ کاؤ کر رہا تھا۔ قطرے مویوں کی طرح بزرگوں پر گر رہے تھے۔ وہ چہرے پر ڈھروں سکون لئے اے دیکھ رہی تھی۔

امام شافعی کہتے تھے، آزمائش جب بہت سُنگ ہو جاتی ہے تو پھر وہیں سے کھل جاتی ہے، ٹھیک ہی کہتے تھے۔ جب اسے زندگی میں گھپ اندر میرا نظر آنے لگا تھا، وہیں پر فخر کی پہلی کرن چکی تھی۔ ہمایوں کی بے وفائی کاغم اب اتنا شدید نہیں رہا تھا جتنا اس سے قبل تھا۔ تیمور کی محبت مرہم کا کام کر رہی تھی۔

شام اتر رہی تھی، جب اس نے گیٹ پر آہٹ سنی تو گرد موز کر دیکھنے لگی۔ فرشتے نے باہر سے ہاتھ اندر کر کے گیٹ کا ہنک کھولا تھا اور اب وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پینڈ بیک تھا اور وہ اپنے گھصوص سیاہ عبا یا اور اس کارف میں ملبوس تھی، جس میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ غالباً مسجد سے آ رہی تھی۔ اس وقت وہ اوھر پڑھانے جاتی تھی۔

”السلام عليکم! جلدی آ گئیں؟“ اسے آتے دیکھ کر محمل نے سکرا کر مخاطب کیا۔

”ہاں، بس ذرا تھک گئی تھی۔“ وہ تھکان سے سکراتی اُسی کی طرف چلی آئی۔

”کھانا کھا لیں۔ آپ نے دو پھر میں بھی نہیں کھایا تھا۔“

”ہاں، کھاتی ہوں۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں کہہ کر انگلی سے کپٹی سہلائی۔ اس کی مخزوٹی انگلی میں چاندی کی وہی انگوٹھی تھی، جو وہ اکثر دیکھتی تھی۔ جانے کیوں وہ محمل کو قدرے پر بیٹھان لگی تھی۔

”خریت فرشتے؟ مجھے آپ نہیں لگ رہی ہیں۔“

”نہیں تو۔“ وہ پھیکا سامسکرائی۔ تب ہی فاصلے پر کھڑے تیمور نے پائپ پھینکا اور ان کی طرف آیا۔

”وہ نہیں بھی ہے تو آپ کیوں کیسر (پروا) کرتی ہیں؟ جست لیو ہرalon!“ وہ بہت غصے اور بد تمیزی سے بولا تھا۔ محمل نے فرشتے کی مسکراہٹ کو واضح ماند پڑتے دیکھا، اس کا دل دکھا۔

”تیمور بیٹا! وہ تمہاری خالہ ہیں، ایسے بات....“

”جست گو! چلی جاؤ آپ یہاں سے۔“ وہ پیر شخ کر چینا۔ بالکل ہمایوں کا پرو۔

”سوری سنی!“ وہ شکستگی سے اٹھی، بیک ہاتھ میں لیا اور تیز تیز قدموں سے لان کی روشن پار کر گئی۔

”اور جہاں میری ماماں ہوں، وہاں مت آیا کرو۔“ وہ اس کے پیچھے چلا یا تھا۔ محمل نے تاسف سے برآمدے میں دیکھا، جہاں فرشتے دروازہ بند کر کے گم ہو گئی تھی۔ تیمور ابھی تک لب بھینچے برآمدے کو دیکھ رہا تھا۔

”اف..... یہ لڑکا..... کیسے سمجھاؤں اسے کہ تمہارے بڑے، تمہارے دشمن نہیں ہیں۔“ وہ سر جھک کر رہا گئی۔



وہ کچن میں اپنی دھیل چیز پر بیٹھی تھی۔ گود میں ٹوکری تھی، جس میں مژر رکھتے تھے۔ تیمور بلقیس کے ساتھ مرکز تک گیا تھا۔ وہ مژر چھیلتے ہوئے لاشعوری طور پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

کچن کا دروازہ شیم دا تھا۔ وہ دیسے بھی اس سمت میں بیٹھی تھی کہ لاڈنخ سے نظر نہ آ سکتی تھی۔ تب ہی اسے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ قدموں کی چاپ بھی۔ پھر قریب آتی آوازیں..... مژر چھیلتے اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔

”ایسا کب تک چلے گا ہمایوں؟“ وہ آرزو تھی اور شک کر کرہ رہی تھی۔

”کیا؟“

”انجمن مت بنو..... ہم کب شادی کر رہے ہیں؟“
ان کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ وہ دم سادھے بیٹھی رہ گئی۔ مژر کے دانے ہاتھ سے پھسل گئے۔

”کر لیں گے۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“

”کیا مطلب، جلدی؟.... اتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں، اسے طلاق دیجے ہوئے۔“

”اس کی عدت ختم ہو لینے دو۔“

”اور کب ختم ہو گی وہ؟“

”ایک دو ہفتے رہتے ہیں۔“ وہ رسان سے کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں دہیں لا دنخ کے وسط میں کھڑے با تیں کر رہے تھے۔

”کیا اس کی عدت کے ختم ہونے سے پہلے ہم شادی نہیں کر سکتے؟“

”نہیں۔“ اس کا انداز اتنا سردہر اور قطعی تھا کہ پہلی بھر کو آواز بھی چپ رہ گئی۔

”مگر ہمایوں.....!“ اس نے کہنا چاہا۔

”کہانا نہیں۔“ وہ اب سختی سے بولا تھا۔ ”اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو بے شک شادی نہ کرنا۔ جاؤ، چلی جاؤ۔“ وہ تیزی سے یڑھیاں چڑھتا گیا۔

”نہیں، ہمایوں..... سنو..... رکو!“ وہ بوکھلائی ہوئی سی اس کے پیچھے پکی۔

یڑھیاں چڑھنے کی آوازیں مدھم ہو گئیں۔ وہ دونوں اب اس سے دور جا چکے تھے۔

”ماما.....!“ کتنی ہی دری بعد تیمور نے اسے پکارا تو اس نے چوک کر سراٹھایا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”تم کب آئے؟“ وہ سنبھلی۔

”ماما!“ وہ آہستہ سے اس کے قریب آیا۔ ”آپ رو رہی ہیں؟“ اس نے اپنے تنے نخے ہاتھ اس کے چہرے پر گرتے آنسوؤں پر رکھے۔ وہ جیران رہ گئی۔ چوتھے نہیں، کب یہ آنسو پھسل پڑے تھے۔

”آپ نہ رویا کریں۔“ وہ اب آہستہ سے اس کے آنسو صاف کر رہا تھا۔ محل بھیگی آنکھوں سے مکرائی اور اس کے ہاتھ تھام لئے۔

”میں تو نہیں رو رہی۔“

”آپ رو رہی ہیں۔ میں بچہ تھوڑی ہوں؟“ وہ اس کی غلط بیانی پر خفا ہوا۔

”اچھا، اب تو نہیں رو رہی؟ اور شاپ سے کیا لائے ہو؟“

”چیس۔“ اس نے چیس کا پیکٹ سامنے کیا۔

”اور میں اتنی دیر سے گیا ہوا ہوں پر آپ نے ابھی تک مژنہیں چھیلے۔ تو آرٹو سلو، ماما!“ اس نے مژر کی ٹوکری اس کی گود سے اٹھائی اور کاؤنٹر پر رکھ دی۔ ”آئیں باہر چلتے ہیں۔“

”رہنے دو! تیمور! میرا دل نہیں کر رہا۔“

”بلقیس بوا!“ اس کی سنبھال بیرون بلقیس کو پکارنے لگا۔ ”ماما کو باہر لے آؤ۔“ اور وہ اپنی ناقدری کا غم اندر رہی اندر دباتی رہ گئی۔



بڑے عرصے سے لا بھری ی کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کتنے ہفتوں سے سورج رہی تھی کہ کسی دن کروالے، آج ہمت کر رہی تھی۔

بلقیس کو تو کہنے کی دیر تھی، فوراً لگ گئی۔ وہ دروازے کی چوکھت پر وہیں چیڑ پتیشی ہدایات دے رہی تھی۔

”یہ والی بکس اندر رکھ دو، اس طرف والی سامنے کر دو۔ میز سے یہ سب ہٹا لو اور اس والے شیلیف میں رکھ دو۔“

چھاڑ پونچھ سے گرداؤ رہی تھی۔ سالوں سے کسی نے کتابوں کو صاف نہیں کیا تھا۔

”لبی لبی! ان کو تو کیڑا لگ گیا ہے۔“ وہ پریشان سی کچھ کتابوں کے کنارے دکھار رہی تھی۔ تاریخ کی پرانی کتابیں۔

”ان کو لگ کر دو۔ اور وہ دراز خالی کر دو۔ یہ اس میں رکھ دیں گے۔“

”اچھا جی!“ بلقیس اب اسٹری نیمیل کی درازوں سے کتابیں نکال رہی تھی۔

”ان کو اس آخری شیلیف پر نہ سیٹ کر دوں؟“ اس نے دراز سے نکلنے والی کتابوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں کر دو۔“ اسے بھلا کیا اعتراض تھا۔ بلقیس پھر تی اور انہاک سے کتابیں صاف کر کے اوپر لگانے لگی۔

ڈھیر ذرا ہمکا ہوا تو اسے ان کتابوں کے بیچ ایک بخولا ہوا خاکی لفافہ رکھا نظر آیا۔

”یہ لفافہ اٹھا کر دو۔ شاید ہمایوں کے کام کا ہو۔“

کتابیں سیٹ کرتی بلقیس رکی اور خاکی لفافہ اٹھا کر اسے تھمایا۔

لفافہ وزنی نہیں تھا، مگر بخولا ہوا تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کوئی نام پڑنے نہیں لکھا تھا اور پر اکھڑی ہوئی سی ٹیپ گئی تھی، جیسے کھول کر پھر لگادی گئی ہو۔

”پڑتے نہیں کس کا ہے۔“ پنا کسی تجسس کے محمل نے ٹیپ اٹھا کر لفافہ گود میں الٹ دیا۔ ایک عدالتی کاغذ اور ساتھ ایک سفید خط کا کور گود میں گرا۔

اس نے زرد عدالتی کاغذ اٹھایا، اس کی جہیں کھولیں اور چہرے کے سامنے کیا۔

اسام پ پیپر کی تحریر کے نیچے بہت واضح سے وستخت تھے۔

”محمل ایراہیم۔“

”فرشته ایراہیم۔“

وہ بڑی طرح سے چوکی اور تیزی سے اوپر تحریر پہنگا ہیں دوڑا گئیں۔

یہ وہی کاغذ تھا جو فواد نے اس سے اور فرشتے سے سائیں کروایا تھا۔ ویم سے نکاح نہ کروانے کی شرط پر، اس کی گردن پہ پستول رکھ کر۔

مگر یہ ادھر ہمایوں کی لا ابھری یہی میں کیا کر رہا تھا؟ وہ تو اس معاملے سے قطعی لعلم تھا۔ یہ موضوع بھی زیر بحث آیا ہی نہیں۔ بس ایک دفعہ آغا جان کے گھر سے واپسی پر ہمایوں نے اسے اپنا حصہ لینے کے لئے کہا تھا، مگر وہ ٹال گئی تھی۔ اگر وہ براہ راست پوچھتا تو وہ بتا دیتی۔ پھر فرشتے نے بھی نہیں بتایا کہ یہ کاغذ اس کے ہاتھ کیسے لگا؟ اور کیا وہ اسی کی وجہ سے اس سے بدلن تھا؟ مگر یہ اتنی بڑی وجہ تو نہیں تھی۔ اور یہ کاغذ ہمایوں کے ہاتھ لگا بھی کیسے؟ یہ تو فواد کے پاس تھا۔

اس نے دوسرا سفید لفافہ اٹھایا۔ وہ بے دردی سے چاک کیا گیا تھا۔ اس نے اس کے کھلے منہ میں جھانکا۔ اندر پکھ فوٹو گراف تھے شاید۔

محمیل نے لفافہ گود میں الٹ دیا۔ چند تصویریں اس کے گھنٹے پر سے پھسلتی فرش پر جا گریں۔ اس نے ہاتھ جھکا کر تصویروں کو اٹھایا اور پھر سیدھا کیا۔
وہ فواد اور محمل کی تصاویر تھیں۔ فواد..... اور محمل

وہ ساکت سی ان تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں وہ پکھ تھا، جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا فواد اور اس کے کندھے پر سر رکھے محمل ریسٹورنٹ میں ڈریز گرتے فواد اور محمل ایک ساتھ کسی شادی کی تقریب میں رقص کرتے قابل اعتراض تصاویر قابل اعتراض مناظر۔ وہ سب جو کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس نے پھر سے تصویروں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

اس کا لباس اور چہرہ ہر تصویر میں ذرا اگ بھی بتا سکتا تھا کہ وہ فوٹو شاپ یا اس قسم کی کسی ورک کا کمال ہے۔ پہلی نظر میں واقعی پتہ نہیں لگتا تھا، مگر بغور دیکھنے پر صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ سب نقطی ہے۔ ہمایوں خود ایک پولیس آفیسر تھا، وہ ان بچوں والی باتوں میں نہیں آ سکتا تھا۔ اور کس نے لا کر دیں اس کو یہ تصاویر؟
کیا معیر جو ایک دفعہ آیا تھا، اسی لئے آیا تھا؟، اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

پُل کے سارے ٹکڑے ایک ساتھ جڑنے لگے۔

آرزو نے کہا تھا کہ وہ ہمایوں کو اس سے چھین لے گی۔ محمل کو سجا سنوارا اور ہستابتا دیکھ کر وہ شاید شدید حسد کی آگ میں جلنے لگی تھی۔ اس سے اس کی خوشیاں برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ پھر اسے پچھا کی تا گہائی وفات کے بعد یقیناً وہ لوگ مالی کرنسر کا شکار ہوئے ہوں گے۔ ایسے میں محمل کی طویل بے ہوشی نے آرزو کو امید دلائی ہو گی۔ اور شاید یہ سب ایک سوچا سمجھا پلان تھا۔

یہ جعلی تصاویر بنا کر محمل اور فرشتے کا دخنخشدہ کاغذ ہمایوں کو دکھا کر اس نے ہمایوں

کو بھڑکایا ہو گا۔ مگر کیا ہمایوں چھوٹا بچہ تھا جو ان کی باتوں میں آ جاتا؟ کیا ایک مجھا ہوا پولیس آفیسر ان قسم کے بچکانہ کھیل کا شکار بن سکتا تھا؟ کیا بس اتنی سی باتوں پر ہمایوں اتنا بدظن ہو گیا تھا؟ اپنی بیوی سے دوری اور آرزو سے بڑھتا ہوا التفات..... پُزل کا کوئی تکڑا اپنی جگہ سے غائب تھا۔ پوری تصویر نہیں بن رہی تھی۔

اس نے بے اختیار ہو کر سر دنوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔

”لبی! اُسی نجیک ہو؟“ بلقیس نے اس کا شانہ ہلاکا تو وہ چونکی۔

”ہاں، مجھے باہر لے جاؤ۔“ اس نے جلدی سے تصویر میں لفافے میں ڈالیں، مبادا بلقیس انہیں دیکھنے لے۔

پُزل کا کوئی تکڑا اوقتی غائب تھا۔



شام کے سائے گھرے ہو رہے تھے، جب بیرونی گیٹ پر ہارن کی آواز سنائی دی۔ وہ جو دانستہ لا دُنج میں بیٹھی تھی، فوراً الرٹ ہو گئی۔

ہمایوں کی گاڑی کی زن سے اندر داخل ہونے کی آواز..... پھر لاک کی کھٹ کھٹ، وہ سر جھکائے بیٹھی تمام آوازیں سنتی گئی، یہاں تک کہ دروازے کے اس طرف بھاری یوٹوں کی چاپ قریب آ گئی۔ اس نے بے چینی سے سراٹھا یا۔

وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ یونیفارم میں ملبوس، کیپ ہاتھ میں لئے، وہ چند قدم چل کر قریب آیا۔ اسے وہاں بیٹھنے دیکھ کر لمحے بھر کو رکا۔

”السلام علیکم! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”بولو۔“ وہ اکھڑے تیوروں سے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”آپ بیٹھ جائیں۔“

”میں نجیک ہوں۔ بولو۔“

محمٰل نے گھری سانس لی اور الفاظ ذہن میں مجتمع کئے۔

”مجھے صرف ایک بات کا جواب چاہئے ہمایوں! بس ایک بار مجھے بتا دیں گے کہ آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنسنے لگا

تھا۔

”کیا کر رہا ہوں؟“

”آپ کو لگتا ہے، آپ سچھ نہیں کر رہے؟“

”علیحدگی چاہتا ہوں، یہ کیا کوئی جرم ہے؟“ وہ سمجھیدہ اور بے نیاز تھا۔

”مگر.... آپ اتنے کیوں بدلتے گئے ہیں؟ آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شکوہ کر دیجی۔

”پہلے میں کاٹھ کا آٹو تھا، جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ ہوش اب آیا ہے، دیر ہو گئی، مگر خیر!“

”ہو سکتا ہے، کسی نے اب آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہو۔ آپ مجھے صفائی کا ایک موقع تو دیں۔“

اس نے سوچا تھا، وہ اس کی منت نہیں کرے گی، مگر اب وہ کر رہی تھی۔ یہ وہ شخص تھا، جس سے اسے بے حد محبت تھی۔ وہ اسے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

”صفائی کا موقع ان کو دیا جاتا ہے، جن پر شک ہو۔ مگر جن پر یقین ہو، ان پر صرف حد جاری ہوتی ہے۔“ وہ بہت چبا چبا کر بولتا تھا۔

”یہ آپ کی اپنی بنائی گئی حدود ہیں ایس لپی صاحب! لوگوں کو ان کے اوپر نہ پرکھیں۔ کھوئے کھرے کو الگ کرنے کا پیمانہ دل میں ہوتا ہے، ہاتھوں میں نہیں۔ کہیں آپ کو پچھتا ناہے پڑ جائے۔“

”کھوئے کھرے کی پہچان مجھے بہت دیر سے ہوئی ہے محمل بی بی! جلدی ہوتی تو اتنا نقصان نہ اٹھاتا۔“

ان تین ماہ میں پہلی وفعہ اس نے محمل کا نام لیا تھا۔ وہ اداسی سے مسکرا دی۔

”اگر میں کھوئی ہوں تو جس کے پیچے مجھے چھوڑ رہے ہیں، اس کے کھرے پن کو بھی ماپ لے جائے گا۔ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے۔“

”وہ تم سے بہتر ہے۔“ چند لمحے خاموش رہ کر وہ سرد لبجے میں بولا اور ایک گبری چھپتی ہوئی نگاہ اس پر ڈال کر میر جیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ نہ آنکھوں سے اسے زینے چڑھتے دیکھتی رہی۔
آج ہمایوں نے اپنی بے وفائی پر مہر لگا دی تھی۔



وہ ذرینگ ٹیبل کے سامنے برش لئے مغموم، گم صمی بیٹھی تھی، جب فرشتے نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

”میری چھوٹی بہن کیا کر رہی ہے؟“ اس نے چوہٹ سے ٹیک لگا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ محمل نے مسکرا کر گردن موڑی۔ اس کے کھلے بال شانوں پر گرے تھے۔

”تو کچھ خاص کرتے ہیں۔“ وہ اندر چلی آئی۔ فیر دزی شلوار قمیض پہلیقے سے سر پر دوپٹہ لئے وہ ہمیشہ کی طرح بہت تروتازہ لگ رہی تھی۔

”تمہارے بال ہی بنا دوں۔ لا وَا!“ اس نے رسان سے کہتے ہوئے برش محمل کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے کھلے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹا۔

”بس اب تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ وہ اب پیار سے اس کے بالوں میں اوپر سے نیچے برش کر رہی تھی۔ وہ محمل کی وہیل چیز کے پیچھے کھڑی تھی، محمل کو آئینے میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

”تم نے آگے کا کیا سوچا؟“

”پتہ نہیں، جب عدت ختم ہو جائے گی تو چلی جاؤں گی۔“ وہ بے زار ہوئی۔

”لیکن کدھر؟“ فرشتے نے اس کے بالوں کو سلجمحا کر، سمیٹ کر اونچا کیا۔

”اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے، پہلے آغا جان کو ڈھونڈوں گی۔ اگر وہ نہ ملے تو مسجد چلی جاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ مجھے ہاٹل میں رہنے دیا جائے گا۔“

”ہوں...“ اس نے اونچی کی پوٹی باندھی، پھر ان بالوں کو دوبارہ سے ذرا سا برش کیا۔

”اور آپ نے کیا سوچا؟..... میرے بعد تو آپ کو بھی جانا ہو گا۔“

”میں شاید ورنگ ویکن ہاٹل چلی جاؤں۔ پتہ نہیں، انھی کچھ ڈیسائیز نہیں کیا۔ خیر، چھوڑو۔ آج میں نے چائیز بنا لیا ہے۔ تمہیں منورین پسند ہے نا؟ اب فنا فٹ چلو، کھانا کھاتے ہیں۔“ اس نے محمل کی دھیل چیر چیچے سے قام کر اس کا رخ موڑا۔ اب وہ کیا بتاتی کہ عرصہ ہوا، ذاتی محسوس کرنا چھوڑ دیئے ہیں۔ مگر ایسی مایوسی کی باتیں اللہ کو ناراض کر دیتی ہیں، اسی لئے چپ رہی۔ ہمایوں کی طرف سے دل اتنا دکھا ہوا تھا کہ ایسے میں فرشتے کا وصیان بٹانا اچھا لگا۔

ڈائیگ نیبل پپ کھانا لگا ہوا تھا۔ گرم گرم چاولوں کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔

”تیمور کدھر؟“ وہ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔ پھر تھک کر بولی۔ ”میں کیا کروں، جو وہ آپ کو ناپسند کرنا چھوڑ دے؟“

”یہ چاول کھاؤ۔ بہت اچھے بنے ہیں۔“ فرشتے نے مسکرا کر ڈش اس کے سامنے رکھی، اس کا ضبط بھی کمال کا تھا۔

”تیمور کی ساری بد لحاظیوں پپ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

”اوہ ہوں، جانے دو۔ میں مانگنے نہیں کرتی۔ خالہ بھی ماں جیسی ہی ہوتی ہے۔“

محمل بھیگی آنکھوں سے ہولے سے نہس دی۔

فرشتے نے رک کر اسے دیکھا۔ ”کیوں؟..... کیا نہیں ہوتی؟“

”میرے بھائی نہیں ہیں، ورنہ ضرور اپنی رائے دیتی۔ لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہی فرمایا ہے تو آف کورس، ٹھیک ہے۔“

”کیا؟“ فرشتے اُبھی۔

”یہی کہ خالہ، ماں جیسی ہوتی ہے۔ یہ ایک حدیث ہے نا۔“

”اوہ، اچھا!..... مجھے بھول گیا تھا۔“ فرشتے سر جھٹک کر مسکرا دی اور چاول اپنی پلیٹ میں نکالنے لگی۔

کی عدت کو تین قمری ماہ مکمل ہو جانے تھے اور تب وہ شرعی طور پر ہمایوں کی بیوی نہ رہتی اور پھر اس گھر میں رہنے کا جواز بھی ختم ہو جاتا۔ اس کی میڈیکل کنڈیشن کے تحت اس کی عدت اتنی ہی بنتی تھی۔

آج وہ صبح اترتے ہی لان میں آئی تھی۔ چڑیاں اپنی مخصوص بولی میں کچھ گنگنا رہی تھیں۔ گھاس شنماں سے گلی تھی۔ امید تھی کہ آج رات بارش ضرور ہو گی۔ شاید اس کی اس گھر میں آخری بارش۔

فرشتے صبح جلد ہی کسی کام سے باہر گئی تھی۔ ہمایوں رات دیر سے گھر آیا تھا اور صبح سوریے نکل گیا تھا۔ تیمور اندر سورہ رہا تھا۔ اور بلقیس اپنے کوارٹر میں تھی۔ سودہ لان میں تنہا اور مغموم پیشی چڑیوں کے اداس گیت سن رہی تھی۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کی کانچ سی بھوری آنکھوں سے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

اس گھر کے ساتھ اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ زندگی کا ایک بے حد حسین اور پھر ایک بے حد تلخ دور اس نے گھر میں گزارا تھا۔ یہاں اسی ڈرائیورے پر وہ چہلی دفعہ سیاہ ساڑھی میں اتری تھی، اس رات جب اس کی مشکلات کا آغاز ہوا تھا۔ پھر اوہرہی وہ سرخ کام دار جوڑے میں ڈلن بنایا گئی تھی، بھی وہ اوہرہ ملکہ کی حیثیت سے بھی رہی تھی، مگر خوشی کے دن جلدی گزر جاتے ہیں، اس کے بھی گزر گئے تھے۔ ایک سیاہ، تاریک نیند کا سفر تھا اور وہ بہت شیچے لا کر پھینک دی گئی تھی۔

”ماما!“ تیمور نیند بھری آنکھیں لئے اس کا شانہ جھنجوڑ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا، پھر مسکرا دی۔

”ہاں بیٹا!“ اس نے بے اختیار پیار سے اس کا گال چھوڑا۔

”کیوں رو رہی ہیں اتنی دیر سے؟ کب سے دیکھ رہا ہوں؟“ وہ معصومیت بھری فکر مندی لئے اس کے ساتھ آبیٹھا۔ وہ نائٹ سوت میں ملبوس تھا۔ غالباً بھی جا گا تھا۔ ”نہیں..... کچھ نہیں۔“ محمل نے جلدی سے آنکھیں رگڑیں۔

”آپ بہت رو تی ہیں ماما! ہر وقت رو تی ہی رہتی ہیں۔“ وہ خفا تھا۔

”مجھے لگتا ہے، آپ دنیا کے سارے لوگوں سے زیادہ رو تی ہوں گی۔“

”نہیں تو اور تمہیں پتہ ہے کہ دنیا کے سارے لوگوں سے زیادہ آنسو کس انسان نے بھائے تھے؟“

”کس نے؟“ وہ حیرت بھرے اشتیاق سے اس کے قریب ہوا۔

”ہمارے باپ آدم علیہ السلام نے، جب ان سے اس درخت کو چھونے کی غلطی ہوئی تھی۔“ وہ زمی سے اس کے بھورے بالوں کو سہلا تی بتا رہی تھی، اسے تیمور کو اپنی وجہ سے پریشان نہیں کرنا تھا، اس کا ذہن بٹانے میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔

”اچھا!.....“ وہ حیران ہوا۔ ”اور ان کے بعد؟“

”ان کے بعد داؤد علیہ السلام نے، جب ان سے ایک نیصلے میں ذرا سی کی رہ گئی تھی۔“

”اور ان کے بعد؟“

”ان کے بعد؟“ اس نے گھری سانس لی۔ ”پتہ نہیں بیٹا! یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔“

”آپ بھی بہت روتنی ہیں ماما! مگر آپ کو پتہ ہے، آپ جیسی مدرسی کی نہیں ہیں۔

”میرے کسی فرینڈ کی بھی نہیں، کوئی ٹھپر بھی نہیں۔“

”میرے جیسی کیسی؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”آپ جیسی Noble اور Honourable۔ آپ کو پتہ ہے، آپ میرے لئے پوری دنیا میں سب سے زیادہ آزر بیبل اور نوبل ہیں۔“

”جگہ میں ایسی نہیں ہوں۔ تمہیں پتہ ہے، دنیا میں سب سے زیادہ noble کون تھے؟“

محمیل نے ایک گھری سانس لی۔

”یوسف علیہ السلام، جو پیغمبر کے بیٹے، پیغمبر کے پوتے اور پیغمبر کے پڑپوتے تھے۔“

”وہ کیوں ماما؟“

”وہ کیوں....؟“ اس نے زیر لب اس کا سوال دہرا�ا۔ بے اختیار آنکھوں میں آداسی چھا گئی۔ ”کیونکہ شاید وہ بہت صبر کرنے والے تھے اور....“ الفاظ لبوں پر ٹوٹ

گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ ہر بات سمجھانے والی نہیں ہوتی۔

”بتابیں نا ماما!“ وہ بے چین ہوا۔ ”میں جب بھی آپ سے حضرت یوسف کی اسشوری سنتا ہوں، آپ یوں ہی اُداس ہو جاتی ہیں۔“

”پھر کبھی بتاؤں گی۔ تمہارا اسکول کب کھل رہا ہے؟“ اس نے بات پڑھ دی۔
”من ڈے کو۔“

”اور تمہارا ہوم ورک ڈن ہے؟“

”یہ باقی چھوڑیں، مجھے پتہ ہے، آپ اپ سیٹ ہیں۔ کل آپ اور ڈیڈی ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائیں گے، ہے نا؟“ وہ ہتھیلوں پر چہرہ گرانے، اُداسی نے بولا۔

”ہاں! ہو تو جائیں گے، تم میرے ساتھ چلو گے یا ڈیڈی کے پاس رہو گے؟“ اس نے خود کو بے پروا نظاہر کرنا چاہا۔

”میں آپ کے ساتھ جاؤں گا، اس چڑیل کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ مجھے پتہ ہے، ڈیڈی فور اشادی کر لیں گے۔“ اسے شاید آرزو بہت بری لگتی تھی۔ وہ محمل کو اس پر ترجیح دے رہا تھا۔ اسے یاد آیا، ہمایوں نے کہا تھا، وہ اس سے بہتر ہے۔

”وہ مجھ سے بہتر ہے تیمور!“ وہ ہمایوں کی اس زہریلی بات کو یاد کر کے پھر سے دکھی ہو گئی۔

”کون؟“ تیمور کی سفید لیلی بھاگتی ہوئی اس کے قدموں میں آبیٹھی تھی۔ وہ جھک کر اسے اٹھانے لگا۔

”آرزو.....“ بہت دفعہ سوچا تھا کہ نیچے سے یہ معاملہ ڈسکس نہیں کرے گی، مگر وہ نہیں سکی۔

”آرزو آئی؟“ تیمور، لیلی کو بازوؤں میں اٹھا کر سیدھا ہوا۔ ”وہ، جو آپ کی کزان ہیں، جو ادھر آتی ہیں؟“

”ہاں، وہ ہی۔“

”وہ آپ سے اچھی تو نہیں ہیں۔ نہیں..... بالکل نہیں۔“ وہ سوچ کرنے میں سر پلاسے لگا۔

”پھر تمہارے ڈیڈی کیوں اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟ کیا تم اسے ماں کے روپ میں قبول کر سکو گے؟“ لکھا خود کو سمجھایا تھا کہ نیچے کو درمیان میں انوالوں میں کرے گی، مگر ہمایوں کی اس روز کی بات ابھی تک کہیں اندر چھڑ رہی تھی، لیکن پھر کہہ کر خود ہی پچھلتائی۔

”چھوڑو، جانے دو۔ یہ میں ادھر دکھاؤ۔“

مگر تیمور الجھا الجھا سے دیکھ رہا تھا۔ میں ابھی تک اس کے بازوؤں میں تھی۔ ”ڈیڈی، آرزو آنٹی سے شادی کر رہے ہیں؟“ اس کی آواز میں بے پناہ حیرت تھی۔ ”تمہیں نہیں پتہ؟“

”آپ کو یہ کس نے کہا ہے؟“ وہ کنفیوز ڈیڈی تھا اور حیرت زدہ بھی۔

”تمہارے ڈیڈی نے بتایا تھا اور ابھی تم خود کہہ رہے تھے کہ وہ اس سے شادی کر لیں گے۔“

تیمور اسی طرح ابھی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ موٹی ملی اس کے نہیں نہیں باتھوں سے پھسلنے کو بے تاب کس ساری تھی۔

”آرزو آنٹی سے؟.... نہیں ماما! ڈیڈی تو ان سے شادی نہیں کر رہے۔“

”مگر تم نے.....“ لیکن تیمور کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

”وہ تو فرشتے سے شادی کر رہے ہیں۔ آپ کونہیں پتہ؟“

اسے لگا، کسی نے ڈھیر دل پھرا اس کے اوپر لاڑکا دیئے ہوں۔

”تیمور.....!“ وہ درشتی سے چلائی تھی۔ ”تم ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟“ ملی سہم کرتیور کے بازوؤں سے نیچے گودی۔

”آپ کونہیں پتہ، ماما؟“ وہ اس سے بھی زیادہ حیران تھا۔

”تم نے ایسی بات کی بھی کیسے؟..... مائی گاڑ، وہ میری بہن ہے۔ تم نے اتنی غلط بات کیوں کی اس کے بارے میں؟“ غصہ اس کے اندر سے ابلال تھا۔ وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ تیمور ایسا کہہ سکتا ہے۔

”ماما! آپ بے شک ڈیڈی سے پوچھ لیں، فرشتے سے پوچھ لیں۔ وہ دونوں شادی

کر رہے ہیں۔“

”شش اپ..... جست شش اپ!..... تم اس لڑکی کے بارے میں اسکی بات کر رہے ہو، جو میری بہن ہے؟“

”جی ماما! اسی لئے تو ڈیڈی نے آپ کو ڈائیورس دی ہے، بلی کا زشی از یور سٹر، اور مسلم ایک نائم پر دوسرے سے شادی نہیں کر سکتے۔“
محمل کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ شل سی بیٹھی رہ گئی۔

”آئی تھاث، آپ کو پتہ ہے، میں نے آپ کو کہا تو تھا کہ ڈیڈی اس چڑیل سے شادی کر رہے ہیں۔“

اور تیمور، فرشتے کو بھی چڑیل کہتا تھا، وہ کیوں بھول گئی؟ اس کا دماغ بری طرح چکرانے لگا تھا۔

”نہیں تیمور! وہ میری بہن ہے۔“ اس کی زبان لڑکھڑائی۔

”وہ اسی لئے تو ادھر ہمارے ساتھ رہتی ہے، تاکہ جب آپ چلی جائیں تو ڈیڈی سے شادی کر لے۔“

”مگر تیمور! وہ میری بہن ہے۔“ اس کی آواز ٹوٹنے لگی تھی۔

”آپ نے نہیں دیکھا، جب وہ ڈیڈی کے ساتھ شام کو باہر جاتی ہیں؟ ایک دفعہ وہ مجھے بھی لے گئے تھے، وہ سمجھتے ہیں میں پچھہ ہوں، مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔“

”مگر تیمور! وہ تو میری بہن ہے۔“ وہ بکھری، لکست خورده سی، کھٹی کھٹی آواز میں جلاںی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، کوئی دھیرے دھیرے اس کی جان نکال رہا ہے۔ تیمور کیا کہہ رہا تھا، اس کی کچھ سمجھے میں نہیں آرہا تھا۔

”مجھے اسی لئے وہ اچھی نہیں لگتی، ویچ نبردون، اس کی وجہ سے ڈیڈی آپ کو سمجھ بیٹھ کر رہے ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا، جب وہ شام کو ڈیڈی کے ساتھ باہر رہنے کو جانتے ہے؟“

”نہیں، تم ظلط کہہ رہے ہو۔ شام کو تو وہ مسجد جاتی ہے۔ وہ ادھر پڑھاتی ہے۔“

اس سے یاد آیا، شام کو فرشتے مسجد جاتی تھی۔ یقیناً تیمور کو مغلدا نہیں ہوئی ہوگی، اس نے

غلط سمجھا ہو گا۔

”مسجد؟“ اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ”یہ ساتھ دالی مسجد؟..... ماں! آپ کدھر رہتی ہیں؟ فرشتے تو کبھی مسجد نہیں گئی۔“

”وہ..... وہ ادھر قرآن پڑھاتی ہے، تمہیں نہیں پڑھ تیمور! وہ.....“

”وہ تو کبھی قرآن نہیں پڑھتی، میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔“

”نہیں! وہ مجھ سے اور تم سے زیادہ قرآن پڑھتی ہے۔ اس نے..... اس نے ہی تو مجھے قرآن سکھایا تھا۔ تم غلط کہہ رہے ہو، وہ ایسے نہیں کر سکتی۔“ وہ لفظ میں سر ہلاتے اسے جھٹکا رہی تھی۔

”آپ نے کبھی اس کو قرآن پڑھتے دیکھا؟ مسجد جاتے دیکھا؟“

”وہ..... وہ فرشتے کے دفاع میں، تیمور کو جھٹلانے کے لئے کچھ کہنے لگی تھی، ایک دم رک گئی۔

اس نے ہسپتال سے آ کر کبھی فرشتے کو مسجد جاتے نہیں دیکھا تھا، کبھی قرآن پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں، نمازیں وہ ساری پڑھتی تھیں۔

”کم آن ماں! آپ بلقیس بوا سے پوچھ لیں، وہ مسجد نہیں جاتی، کیا آپ کو اس نے خود کہا ہے کہ وہ مسجد جاتی ہے؟“ اور تیمور کے سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

”ہسپتال کی وجہ سے صبح کی کلاسز لینا ممکن نہیں تھا۔“ فرشتے نے تو اس کے استفسار پر نہیں سا جواب دیا تھا۔ باقی سب اس نے خود فرض کر لیا تھا۔

”تو کیا تیمور کج کہہ رہا تھا؟..... نہیں، ہرگز نہیں۔ فرشتے اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو اس کی بہت پیاری، بہت خیال رکھنے والی بہن تھی، وہ بھلا کیسے؟“

”وہ مسجد نہیں جاتی۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ جاتی ہے۔ پہلے ڈیڈی گاڑی پر نکلتے ہیں، پھر وہ باہر نکلتی ہے اور کالونی کے اینڈ پر ڈیڈی اس کو پک کر لیتے ہیں، تاکہ بلقیس بوا کو پڑھ نہ پڑے۔ میں نے ٹیرس سے بہت دفعہ دیکھا ہے، صبح بھی وہ ڈیڈی کے ساتھ ہی گئی تھی۔“ وہ پتھری نہیں رہی تھی۔

”جب آپ ہسپتال میں تھیں، تب بھی وہ یوں ہی کرتے تھے۔ پر میں کوئی چھوٹا بے

لی تو نہیں ہوں، مجھے سب سمجھ آتا ہے۔“

”یہ سب کب ہوا؟..... کیسے ہوا؟“ وہ تحریر بے یقین سی سکتے کے عالم میں پیشی تھی۔ تیمور آگے بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا، مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ تمام آوازیں بندھ ہو گئیں۔ سب چہرے مٹ گئے تھے۔ ہر طرف اندر ہیرا تھا، سناٹا تھا۔

”ما! آپ تمیک کہتی ہو؟“ تیمور نے پریشانی سے اس کا ہاتھ ہلاایا۔ وہ ذرا سا چوکی۔ آنکھوں کے آگے جیسے ڈھنڈی چھارہ ہی تھی۔

”مجھے..... مجھے اکیلا چھوڑ دو بیٹا!“ اس نے بے اختیار چکراتا ہوا سر دنوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ ”ابھی..... ابھی جاؤ یہاں سے پلیز۔“
چند لمحے وہ اداسی سے اسے دیکھا رہا، پھر جھک کر گھاس پر پیشی موٹی سفید ملی اٹھائی اور داپس پلٹ گیا۔

”کیا یہ ہی واحد وجہ ہے؟“

”کیا تمہیں بالکل امید نہیں ہے کہ وہ رجوع کرے گا؟“

”کیا تم خود کو اتنا اسٹرائگ فیل کرتی ہو کہ حالات کا مقابلہ کر لوگی؟“
اس کے ذہن میں فرشتے کی باتیں گونج رہی تھیں۔

ہر شام ہمایوں مگر سے چلا جاتا، کسی دوست کے پاس۔ ہر شام فرشتے بھی مگر سے چلی جاتی۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کہہ جاتی ہے؟ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ محمل کی عدت ختم ہونے کے بعد کہہ جائے گی؟ اور وہ ابھی تک ادھر کیوں رہ رہی تھی؟ کیا صرف محمل کی کیتر کے لئے؟ وہ کیتر تو کوئی نہ بھی کر سکتی تھی۔ پھر وہ کیوں ان کے مگر میں تھی؟

اس نے کبھی فرشتے کو قرآن پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ جس روز وہ مسجد گئی تھی، فرشتے ادھر نہیں تھی۔ وہ شام تک وہیں رہی، مگر وہ ادھر نہیں آئی۔ وہ غلط فہمی کا شکار رہی اور فرشتے نے اس کی غلط فہمی نہیں دور کی۔

اور آرزو؟..... اس کا کیا قصر تھا؟ وہ گواہ تھی کہ ہمایوں اس سے شادی کر رہا تھا۔
اس نے خود آرزو سے سہی کہا تھا مگر جب محمل نے پوچھا تھا، جب اس نے کیا کہا تھا، یہ

بنا ضروری نہیں ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ وہ آرزو سے شادی کر رہا ہے۔ فرشتے نے کبھی اس کے اور آرزو کے غیر واضح تعلق پر فکر مندی نہیں ظاہر کی۔ وہ سب کسی سوچی بھی پالیسی کا حصہ تھا، وہ دونوں جانتے تھے اور ایک اسی کو بے خبر رکھا تھا۔ وہ تم سے بہتر ہے۔ یہ ہی کہا تھا ہمایوں نے اور وہ یقیناً فرشتے کی بات کر رہا تھا۔

لیکن وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ وہ اس کے گھر میں خیانت کیسے کر سکتی ہے؟ وہ تو قرآن کی طالب تھی، وہ تو سچی تھی، وہ تو امانت دار تھی۔ پھر وہ کیوں بدل گئی؟ وہ جو نجوم کی امانت کا خیال رکھتی تھی، رشتہوں میں خیانت کیسے کر گئی؟

سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ آج اسے لگا تھا کہ سب دھوکے باز نکلے تھے، سب خود غرض نکلے تھے۔ ہر شخص اپنی زمین کی طرف جھکا تھا۔ اس کا کوئی نہیں تھا، کوئی بھی نہیں۔ وہ کتنی ہی دریہ ہاتھوں میں سر گرانے پڑی رہی۔

بہت سے لمحے سر کے، تو اسے یاد آیا کہ جہاں سب بدل گئے تھے، وہاں کوئی نہیں بھی بدلتا تھا۔ جہاں سب نے دھوکا دیا، وہاں کسی نے اس کا خیال بھی رکھا تھا۔ جہاں سب ساتھ چھوڑ گئے، وہاں کسی نے سہارا بھی دیا تھا۔

”اوہ.....!“ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا اور پھر دھیرے سے وہیل چیز کے پھیوں کو اندر کی جانب موڑا۔

اس کے کمرے میں شیلف کے اوپر اس کا سفید جلد والا مصحف قرآن رکھا تھا۔ اس نے سرعت سے اسے اٹھایا۔ اس وقت اسے اس کی بے حد ضرورت تھی۔

مصحف کے نیچے اس کا پرانا رجسٹر رکھا تھا۔ اس نے قرآن اٹھایا تو رجسٹر پھسل کر نیچے جا گرا۔ محمل نے ایک ہاتھ میں قرآن پڑے، جک کر رجسٹر اٹھایا۔ وہ درمیان سے کھل گیا تھا۔ اسے بند کر کے واپس رکھتے ہوئے وہ نہ سمجھ سکی۔ کھلے صفحے پر سورہ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر لکھی تھی جس پر وہ ہمیشہ ابھتی تھی۔ حکمة اور حنطة۔ یہ صفحہ بہت دفعہ کھولنے کے باعث اب رجسٹر کھولتے ہی کھل جاتا تھا۔

کھلا ہوا رجسٹر اس کے دائیں ہاتھ میں تھا، اور قرآن بائیں میں۔ دونوں اس کے بالکل سامنے تھے۔ رجسٹر کی سطر حنطة کا مطلب ہوتا ہے گند۔ کے آگے صفحہ ختم تھا۔ وہ

بے اختیار اس سطر کو قرآن کے سفید کور کے تریب لائی، جہاں مٹا مٹا سا ”م“ لکھا تھا۔
اس نے گند اور م کو ملا�ا۔ دونوں کے درمیان ایک، ایک نخا سان قسطہ تھا۔ اس نے
 نقطوں کو جوڑا، ادھور الفاظ مکمل ہو گیا۔

”گندم۔“

اسے یاد آیا، وہ غلطی سے قرآن پر رجسٹر کر کر لکھ رہی تھی۔ صفحہ ختم ہوا تو لا شوری طور پر اس نے لفظ قرآن کے کور پر مکمل کر دیا۔ اسی وقت اسے کلاس انچارج سے ڈانٹ پڑی تو یہ بات ذہن سے محو ہو گئی۔ وہ بھی جان ہی نہ پائی کہ یہ مٹا مٹا سا ”م“ اس ادھورے لفظ کی تکمیل تھا۔

آج برسوں بعد وہ قصہ مکمل ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک روشنی کا کوندا سالپکا تھا اور ساری گتھیاں سلچھ گئی تھیں۔

بنی اسرائیل کو شہر کے دروازے میں داخل ہونے سے قبل بخشش مانگنے کا حکم ملا تھا۔
مگر وہ گندم مانگتے رہے، بخشش نہیں مانگی۔ یہ بنی اسرائیل کی ریت تھی اور یہی ریت خود اس نے بھی دھرائی تھی۔

ہم زمانہ جاہلیت سے دور اسلام میں آ کر ایک ہی دفعہ توبہ کرتے ہیں، ساری عمر پھر عمل صالح تو کرتے رہتے ہیں، مگر بار بار کی توبہ بھول جاتے ہیں، ہم ایک کھائی سے نج کر سمجھتے ہیں کہ زندگی میں پھر بھی کھائی نہیں آئے گی۔ اور اگر آئی بھی تو ہم نج نکل جائیں گے۔ ہم ہمیشہ نعمتوں کو اپنی نیکیوں کا انعام سمجھتے ہیں اور مصیبتوں کو گناہوں کی سزا۔ اس دنیا میں جزا بہت کم ملتی ہے اور اس میں بھی امتحان ہوتا ہے۔ نعمت شکر کا امتحان ہوتی ہے اور مصیبہ صبر کا اور زندگی کے کسی نئے امتحان میں داخل ہوتے ہی نہ سے پہلا کلہ حطة کا نکنا چاہئے۔ مگر ہم وہاں بھی گندم مانگنے لگتے ہیں۔

اللہ اسے زندگی کے ایک مختلف فیز میں لایا تو اسے بخشش مانگنی چاہئے تھی۔ مگر وہ ”ہایوں“ اور ”تیمور“ کو مانگنے لگ گئی۔ حنطة حنطة کہنے لگ گئی۔ گندم مانگنا بر انہیں تھا، مگر پہلے بخشش مانگنی تھی۔ وہ پہلا زینہ چڑھے بغیر درسے کو پھلانگنا چاہ رہی تھی ایسے پار کب لگا جاتا ہے؟ اسے نہیں معلوم وہ کتنی دری تک میز پر رکھے زار و قطار روئی رہی۔

آج اسے اپنے سارے گناہ پھر سے یاد آ رہے تھے۔ آج وہ پھر سے توبہ کر رہی تھی۔ وہ تو بہ جو بار بار کرنا ہم ”نیک“ بننے کے بعد بھول جاتے ہیں۔

زندگی میں بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں، جب آپ سے خود قرآن نہیں پڑھا جاتا۔ اس وقت آپ کسی اور سے قرآن سننا چاہتے ہیں۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ کوئی آپ کے سامنے کتاب اللہ پڑھتا جائے اور آپ روئے جائیں۔ بعض دفعہ آپ خوش ہونے کے لئے اس کے پاس جاتے ہیں اور بعض دفعہ رونے کے لئے۔

اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ خوب روئے۔ قرآن سنتی جائے اور روئی جائے۔ تلاوت کی کیشوں کا ذبہ قریب ہی رکھا تھا۔ شیپ ریکارڈر بھی ساتھ تھا۔ اس نے بنا دیکھے آخر سے ایک کیسٹ نکالی اور بنا دیکھے ہی ڈال دی۔ ابھی نہ وہ معانی جانتا چاہتی تھی، نہ ہی فہم پگور و فکر کرنا چاہتی تھی۔ ابھی وہ صرف سننا چاہتی تھی، صرف روٹنا چاہتی تھی۔

اس نے پلے کا بٹن دبایا اور سر میز پر رکھ دیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر میز کے شیشے پر گر رہے تھے۔ قاری صہیب احمد کی آواز پر سوز آواز دھیرے سے کمرے میں گونجنے لگی۔

”والضحلی“ (قسم ہے دن کی)

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اسے اپنی زندگی کے روشن دن یاد آ رہے تھے، جب وہ اس گھر کی ملکہ تھی۔

”اور قسم ہے رات کی، جب وہ چھا جائے۔“

اس کو وہ سنائے بھری رات یاد آئی، جب ہمایوں نے اسے طلاق دی تھی، وہ رات جب وہ تمیں پیشی چھت کو دیکھتی رہی تھی۔

”تمہارے رب نے تمہیں اکیلانہیں چھوڑا اور نہ ہی وہ ناراض ہے۔“

(والضحلی-3)

اس کے آنسو روائی سے گرنے لگے تھے۔ یہ کون تھا جو اس کی ہر سوچ پڑھ لیتا تھا؟
یہ کون تھا؟

”یقیناً تمہارے لئے انجام آغاز سے بہتر ہو گا۔“ (والضحلی-4)

اس نے بختی سے آنکھیں بیچ لیں۔ کیا واقعی اب بھی اس سارے کا انجام اچھا ہو سکتا تھا؟

”تمہارا رب بہت جلد تمہیں وہ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔“
(والصلحی-5)

ذر اچونک کر بہت آہستہ سے محمل نے سراخھایا۔

اللہ کو اس کی اتنی فکر تھی کہ وہ اس کے اداس دل کو تسلی دینے کے لئے یہ سب اسے بتا رہا تھا؟ کیا وہ واقعی اس سے ناراض نہیں تھا؟ کیا واقعی اس نے اسے چھوڑا نہیں تھا؟

”کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر شہکانہ نہیں دیا؟“ (والصلحی-6)

وہ اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔ یہ..... یہ سب..... اتنا واضح، اتنا صاف، یہ سب اس کے لئے اتراتھا؟ کیا وہ اس قابل تھی؟

”کیا اس نے تمہیں راہ گم پا کر ہدایت نہیں دی؟“ (والصلحی-7)

وہ ساکتی سی نے جاری تھی۔ ہاں، یہ ہی تو ہوا تھا۔

”اور تمہیں نادار پا کر غنی نہیں کر دیا؟“ (والصلحی-8)

اس کے آنسو گرنارک گئے تھے۔ کیکپاتے لب ٹھبر گئے تھے۔

”پس تم بھی یتیم پر بختی نہ کرنا اور سائل کو مت ڈاشنا۔ اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتے رہنا۔“ (والصلحی-9)

سورۃ الصلحی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی زندگی کی ساری کہانی گیارہ آیتوں میں سمیٹ کر اسے سنا دی گئی تھی۔ وہ سورۃ جیسے ابھی ابھی آسمانوں سے اُتری تھی، اس کے لئے..... صرف اس کے لئے۔

اس نے تحک کر رکری کی پشت پر گرا دیا اور آنکھیں سومند لیں۔ وہ کچھ دریہ ہر سوچ سے بے نیاز ہونا چاہتی تھی۔

پھر انٹھ کر اسے فرشتے سے ملا تھا۔



بادل زور سے گر جے تھے۔

محمل نے ایک نظر کھڑکی سے باہر پھیلتی شام پر ڈالی اور دوسری بند دروازے پر۔ اس کی دوسری طرف اسے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ ابھی چند منٹ قبل اس نے فرشتے کو گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے آنے کے پچھے دنوں بعد ہمایوں کی گاڑی اندر داخل ہوئی تھی۔ البتہ وہ بمشکل ایک منٹ بعد ہی کچھ کاغذات اٹھا کر واپس چلا گیا تھا۔ اس کی گاڑی ابھی ابھی نکلی تھی۔

وہ کھڑکی کے اس طرف چوکیدار کو گیٹ بند کرتے دیکھ رہی تھی، جب دروازہ ہولے سے بجا۔

”محمل!“ فرشتے نے اپنے مخصوص زم انداز میں پکارا، پھر ہولے سے دروازہ کھولا۔ اب وہ کھڑت سے سلام نہیں کرتی تھی۔ محمل نے گردن موڑ کر دیکھا۔

وہ دروازے کے تپوں نج کھڑی تھی۔ دراز قد، کانچ سی سنہری آنکھوں والی لڑکی، جو کھلتے گلابی رنگ کے لباس میں، سر پر دو پسہ لئے کھڑی تھی۔ وہ کون تھی، اسے لگا وہ اسے نہیں جانتی۔

”کیسی ہو؟“ زم سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ اندر داخل ہوئی۔

”بلقیس بتا رہی تھی، تم میرا پوچھ رہی تھیں۔“ وہ آگے بڑھ کر عادتاً شیلف پر پڑی کتابیں، رجسٹر اور شیپ وغیرہ سلیقے سے جوڑنے لگی۔ اس کے بھورے بال کھلنے شروع اور اس نے انہی پوچھنے لے رکھا تھا، ایسے کہ چند لشیں باہر گر رہی تھیں۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

”جی، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ کو دیکھ رہے ہیں۔“ محمل نے بغور اس کو دیکھا، جو اس کے

سامنے سر جھکائے کتابیں سیٹ کر رہی تھی۔

اسے ابھی بھی تیمور کی بات پر مکمل یقین نہ تھا۔ فرشتے ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ بھی بھی نہیں۔ یقیناً تیمور کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔

”میں ایک دوست کے ساتھ تھی، کچھ شانگ کرنا تھی۔“ بے حد رسان سے بتا کر اس نے رجڑا ایک دوسرے کے اوپر رکھے۔

نہ اس نے جھوٹ بولانے سچ بتایا۔ اس کا یقین ڈال گانے لگا۔

”آپ نے آگے کا کیا سوچا ہے فرشتے؟ میرے جانے کے بعد آپ کیا کریں گی؟“

”ابھی پلان کروں گی۔ دیکھو، کیا ہوتا ہے۔“ وہ اب گلداں میں رکھے گلدستے سے سوکھے پھول احتیاط سے نکال رہی تھی۔ اس کے جواب بہم تھے..... نہ سچ، نہ جھوٹ۔

”اور تم سارا دن کیا کرتی رہیں؟“ اس نے چمراۓ سوکھے پھول ڈست بن میں ڈالے۔

”کچھ خاص نہیں۔“

دونوں خاموش ہو گئیں، اپنی اپنی سوچوں میں گم۔

اب اس کے پاس حقیقت جاننے کا ایک ہی طریقہ تھا اور اس نے اسے استعمال کرنے کا ارادہ کیا۔

”فرشتے! وہ جسم کس کی کرسی پر ڈالا گیا تھا؟“

”کون سا جسم؟“ فرشتے نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پلنے سے اس کا دوپٹہ سر کرنے سے بھورے بال جھلکنے لگے۔

”قرآن میں ایک جگہ ایک جسم کا ذکر ہے، جو کسی کی کرسی پر ڈالا گیا تھا۔ آپ کو یاد ہے، وہ کس کا جسم تھا؟“ اس کا انداز یوں تھا، جیسے وہ بھول گئی ہو۔

فرشتے نے الجھ کر چند لمحے سوچا، پھر نئی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں، مجھے نہیں یاد آ رہا۔“

اور محمل کو سارے جواب مل گئے تھے۔ فرشتے قرآن بھول گئی تھی۔ اگر وہ اسے پڑھتی رہتی تو اسے یاد رہتا، لیکن وہ اسے پڑھنا چھوڑ چکی تھی اور قرآن تو چند دن کے لئے

بھی چھوڑ دیا جائے تو وہ فوراً ذہنوں سے مکمل طور پر محو ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب اللہ کی سنت تھی اور بھی یہ تبدیل نہیں ہوگی۔ اس نے گہری سائنس لی۔

”وہ سلیمان علیہ السلام کی کرسی تھی، جس پر ایک جسم ڈال دیا گیا تھا۔“

”اوہ، اچھا۔“ فرشتے نے میز پر گرے پانی کے قطرے ٹشو سے صاف کئے۔

”کیوں کیا آپ نے ایسا، فرشتے؟“ وہ بہت دکھ سے بولی تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ چوہے بلی کے کھیل بند کر دے۔

”کیا؟“ فرشتے نے سراہا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر صرف استفسار تھا۔

”وہ جو اس گھر میں ہوتا رہا، میں وہ سب جانتا چاہتی ہوں۔“

”متلا؟“ اس نے ابر و اٹھائی۔ اس کے چہرے پر وہی نرم ساختا تھا۔

”سب کچھ!“

”سب کچھ؟..... کس بارے میں؟ میری اور ہمایوں کی شادی کے بارے میں؟“ اس کے انداز میں ندامت تھی، نہ پکڑے جانے کا خوف۔ وہ بہت آرام سے پوچھ رہی تھی۔

”سب کچھ!“ اس نے آہستہ سے دہرایا۔

”جب ہمایوں کراچی سے آیا تو اس نے مجھے پر دپوز کیا۔ وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا، مگر طلاق سے قبل وہ مجھ سے شادی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سو ہم نے ڈیسا یہ کیا کہ جب تم ہوش میں آ جاؤ تو وہ تمہیں ڈائیورس دے دے گا اور ہم شادی کر لیں گے۔“

وہ جیسے موسم کی کوئی خبر سنارہی تھی۔

”وہ کہتا تھا کہ علماء سے فتوی لے لیتے ہیں، مگر میرا دل نہیں مانا، میں نے سوچا کہ کچھ وقت اور انتظار کر لیتے ہیں۔ اور پھر تم ہوش میں آ گئیں۔ سو اس نے ڈائیورس چیپرز سائنس کر دیے۔ مجھے پر دپوز کرنے سے قبل ہی وہ تمہیں ڈائیورس دینے کا فیصلہ کر چکا تھا، اگر یہ ضرورت نہ ہوتا، وہ تب بھی ایسے ہی کرتا، کیونکہ وہ یہ شادی رکھنے کو راضی نہیں تھا۔“

وہ بہت اطمینان اور سکون سے میز سے نیک لگائے کھڑی اس کے بارے میں ان کے سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔

”میں نے اس کا پروپوزل اس لئے قبول کر لیا کیونکہ طلاق کے بعد اس کو بھی کسی نہ کسی سے شادی کرنی تھی اور مجھے بھی۔ اور چونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے اور سمجھتے تھے، سو اس کا پروپوزل میرے لئے بہترین چوائی تھا۔ میں اس کو تمہارے ساتھ تعلق کو قائم رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی، نہ ہی وہ کسی کی ماننا۔ سو شرعی لحاظ سے میرے پاس پروپوزل قبول کرنے کا حق تھا، سو وہ میں نے استعمال کیا۔“

اس کے پاس دلائل تھے، توجیہات تھیں، شہوں اور وزنی شرعی شہارے تھے۔ محمل خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنتی رہی۔ وہ ذرا دری کو چپ ہوئی تو اس نے لب کھولے۔

”اور جب ہمایوں نے آپ سے میرے اور فواد کے تعلق اور نوعیت اور ان تصاویر کے بارے میں پوچھا تھا، تب آپ نے کیا کہا تھا؟“ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔

”وہی، جو سچ تھا۔“ وہ اب بھی پُر سکون تھی۔ ”اس کو معیز نے کچھ تصوریں اور وہ ایگری منٹ لا کر دکھایا تھا، جو ہم نے فواد سے طے کیا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ تم نے اس کے بارے میں ہمایوں کو بتا دیا ہو گا، میں نے اس کے غصے کے ڈر سے خود نہیں بتایا تھا۔ مگر تم نے بھی نہیں بتایا تو اس کا غصہ کرنا لازمی تھا۔ اس نے مجھے بلایا، پھر وہ مجھ پر چینا، چلایا۔ میں چپ کر کے سنتی رہی، اس نے پوچھا کہ یہ ایگری منٹ سچا ہے یا جھوٹا؟ میں نے سچ بولا۔ وہ غصے سے چلا تارہا۔ اسے دکھا کر ہم دونوں نے اس پر ٹرست نہیں کیا۔ پھر اس نے وہ تصوریں مجھے دکھائیں اور پوچھا کہ وہ سچ ہیں یا جھوٹ؟ میں نے سچ ہی بولا۔“

”کیا بولا؟“ محمل نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”یہی کہ مجھے معلوم نہیں اور مجھے واقعی معلوم نہیں تھا۔“

اور وہ اسے دیکھتی رہ گئی، یہ فرشتے کا سچ تھا؟

”پھر اس نے پوچھا کہ معیز جو باتیں اسے بتا گیا ہے، وہ سچ ہیں یا جھوٹ؟ وہ اسے یہ بتا کر گیا تھا کہ تمہارا اور فواد کا فیفر تھا۔ اس رات فواد نے تمہیں پروپوز کرنا تھا، کوئی رنگ بھی دی تھی غالباً۔ اور پھر اس نے بہانے سے ہمایوں کے گھر بھیج دیا۔ اس رنگ کا ذکر فواد کی اس فون کال میں بھی تھا جو ہمایوں نے شیپ کی تھی۔ یہ بات اس نے پہلے انکور کر دی تھی، پھر ظاہر ہے معیز نے یاد دلا یا تو وہ الجھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سچ بولا۔“

اب کی بار وہ خاموش رہی۔ اس نے نہیں پوچھا کہ فرشتے کا سچ کیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ کیا کہنے جا رہی ہے۔

”میں نے اسے بتا دیا کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی، نہ ہی تم نے کبھی مجھے اس معاملے میں رازدار بنا لیا ہے۔ اس نے اس رات کے متعلق پوچھاتو میں نے سچ سچ بتا دیا کہ فواد تمہیں پروپوز کرنے کے بہانے سے ہی ذرا پہلے کر جا رہا تھا۔ تم نے مجھے بھی بتایا تھا، سو میں نے یہی اس کو بتا دیا۔“

وہ چپ چاپ یک نک سامنے کھڑی مطمئن سی لاکی کو دیکھتی رہی۔ جس کے چہرے پہ ملاں تک نہ تھا۔ وہ اس کا ایک راز تک نہیں سن جاں سکی تھی۔

وہ سچ کیسے ہو سکتا ہے، جس میں کسی امانت کا خون شامل ہو؟ وہ تو اسے جانتی تھی، وہ اس کی بین تھی۔ کیا وہ اس کی پرده پوشی نہیں کر سکتی تھی؟ فواد نے کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ اسے پروپوز کرنے جا رہا ہے۔ یہ سب تو اس نے خود اخذ کیا تھا۔ اس سے ایک شلطی ہوئی تھی۔ وہ سمجھی تھی کہ وقت کی دھول نے اس شلطی کو دبادیا ہو گا، مگر لاکیوں کی کچی عمر کی نادانیاں اتنی آسانی سے کہاں دہتی ہیں۔

”اس شیپ میں کسی رنگ کا بھی ذکر تھا۔ ہمایوں نے اسے بار بار سنا۔ وہ مجھ پر غصہ ہوتا رہا کہ میں نے اسے بے خبر کیوں رکھا۔ پھر اس نے اپنا ٹرانسفر کر اچی کروالیا۔“

وہ اب کھڑکی سے باہر لان کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”وہاں کراچی میں اسے آرزو ملی۔ اس کے قادر کی ڈستھن کے بعد کریم چھا اور غفران چھپانے اس کا حصہ بھی دبایا تھا، سو اس نے سوچا کہ ایک تیر سے دوشکار کرتے ہیں۔

اس نے فواد سے تمہارا اور میرا سائیں کردہ کاغذ لیا اور معیز کے ہاتھوں ہمایوں کو بھجوایا۔ فواد، آرزو کو پسند کرنے لگا تھا، وہ اب اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، وہ اسے اپنانے کے لئے ترپ رہا تھا۔ مگر آرزو کو ہمایوں بہتر لگا، سواس نے چاہا کہ ہمایوں تمہارا حصہ قانونی طور پر آغا کریم سے واپس لے، اس کا حصہ لینے میں بھی مدد کرے تاکہ جب وہ ہمایوں سے شادی کرے تو تمہارے حصے پر بھی وہ قابض ہو سکے، جو ہمایوں کی ملکیت میں ہو گا۔ اور نیچرلی، تمہارے بارے میں وہ پُر یقین تھی کہ تم بھی نہیں اٹھو گی۔“
بادل ایک دفعہ پھر زور سے گر جے۔ ذور کہیں بھلی چکی۔ شام کی نیلا ہٹ سارے میں بھر رہی تھی۔

وہ ابھی تک خاموشی سے فرشتے کوسن رہی تھی۔

”مگر ہمایوں کو فواد سے ضد ہو گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ فواد، آرزو کو پسند کرتا ہے، اس نے آرزو کو اپنے قریب آنے دیا۔ فواد، ہمایوں کی منتیں کرتا رہا کہ وہ آرزو کو چھوڑ دے، مگر ہمایوں اس سے اپنے سارے بد لے چکانا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ فواد نے اس کی محبت کو اس سے چھیننا ہے، وہ بھی اس کی محبت کو دیسے ہی چھینے گا۔ وہ آرزو سے بھی بھی شادی نہیں کر رہا تھا، مگر اس نے آرزو کو دھوکے میں رکھا۔ ابھی مجھے ڈر اپ کر کے وہ آرزو کے پاس ہی گیا ہے، اس کو یہ بتانے کہ جیسے وہ اس کو استعمال کر رہی تھی، وہ بھی دیسے ہی اسے استعمال کر رہا تھا۔ وہ شدت پسند لڑکی ہے، جانے غصے میں کیا کر ڈالے۔ مگر جو بھی ہو، وہ آج اسے آئینہ دکھا کر ہی واپس آئے گا۔“

کھڑکی کے بندشٹے پر کسی اڑتی چڑیا نے زور کی چونخ ماری، پھر چکرا کر چھپے کو گری۔ بادل دتفے دتفے سے گرج رہے تھے۔

”شاید تم یہ سمجھو کہ میں نے تمہارے ساتھ برا کیا ہے۔ یا یہ کہ مجھے ایسے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن تم یہ سوچو کہ میں پھر اور کیا کرتی؟ میں ہمایوں سے بہت محبت کرتی تھی اور کرتی ہوں۔ مگر جب مجھے لگا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو چاہیتے ہو تو میں درمیان سے نکل گئی، لیکن اب وہ تمہیں نہیں چاہتا اور مجھے بھی کسی نہ کسی سے شادی تو کرنی تھی۔ مجھے بتاؤ، میں نے کیا غلط کیا؟ میرے دین نے مجھے پروپوزل سلیکٹ کرنے کا اختیار دیا تھا،

سو میں نے اسے استعمال کیا۔ تم کسی بھی مفتی سے پوچھ لو، اگر کوئی عورت، شوہر کی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ رہی ہو تو شوہر دوسری شادی کر سکتا ہے، اور اس میں کسی کی حق تلفی کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ ہی قطع رحمی کا عصر شامل ہے۔ یاد کرو، سورہ نساء میں ہم نے کیا پڑھا تھا، کہ اگر کوئی ایک حقوق ادا نہ کر سکے تو پھر اپنے حقوق چھوڑ دے، الگ ہو جائے کہ اللہ دونوں کے لئے وسعت پیدا کر دے گا۔“

اپنے مطلب کی آیات اسے آج بھی یاد تھیں۔

”آئی ہو پ کہ اب تمہاری کلیفوڑن اور اعتراضات دور ہو گئے ہوں گے۔ میں نے سات سال تمہاری خدمت کی، حالانکہ یہ میرا فرض نہیں تھا، مگر اس لئے کہ تم کبھی یہ نہ سمجھو کر میں تم سے پیار نہیں کرتی۔ میں آج بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ تم نے ایک دفعہ مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر تم میرے لئے اپنا حق چھوڑ دو گی، فواد نے تمہاری گردن پر پستول رکھا تھا، تمہیں بچانے کے لئے میں نے اپنا حق چھوڑا تھا۔ یہ باقی میں نے آج کے دن کے لئے سنجال رکھی تھیں، تاکہ آج میں تم سے تمہارے وعدے کی وفا مانگ سکوں۔“

وہ خاموش ہو گئی، اب وہ محمل کے بولنے کی منتظر تھی۔

محمل چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے لب کھولے۔

”آپ نے کہہ لیا، جو آپ نے کہتا تھا؟“

”ہاں۔“

”کیا اب آپ میری سفیں گی؟“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”ہاں۔“

”تو پھر سنئے۔ اعوذ بالله من الشیطون الرجيم۔“ اس نے تعود پڑھا تو فرشتے نے ذرا ابلجھ کر اسے دیکھا۔ مگر وہ رکی نہیں تھی، بہت دھیسے مگر مضبوط لبجھے میں وہ عربی میں اسے کچھ سنا نے لگی تھی۔ وہ عربی جوان دونوں کی سمجھے میں آتی تھی۔

”اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں، شاید کہ وہ پلٹ آئیں.....“

شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔“

فرشتوں کی آنکھوں میں الجھا سا ناٹرا ابھرا۔ محمل پنا پلک جھکے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پڑھتی جا رہی تھی۔

”ان لوگوں کو اس شخص کی خبر پڑھ کر سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات دی تھیں۔ جس کو ہم نے اپنی ”آیات“ دی تھیں۔ پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو اس کے پیچھے شیطان لگ گیا، تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔“

فرشتوں کی بھوری آنکھوں میں بے چینی ابھری تھی۔ ”محمل! میری بات سنو۔“ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ پتلوں کو حرکت دیئے پنا نگاہیں اس پر مرکوز کئے کہتی جا رہی تھی۔

”تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔“ اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ”اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان ہی آیات کے ساتھ بلندی عطا کرتے، لیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا۔“ ”محمل! چپ کرو۔“ وہ زیر لب بڑھائی تھی، مگر محمل کی آواز اوپری ہو رہی تھی۔ ”لیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا اور اس نے اپنی خواہشات کی پیرودی کی۔“ اس کی مثال کئے جیسی ہے۔ تو اس کی مثال کئے جیسی ہے۔ اگر تم اس پر حملہ کرو تو وہ زبان باہر نکالتا ہے، یا تم اس کو چھوڑ دو، تو بھی وہ زبان باہر نکالتا ہے۔“

”خاموش ہو جاؤ!..... خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔“ اس نے ترپ کر محمل کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ اس کا دو پسہ کندھوں سے پھسل گیا تھا، کھلے بال شانوں پر آگئے تھے۔

محمل نے سختی سے اس کا ہاتھ جھکا۔ اسی میکائی انداز میں اسے دیکھتی پڑھتی جا رہی تھی۔

”جسے اللہ ہدایت نہیں، پس وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے، بس وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔“

اس کے ہاتھ بے دم ہو کر اپنی گود میں آگئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی، گھننوں کے بل اس کے قدموں میں گری تھی۔

”بے شک ہم نے جہنم کے لئے بہت سے جنوں میں سے اور بہت سے انسانوں

میں سے پیدا کئے ہیں، ان کے لئے دل ہیں۔ وہ ان سے کچھ نہیں بھی سمجھتے اور ان کے لئے آنکھیں ہیں، وہ ان سے کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ اور ان کے لئے کان ہیں۔ وہ ان سے کچھ بھی نہیں سنتے۔ میں لوگ مویشیوں کی طرح ہیں، بلکہ یہ تو زیادہ بھسلکے ہوئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں، جو غافل ہیں۔ جو غافل ہیں، جو غافل ہیں۔ ” وہ کسی معمول کی طرح بار بار وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

فرشتے سفید چہرہ لئے، بے دم سی بیٹھی تھی۔ اس کے لب ہولے ہولے کپکار ہے تھے۔ محمل نے آہستہ سے پلک جھکی تو دو آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گرے۔

” اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں، شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔ ” اس نے دھیل چیز کے پہلوں کو دونوں اطراف سے تھاما اور اس کا رخ کھڑکی کی طرف موڑا۔ وہ آہستہ آہستہ دھیل چیز کو کھڑکی کی طرف بڑھانے لگی تھی۔

فرشتے پیچے بیٹھی رہ گئی تھی۔ محمل نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔ وہ ابھی پٹنا نہیں چاہتی تھی۔

” اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں، شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔ ” وہ کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے زیر لب بڑھائی تھی۔

فرشتے سے مزید کچھ سنا نہیں گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور منہ پہ ہاتھ رکھے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

محمل اسی طرح نم آنکھوں سے باہر چمکتی بجلی کو دیکھتی رہی۔

◎◎◎

وہ تب بھی کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی، جب ہمایوں کی گاڑی اندر آئی۔ اور تب بھی، جب رات ہر سو چھا گئی۔ اس کی اس گھر میں آخری رات..... اور وہ اسے سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ تب اس نے بلقیس کو بلوایا، جس نے اسے بستر پہ لئئے میں مدد دی۔ پھر وہ آنکھوں پہ باز درکے، کب گھری نیند میں چلی گئی، اسے پتہ ہی نہ چلا۔

اس کے ذہن میں اندر میرا تھا، گھپ اندر میرا جب اس نے وہ آواز سنی۔ تاریکی کو چیرتی، مدھری آواز..... اپنی جانب کھینچتی آواز۔

محمد نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں ناٹ بلب جل رہا تھا۔ کھڑکی کے آگے پردے ہے تھے۔ وہ رات کے وقت ششیے کے پٹ کھول رکھتی تھی، تاکہ جانی سے ہوا اندر آئے۔ وہیں باہر سے کوئی آواز آ رہی تھی۔

اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مارا اور بُشن دبایا۔ ٹیبل یہ پورا جل اٹھا۔ روشنی سامنے دیوار گیر کھڑی پر پڑی۔ رات کا ایک نج رہا تھا۔ وہ مدھم سی، دکھ بھری آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ اس نے رک کر سنتا چاہا۔ لفظ کچھ کچھ سنائی دینے لگے تھے۔

”اللَّهُمَّ جَعْلْ فِي قَلْبِي نُورًا“

(اے اللہ! میرے دل میں نورِ ذال دے)

محمد نے بے اختیار سائیڈ ٹیبل پر کھی ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

”وَ فِي بَصَرِي نُورًا“

(اور میری بصیرت میں نور ہو)

بلقیس تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ محمد کی وجہ سے وہ کچن میں ہی سوتی تھی۔ ”جی بی بی جی؟“

”مجھے بٹھا دو، بلقیس؟“ اس نے بھرا آئی ہوئی آواز میں ڈیبل چیز کی طرف اشارہ کیا۔ بلقیس سر ہلا کر آگے بڑھی، تب ہی کھڑکی کے اس پار سے آواز آئی۔

”وَ فِي سَمْعِي نُورًا“

(اور میری سمعت میں نور ہو)

بلقیس چونک کر کھڑکی کو دیکھنے لگی، پھر سر جھٹک کر اس کی طرف آئی۔

”وَ عَنْ يَمِينِي نُورًا وَ عَنْ يَسَارِي نُورًا“

(اور میرے دائیں جانب اور بائیں جانب نور ہو)

بہت احتیاط سے بلقیس نے اسے ڈیبل چیز پر بٹھا دیا۔

”اب تم جاؤ۔“ اس نے اشارہ کیا۔ بلقیس سر ہلاتی، متذبذب سی واپس پڑی۔

”وَ فَوْقِي نُورًا وَ تَحْتِي نُورًا“

(اور میرے اوپر اور نیچے نور ہو)

مدھم چاندنی کی روشنی میں ڈوبی آواز ہر شے پر چھاری تھی۔ محمل نے وہیل چیز کا رخ باہر کی جانب موڑا۔

”وَامَامِي نُورٌ وَ خَلْفِي نُورٌ“

(اور میرے آگے پیچھے نور ہو)

آواز میں اب آنسو گرنے لگے تھے۔

وہ وہیل چیز کو بھسلک گھستی پاہر لائی۔

”وَاجْعَلْ لِي نُورًا“

(اور میرے لئے نور بنا دے)

چاندنی میں ڈوبابر آمدہ سنسان پڑا تھا۔ وہ متزمم، غم زدہ آواز لان سے آرہی تھی۔

”وَفِي لِسَانِي نُورٌ وَ عَصْبِي نُورٌ“

(اور میری زبان اور اعصاب میں نور ہو)

اس نے سوز میں پڑھتے ذرا سی ہیکلی لی۔

محمل آہستہ آہستہ برآمدے کی آرام وہ ڈھلان سے نیچے وہیل چیز کو اٹھانے لگی۔

یہ ڈھلان فرشتے نے ہی اس کے لئے لگوائی تھی۔

”وَلَحْمِي نُورٌ وَ دَمِي نُورٌ“

(اور میرے گوشت اور لہو میں نور ہو)

لان کے آخری سرے پر دیوار سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا سر ڈھال ساد دیوار سے ٹکا تھا، آنکھیں بند تھیں جن سے قطرہ قطرہ آنسو ٹوٹ کر رخسار پر گر رہے تھے۔ لمبے بھورے بال شانوں پر پڑے تھے۔

”وَشَعْرِي نُورٌ وَ بَشْرِي نُورٌ“

(اور میرے بال و کھال میں نور ہو)

محمل وہیل چیز کو گھاس پر آگے بڑھانے لگی۔ گھاس کے تنکے پھیوں کے نیچے چڑھانے لگے تھے۔

”وَاجْعَلْ لِي نَفْسِي نُورًا وَ أَعْظَمْ لِي نُورًا“

(اور میرے نفس میں نور ہوا اور میرے لئے نور کو بڑھا دے)
وہ اسی طرح آنسو بہاتی، بند آنکھوں سے، بے خبری پڑھتی جا رہی تھی۔
محمل و سیل جیسا اس کے بالکل سامنے لے آئی۔

”اللّٰهُمَّ اعْطِنِي نُورًا“

(اے اللہ! مجھے نور عطا کرو!)

چاندنی میں اس کے آنسو موتیوں کی طرح چک رہے تھے۔
”فرشتے!“ اس نے ہولے سے پکارا۔

فرشتے کی آنکھوں میں جنبش ہوئی۔ اس نے پلکیں جدا کیں اور محمل کو دیکھا۔ وہ شاید بہت روئی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم، سرخ تھیں۔

”کیوں رو رہی ہیں؟“ اس کے اپنے آنسو گرنے لگے تھے۔ یہ وہ لڑکی تھی، جس نے اسے قرآن سنایا تھا، قرآن پڑھایا تھا۔ اس کی جان ان لوگوں سے چھڑائی تھی۔ سات سال اس کی خدمت کی تھی۔ بہت احسان تھے اس کے محمل پ۔ اور آج اس نے اسے زلا دیا!

”مجھے روٹا ہی تو چاہئے۔“ وہ سر آٹھا کر چاند کو دیکھنے لگی۔ ”میں نے بہت زیادتی کی ہے محمل!..... بہت زیادتی۔“

وہ خاموشی سے اس کو سننے لگی۔ شاید ابھی فرشتے نے بہت کچھ کہتا تھا، وہ سب جو وہ پہلے نہیں کہہ سکی۔

”میں نے سات سال توجیہات جوڑیں، دلیلیں اکٹھی کیں، اور تم نے سات آیتوں میں انہیں ریت کا ذہیر بنادیا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا تھا، بہت یقین دلایا تھا کہ یہی صحیح ہے۔ مگر آج میرا یقین ثوث گیا ہے محمل! میں خود غرض ہو گئی تھی، کتنے کی طرح خود غرض، جو بڑی نہ ڈالنے پر بھی زبان نکالتا ہے۔“

اس کی اوپر چاند کو سکتی آنکھوں سے قطرے گر رہے تھے۔

”بکھری تم نے میری چاندی کی وہ انکوٹھی دیکھی ہے محمل؟ تم نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ مجھے کس نے دی تھی؟..... جانتی ہو، یہ مجھے میری خالہ نے دی تھی۔ وہ انہوں نے اپنی بہو

کے لئے رکھی تھی، اور اپنی وفات سے قبل وہ بہت بیمار تھیں۔ انہوں نے وہ مجھے پہنادی۔ میری امی ان کا مطلب بھجتی تھیں، مگر خاموش رہیں۔ وہ وقت آنے پر ہمایوں سے بات کرنا چاہتی تھیں، مگر وقت نہیں آیا۔ آہی نہیں سکا۔ امی فوت ہوئیں تو میں چپ چاپ مسجد چلی گئی۔ میں برسوں انتظار کرتی رہی کہ ہمایوں بھی تو اس انگوٹھی کے بارے میں پوچھے گا، مگر اس نے نہیں پوچھا۔ پھر میں نے صبر کر لیا، مگر انتظار تو مجھے تھا۔ میں نے بچپن سے اپنے نام کے ساتھ اسی کا نام سنایا، مجھے اس پر اپنا ہی حق لگتا تھا۔ اور جب ایک روز ہمایوں نے مجھے کہا کہ مجھے شادی کے بارے میں سوچنا چاہئے، تو میں نے اس کو خالہ کی خواہش کے بارے میں بتانے کا سوچا۔

اس رات میں بہت دیر تک مسجد کی چھت پر بیٹھی رہی تھی، اور جب میں فیصلہ نہ کر پائی تو دعائے نور پڑھنے لگی۔ تمہیں پتہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کا ایک حصہ بجدے میں پڑھا کرتے تھے۔ اور یہ دعا قرآن مجھے میں مدد و دیتی ہے۔ میں جب بھی فیصلہ نہ کر پاتی، اس دعا کو پڑھتی۔ اس رات بھی میں پڑھ کر ہٹی ہی تھی کہ تم ہماری چھت پر آئیں، اور پھر تم ہماری زندگی میں بھی آگئیں۔

میں نے آج تک تمہارے لئے جو بھی کیا ہے، وہ اللہ کے لئے کیا تھا۔ مجھے یاد بھی نہیں کہ میں نے کیا کیا تھا۔ پھر جب میں نے ہمایوں کو تمہارے لئے مسکراتے دیکھا اور اس کے لئے تمہاری آنکھوں کو چمکتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ تمہیں آگاہ کر دوں، اور تمہیں یاد ہے، جب ہسپتال میں تم ہمایوں کو دیکھنے آئی تھیں، تو میں تمہیں بتانے ہی والی تھی۔ مگر تم نے نہیں سن۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں گی۔ قربانی دے دوں گی۔ تب میرا جینا اور میرا مرنا اور میری نماز اور میری قربانی صرف اللہ کے لئے تھی۔ میں نے ہر چیز بہت خلوصِ دل سے کی۔ خود تمہاری شادی کروائی اور اپنے تیس میں مطمئن تھی، لیکن۔

جب تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا اور میں پاکستان واپس آئی تو مجھے پہلی دفعہ لگا کہ شاید تم زندہ نہ رہ سکو، اور ہمایوں میرا نصیب۔ اور اس سے آگے سوچنے سے بھی میں ڈرنے لگی تھی۔ سو واپس چلی گئی۔ مگر ہمایوں جب بھی کال کرتا اور تمہاری ماں کیں کن حالت کی خبر

دیتا تو مجھے لگتا شاید یہی تقدیر ہے۔ شاید تم ہمیں چھوڑ جاؤ۔ تب ہمایوں میرے پاس واپس آجائے۔ مجھے لگا، میری قربانی قبول ہو گئی ہے۔ اس کا انعام مجھے دیا جانے لگا ہے۔ مجھے بھول گیا کہ وہ قربانی تو اللہ کے لئے تھی، اللہ کو پانے کے لئے تھی، دنیا کے لئے یا ہمایوں کے لئے تو نہیں تھی۔ مگر تمہاری طرف سے ہم اتنے مایوس ہو گئے تھے کہ آہستہ آہستہ مجھے سب بھولتا گیا۔ میں ہر نماز میں، ہر روز حلاوت کے بعد ہمایوں کو خدا سے مانگنے لگی۔ میں آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکنے لگی تو میرے ساتھ شیطان لگ گیا۔“ اُس کی اٹھی لمبی گروپ آنکھوں سے نکلتے آنسو پھسل رہے تھے۔ اس کی نگاہیں ابھی ابھی اوپر چاند پہنچی تھیں۔ شاید وہ ابھی محمل کونہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

”جب میں دوبارہ واپس آئی تو اپنی ”زمین“ کی طرف جھلکی ہوئی آئی، اس امید پر تمہاری خدمت کرنے آئی کہ شاید یہی دیکھ کر ہمایوں کا دل میری طرف کھینچ جائے۔ میری اس ان تھک خدمت میں ریاشامل ہو گئی۔ مجھے اس وقت سے ذر نہیں لگا، جب میں حشر کے بڑے دن اپنے رب کے سامنے اپنے اعمال نامے میں ان بڑی بڑی نیکیوں پر کاٹا گلے دیکھوں گی کہ یہ تو ریا کے باعث ضائع ہو گئیں، قول ہی نہیں کی گئیں۔ مجھے ذر نہیں لگا۔ میں ریا کاری کرتی گئی۔ مگر یقین کرو، قرآن مجھ سے نہیں محسوساً۔ میں تب بھی روز اسے پڑھتی تھی۔ مگر میرا جینا مرنا، نماز اور قربانی ہمایوں کے لئے ہو گئی۔“

یک دم باول زور سے گر جے اور اگلے ہی لمحے بارش کے ٹپ ٹپ قطرے گرنے لگے مگر وہ دونوں بے خبر بیٹھی تھیں۔

”پھر ایک دن معیز چلا آیا۔ اسے آرزو نے بھیجا تھا۔ وہ ان گزرے سالوں میں کوئی دفعہ ہمایوں سے رابطے کی کوشش کر چکی تھی۔ مگر اس نے جب توجہ نہ دی تو اس نے معیز کو بھیجا۔ اس کے پاس تصویریں تھیں اور وہ کاغذ۔ ہمایوں نے مجھ سے پوچھا تو کاغذ کی بابت میں نے سچ بولا، مگر جب اس نے تصویریں میرے سامنے پھینکیں تو میں خاموش ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جعلی ہیں، مگر شیکدیکھی میں نہیں جانتی تھی کہ وہ سچ ہیں یا نہیں..... میرے پاس کوئی ثبات نہ تھا۔ مگر میرا دل..... بار بار کوئی میرے اندر وہ آیت دہرارہا تھا کہ

”کیوں نہیں تم نے کہا کہ یہ کھلم کھلا بہتان ہے۔“

وہ آیت بھی ایک ایسی محترم ہستی کے لئے نازل ہوئی تھی، جس کے اوپر لگے بہتان کی حقیقت سے مومنین بے خبر تھے، پھر بھی اللہ نے ان کو سرزنش کی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کردار کی کتنی سچی ہے، تم نے اس کی حمایت نہیں کی؟

میں ہمایوں کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ میرے اوپر چلا آ رہا تھا اور مسلسل کوئی میرے اندر کہہ رہا تھا کہ ”هذا افک میں“ (یہ بہتان ہے کھلم کھلا) میں نے سر اٹھایا، ایک نظر ہمایوں کو دیکھا، وہ ہمایوں جس سے میں نے بہت محبت کی تھی۔ اور پھر میں نے کہہ دیا کہ میں اس بارے میں لا علم ہوں۔

تب ایک دم میرے اندر باہر خاموشی چھا گئی۔ وہ آواز آنا بند ہو گئی۔ تب ہمایوں نے معلوم نہیں، کہاں سے وہ شیپ نکالی اور مجھے سنوائی۔ اس میں کسی انگوٹھی کا تذکرہ تھا۔ اس نے معیز کی کہی بات دہرانی کہ کیا اس روز فواد تھیں پروپوز کرنے کا جھانسے دے کر باہر لے کر گیا تھا؟ تب پھر سے کسی نے میرے اندر کہا۔

”اللہ خیانت کا رکی چال کی راہنمائی نہیں کرتا۔“

مگر اب وہ آواز کمزور پڑ چکی تھی۔ مجھے امانت کے سارے سبق بھول گئے۔ میں نے اسے وہ بتا دیا جو تم نے مجھے بتایا تھا۔ تب وہ مجھ پر بہت چینا۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنی بہن کو بچانے کے لئے اس کے سر تھوپ دیا ہے۔ اس نے بہت مشکل سے دل بڑا کر کے اس بات کو نظر انداز کیا تھا کہ تم کس طرح پہلی دفعہ اس کے گھر لائی گئی تھیں۔ مگر یہ بات کہ فواد کا اور تمہارا کوئی افسیر تھا، اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میرے ایک فقرے نے ہر چیز پر تقدیق کی مہر لگادی۔ وہ مجھ پر کبھی ایسے نہیں برسا تھا، جیسے اس رات برسا تھا۔ میں ساری رات روئی رہی۔ نامعلوم غم کس بات کا زیادہ تھا۔ خیانت کا، یا ہمایوں کے رقیے کا۔ میں نے واپس چانے کا فیصلہ کیا۔ مگر ہمایوں نے اگلی صبح مجھ سے ایسکیوڑ کر لیا۔ میں چپ چاپ سنتی رہی۔ تب آخری دفعہ میرے دل سے آواز آئی کہ اس کو بتا دو کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔

مگر میں چپ رہی۔ میں نے خواہشات کی پیروی میں چنانا شروع کر دیا۔ اور میں

بھٹک گئی۔ وہ کراچی چلا گیا اور میں کئی دن تک تمہیں دیکھنے ہستال نہیں جاسکی۔ پھر میں مسجد بھی نہیں جاسکی۔ اس دن میں نے خیانت کی۔ محمل! اس دن سے آج کے دن تک تین، ساڑھے تین سال ہونے کو آئے ہیں، میں قرآن نہیں کھول پائی۔ ہاں، نمازیں میری آج بھی دیکھی ہی لمبی ہیں۔ میں بحدوں میں گر کر ہمایوں کو اپ بھی مانگتی ہوں، مگر قرآن پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔“

بارش تڑا تڑ برس رہی تھی۔ فرشتے کے بھورے بال بھی چکے تھے۔ موئی موئی، گلی لیں، چہرے کے اطراف میں چپک گئی تھیں۔ وہ ابھی تک اوپر چاند کو دیکھ رہی تھی۔

”وہ کراچی سے آیا تو بدلتا گیا تھا۔ پھر ایک روز اس نے مجھے پروپوز کیا۔ اچانک..... بالکل اچانک سے۔ اور مجھے لگا، میری ساری قربانیاں مستجاب ہو گئی ہیں۔ پھر مژکر پیچھے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ تم سے بہت بدظن ہو چکا تھا۔ مگر میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ تمہارا اعلان کروانا مت چھوڑے۔“

موسلا دھار بارش میں بار بار بھلی چمکتی تو پبل بھر کو سارا لان روشن ہو جاتا تھا۔

”فواڈ نے کئی دفعہ فون کر کے تمہارا پوچھنا چاہا، میں نے اسے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ بس اس کی بات سن کر کچھ کہہ بنا ہی بند کر دیتی۔ وہ بہت بدلتا گیا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر ایک دفعہ اسے اس سارے کھیل کا علم ہو گیا تو وہ ہمایوں کے پاس آ کر اسے سب بتا دے گا۔ مشکل ہی تھا کہ ہمایوں اس کا یقین کرے، مگر اس ذر سے میں نے اسے کبھی کچھ پتہ نہیں لگنے دیا۔“

”مجھے ہمایوں نہیں چاہئے فرشتے!“ وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ ”مجھے اپنی بہن چاہئے۔“

”مجھے بھی ہمایوں نہیں چاہئے۔ مجھے بھی اپنی بہن ہی چاہئے!“ اس نے بھی آنکھوں کا رخ پہلی دفعہ محمل کے چہرے کی طرف کیا۔ محمل نے اس کے گھنٹوں پر رکھے ہاتھ پکڑ لئے۔ ان میں آج چاندی کی وہ انگوٹھی نہیں تھی۔

بارش زور سے ان دونوں پر برس رہی تھی۔

”میں نے فواڈ کو فون کر دیا ہے، وہ تینچھے والا ہو گا۔ وہ خاصاً بھروسہ دار بندہ ہے۔ ایسے

ثبت لائے گا کہ ہمایوں اسے جھٹلانہ سکے گا۔ وہ ابھی آکر ہمایوں کو سب کچھ بتا دے گا۔ ابھی کل دوپہر میں خاصا وقت ہے، تمہاری عدت ختم نہیں ہوئی میں جانتی ہوں کہ وہ حقیقت جان کر رہ نہیں سکے گا اور تمہیں واپس اپنائے گا۔ آؤ، اندر چلتے ہیں۔“ فرشتے نے اپنے ہاتھوں کے ہاتھوں سے نکالے، انھی اور پھر وہیل چیز کی پشت تھام لی۔

”بس، مجھ پر ایک احسان کرنا۔ ہمایوں کو مت بتانا کہ میں نے خیانت کی۔ میں اس کی نظر وہ میں گرتا نہیں چاہتی۔ بظاہر میں نے جھوٹ نہیں بولا، مگر مجھے تمہارا راز نہیں کھولنا چاہئے تھا۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی، میں فواد کے سامنے تمہاری تائید کروں گی۔ مگر تم..... تم میری عزت رکھ لینا۔ وہ جانتا ہے کہ فرشتے جھوٹ نہیں بولتی، خیانت نہیں کرتی۔ اس نے ان تصویروں پر نہیں، مجھ پر یقین کر کے تمہیں طلاق دی تھی۔ تم میری عزت رکھ لینا۔“

وہ اس کی وہیل چیز دھکیلیتی آہستہ آہستہ بے خودی کہہ رہی تھی۔ محمل نے سر جھکا لیا۔ وہ فرشتے کو نہیں بتا سکی کہ آج وہ پھر زمین کی طرف جھک رہی ہے۔ مگر اسے پتہ نہیں ہے۔

”تم ہمایوں کو واپس لے لو محمل! وہ تمہارا ہی رہنا چاہئے۔“ وہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ کر پلٹ گئی۔

● ● ●

کمرے میں اسی طرح نیم اندر ہمرا تھا۔ کھڑکی کے پردے ہٹے تھے۔ نبیل یمپ ابھی تک جل رہا تھا۔ وہ خود کو گھستی آگے بڑھی اور یمپ کا بٹن بجھایا۔ ایک دم کمرے میں اندر ہرا پھیل گیا۔ بس کھڑکی کے پار بارش کے قطرے گرتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ وہیں کھڑکی کے سامنے بیٹھی برستی بارش کو دیکھے گئی۔

بہت پہلے شیخ عبدال قادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا پڑھا گیا قول اس کو یاد آیا تھا۔

”انسان جس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے، اللہ اسے اسی کے ہاتھوں سے توڑتا ہے۔ انسان کو اس ٹوٹئے ہوئے برتن کی طرح ہونا چاہئے، جس سے لوگوں کی محبت آئے اور باہر نکل جائے۔“

اللہ نے اسے ان ہی لوگوں کے ہاتھوں توڑا تھا، جن سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتی تھی۔ ہمایوں، فرشتے اور تیمور!

تب ہی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔
وہ گاڑی بار بار ہارن بجا رہی تھی۔ تب اس نے برسی بارش میں ہمایوں کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔

اس نے گیٹ کھولا تو ایک گاڑی زن سے اندر داخل ہوئی۔ ڈرائیور گیٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔ وہ فواد ہی تھا، وہ پیچان گئی تھی۔

وہ ویسا ہی تھا۔ بس آنکھوں پر فریم لیس گلائز تھے اور بالوں کا کٹ زیادہ چھوٹا تھا۔
کیا ہمایوں اس کی بات سن لے گا؟..... کبھی بھی نہیں!

تب ہی فواد نے لپک کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور کسی کو بازو سے سمجھنے کر باہر نکلا۔ محمل دھک سے رہ گئی۔ وہ معیز تھا۔

پکلا، لمبا نوجوان جس کی میں بھیگ رہی تھیں۔ فواد اس کو پکڑ کر ہمایوں کے سامنے لایا جو قدرے چونکا ہوا کھڑا تھا۔

برستی بارش کا شور بہت تیز تھا۔ ان کی باتوں کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہ تینوں بارش میں بھیگتے کھڑے تھے۔ فواد زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہمایوں سینے پر ہاتھ باندھے صرف خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس کی محمل کی طرف پشت تھی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اور تب اس نے معیز کو ہاتھ جوڑے دیکھا۔ شاید اس کے چہرے پر بارش کے قطرے تھے، یا شاید وہ رو رہا تھا۔ رو تے ہوئے کچھ کہتے ہوئے وہ ہمایوں سے معاف مانگ رہا تھا۔ اور تب اس نے فرشتے کو باہر آتے دیکھا۔ وہ بھی کچھ کہہ رہی تھی۔

محمل نے ہاتھ بڑھا کر پردہ برابر کر دیا۔ وہ اس منظر کو اب تر یہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔
سکتی ہی دیر بعد اس نے فرشتے کی آواز سنی، وہ فواد اور معیز کو ادھر لارہی تھی۔
اس کے کمرے کا دروازہ کھلا، محمل کی اس طرف پشت تھی۔

”محمل....!“ فواد کی بھڑائی ہوئی آواز اسے سنائی دی۔ ”معیز نے ہمایوں کو سب

کچھ بتا دیا ہے۔ اگر مجھے پہلے پتہ ہوتا تو..... محمل! مجھے معاف کرو۔ ہم نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی۔“

”آپا! ہمیں معاف کرو۔“ وہ معیز تھا، وہ رورہا تھا۔ ”اماں اور آرزو آپانے مجھے یہ سب کرنے کو کہا تھا۔ آپا! اماں بہت بیکار ہیں۔ وہ اب پہلے جیسی نہیں ہیں۔ وہ سارا دن چھٹی چلاتی ہیں۔ آپا! ہمیں.....“ وہ کہہ رہا تھا اور کوئی دھیمے سے اس کے اندر بولا تھا۔

”پس تم یتیم کے ساتھ چھٹی نہ کرنا۔“

”آپا!..... آرزو آپانے خود کشی کر لی ہے۔ آج ہمایوں بھائی نے ان کو ربیکٹ کر دیا تھا۔ اماں سنن جعل نہیں پا رہیں۔ ہمیں بد دعا ملت دینا آپا!“

”جاوہ معیز! میں نے تمہیں معاف کیا..... سب کچھ معاف کیا۔“
وہ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”آپا! دعا کرو، آرزو آپانع جائیں۔ ان کے لئے بد دعا ملت کرنا۔“

”میں دعا کروں گی۔ تم جاوہ معیز! ان کا خیال رکھنا۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے، بلکہ تم نے تو مجھے انسانوں کی محبت اور وفا کی حقیقت دکھائی ہے۔ تمہارا شکر یہ معیز! تم جاوہ۔“

اور وہ دیے ہی اُنکے قدموں پلٹ گیا۔

”کیا تم ہمیں معاف کر سکتی ہو محمل؟“ وہ شکست خورده، ٹوٹا ہوا شخص آغا فواد، ہی تھا۔

”میں نے معاف کیا..... سب معاف کیا۔“ وہ اب بھی پیچھے نہیں مڑی تھی۔

”آغا جان کو آدھے جسم کا قائم ہو گیا ہے۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ میں ان کے غم کی وجہ سے نہ زندوں میں رہی، نہ مردوں میں۔ سدرہ کے شوہر کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور اس کے وہ خاندانی سرال والے اس کو میکے نہیں آنے دیتے۔ وہ اور اس کے یتیم بچے اپنے گھر میں اس سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں جو تم نے اور سرت پیچی نے گزاری تھی۔ مہرین کو.....“

”مجھے کچھ مت بتائیں فواد بھائی، چلیز!..... میں نے معاف کیا..... سب معاف کیا۔ مجھے یہ سب بتا کر اور دکھنے دیں۔ ابھی مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“ اس کے نرم لمحے

میں منت تھی۔

”ٹھیک ہے۔ اور یہ تمہارا حصہ ہے۔ ان تمام سالوں کے منافع سمیت۔ فرشتے کا حصہ میں اسے ادا کر چکا ہوں۔ ہو سکے تو ہمارے لئے دعا کرتا۔“ وہ ایک فائل اور ایک مہربند لفافہ اس کے بیڈ کی پائینتی پر رکھ کر واپس مڑ گیا تھا۔

محمول نے گردن پھیر کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے، نادم و شکستہ حال جا رہا تھا۔

وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ آغا فواد کا کیا انجام ہوا؟ مگر یہ دنیا انجام کی جگہ تھوڑی ہے؟ یہ تو امتحان کی جگہ ہے، اپنے گناہ نظر آتا بھی ایک امتحان ہے۔ اصل فیصلہ تو روز حساب ہی ہو گا۔

اس کے بیڈ کی پائینتی پر چند کاغذ رکھے تھے۔ وہ کاغذ جو کبھی اس کی زندگی کا محور تھے۔ مگر آج اس نے ان پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ ان ہی کاغزوں کے لئے اس نے فواد کا جھانسہ قبول کیا تھا، آج فواد نے اسے خود لادیئے تھے۔ مگر کتنی بھاری قیمت تھی اس غلطی کی، جو اسے چکانی پڑی تھی۔

بھی عمر کے کچھ سو دے یے.....

بارش دھیمی ہو چکی تھی۔ کھڑکی کی جالیاں گیلی ہو چکی تھیں۔ ان سے مشی کی سوندھی خوبصوراً آ رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھی خوبصوراً تھی رہی۔ اسے لاشوری طور پر اس کا انتظار تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اس کے کمرے میں ضرور آئے گا۔

کافی لمبے بیتے، گئے تو اس نے چوکھت پر آہستہ سی۔ وہ آہستہ سے مڑی۔

ہمایوں تھکا ہارا سا دروازے میں کھڑا تھا۔ یہ وہ دروازہ تھا جو اس نے محمول کی موجودگی میں کبھی پار نہیں کیا تھا۔ یہ وہ چوکھت تھی، جس پر وہ کبھی سوائی بن کر نہیں آیا تھا۔ مگر آج وہ آیا تھا۔

اس کے تھکے تھکے، ٹوٹے قدم آہستہ اندر داخل ہوئے تھے۔

”محمول.....!“ ٹوٹی ہوئی آواز میں اس نے پکارا تھا اور پھر وہ پورے قد سے گھشوں کے بل اس کے قدموں میں آن گرا تھا۔

”مجھے معاف کر دیجیں.....!“ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پر صدیوں کی

تھکان تھی۔

”مجھے معاف کرو..... میں بہت دور چلا گیا تھا۔“

اس نے تاسف سے ہمایوں کو دیکھا۔ پہلے بھی وہ سب اس سے اس کا سب کچھ چھین کر لے گئے تھے۔ آج بھی وہ مانگ ہی رہے تھے۔ مانگنے ہی آئے تھے۔ سب خود غرض تھے۔

ہر ایک کو اپنے ضمیر کے بوجھ سے نجات چاہئے تھی۔ محمل ابراہیم تو کہیں بھی نہیں تھی! میں نے صرف فرشتے کی بات پر..... اور آج وہ کہہ رہی ہے کہ تم نے اس سے صرف ایک مسئلہ پوچھا تھا، اس نے خود غلط اخذ کیا۔ میں نے صرف فرشتے کی وجہ سے....

”کیا آپ نے پہلے زندگی کے سارے فیصلے فرشتے کے دماغ سے کئے تھے، ایسی صاحب؟“ وہ سپاٹ لجھے میں بولی تھی۔ ”آپ چھوٹے نیچے تھے جو نہیں جانتے تھے کہ میرے رشتے دار میرے کھلے دشمن ہیں؟..... آپ ان پڑھ، جاہل تھے جو یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایسی تصوریں تو ہرگلی محلے میں بن جاتی ہیں۔“

”محمل! یقین کرو، میں.....“

”ایک منٹ ایسی پی صاحب! میں نے کئی میئنے صرف آپ کی سنی ہے۔ آج آپ میری سینیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے فرشتے کے کہے پہ یقین کر لیا؟ آج میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ آپ نے فرشتے سے پوچھا ہی کیوں؟ آپ میری طرف سے اتنے بدگمان تھے کہ آپ کو دوسروں سے پوچھنا پڑا؟ کیوں نہیں آپ نے وہ تصاویرِ معیز کے منہ پہ دے ماریں؟ کیا آپ بہت قابل پولیس آفیسر نہیں تھے؟ کیا آپ کو کھرا اور کھوٹا ایگ کرتا نہیں آتا تھا؟ کیا آپ آرزو کی خصلت کو نہیں جانتے تھے؟ یا شاید آپ کی دلچسپی ایک یکار، بے ہوش عورت میں ختم ہو گئی تھی؟..... شاید آپ کو میری خدمت سے دور بھاگنے کا ایک بہانہ چاہئے تھا۔ آپ آزاد ہونا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ مجھے صفائی کا ایک موقع تو دیتے۔ ایک بار تو پوچھتے کہ کیا تم نے ایسا کیا ہے؟ مگر آپ خود بھی مجھ سے تھک گئے تھے۔ آپ نے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا ہمایوں! کہ اگر میری

جلگہ آپ یوں بیکار ہوتے اور میں آپ کے ساتھ بھی کرتی تو آپ کی کیا حالت ہوتی؟“
بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ تب ہی کھلے دروازے سے تمور بھاگتا ہوا
اندر آیا۔ شود سن کر وہ نیند سے جا گا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا اور اس کے گھنٹوں
سے لپٹ گیا۔ مگر ہمایوں اور محمل اس کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

”محمل! مجھے معاف کر دو۔ میں رجوع کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔“ ہمایوں
نے اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر محمل ایک دم چیچے کو ہوئی۔
”لیکن اب میں ایسا نہیں چاہتی۔ ٹوٹے دھاگے کو دوبارہ جوڑا جائے تو اس میں ایک
گردہ رہ جاتی ہے۔ ہمارے درمیان بھی وہ گردہ رہ گئی ہے، سو اس دھاگے کو ٹوٹا رہنے دیں۔“
”محمل!“ وہ بے یقین تھا۔ معافی کے لئے جڑے اس کے ہاتھ نیچے گر گئے۔ محمل
نے مگری سانس لی۔

”میں نے آپ کو معاف کر دیا ہمایوں! دل سے معاف کر دیا ہے۔ مگر اب رجوع
کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ کوکہ آپ کو رجوع کرنے کے لئے میری اجازت
نہیں چاہئے۔ مگر میری خوشی کا خیال ہے تو یہ مت کریں۔ آپ فرشتے سے شادی کر
لیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔ درمیان میں، میں آگئی تھی۔“
”مگر محمل!..... تم.....“ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر آج وہ نہیں سن رہی تھی۔

”مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی ہے، ہمایوں!.... میرا بیٹا، میرے پاس
ہے۔ فواد نے مجھے میرا حصہ بھی دلا دیا ہے۔ میں لوگوں کی محتاج نہیں رہی۔ آپ فرشتے
سے شادی کر لیں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔“

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ہمایوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔

فرشتے دہاں کھڑی رو رہی تھی۔ ہمایوں کو گردن موڑتے دیکھ کر، وہ منہ پر ہاتھ رکھے
باہر کو بھاگ گئی تھی۔

”آپ اس کا اور امتحان نہ لیں۔ اس سے شادی کر لیں۔ میں اور تمور ایک
دوسرے کو بہت ہیں۔ ہمارا تیرا اللہ ہے۔ آپ ہمیں جانے دیں۔ اب ہمارا ساتھ
ناممکن ہے۔“

وہ بھیگ آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے تمہاری قدر نہیں کی، محمل!“ وہ ننھی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھا اور شکستہ قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔

” دروازہ بند کر جائیے گا۔“

اس کے الفاظ پر وہ ذرا دیر کو رکا، مگر پلٹا نہیں۔ اب شاید وہ پلٹنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا۔ بہت آہستہ سے وہ باہر نکلا اور کمرے کا دروازہ بند کیا۔
وہ محمل کی زندگی سے جا چکا تھا۔

دو آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹے اور گردن پڑھک گئے۔

فرشتے کہتی تھی کہ اس نے سنائیں، جب وہ برسوں پہلے اس ہسپتال میں ”کچھ“ بتانا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ منظر تو اسے آج بھی یاد تھا، جو وہ نس کے پکارنے پر اٹھی تھی۔ فرشتے کی اوھوری بات سن کر ہی اٹھی تھی۔ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ فرشتے، ہمایوں کو پسند کرتی ہے۔ مگر جب فرشتے نے خود اپنے روپے سے یقین دلایا تو وہ بھی بظاہر خود کو مطمئن کرنے لگی کہ بھلا فرشتے ایسے جذبات کیوں رکھے گی۔ مگر دُراندر وہ ہمیشہ سے جانتی تھی، اگر آرزو کو درمیان میں نہ دیکھا ہوتا تو وہ بھی اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتی کہ ہمایوں کس سے شادی کر رہا ہے۔ ہاں، وہ جانتی تھی کہ فرشتے کیوں ان کی شادی کے بعد باہر چلی گئی تھی۔

وہ سب جانتی تھی۔ یہ بھی کہ اب وہ معدور ہو گئی تھی۔ ایک بے کشش عورت بن گئی تھی۔ ہمایوں نادم ہو کر پلٹا تو تھا۔ مگر تھا تو مرد ہی۔ کب تک اس سے بندھا رہتا؟ جو کافیں کا اتنا کچا تھا کہ اس فون کال میں ایک انگوٹھی کا ذکر اس کی سمجھ میں آیا۔ اور اس کی مسلسل ”فواڈ بھائی، فواڈ بھائی“ کی سکرار میں ”بھائی“ کا لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کب تک اس کا رہتا؟ ایک نہ ایک دن وہ پھر کسی دوسری عورت کی طرف چلا جاتا۔ تب بھی وہ اکیلی رہ جاتی۔ مگر تب وہ شاید برداشت نہ کر پاتی۔ اس میں بار بار ٹوٹنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ سواں نے ٹوٹا ہوا برتن بننے کا سوچا۔ فرشتے نے اعتراف کیا تھا، معافی نہیں مانگی تھی۔ ہمایوں نے معافی مانگی تھی مگر اعتراف نہیں کیا تھا۔ اور وہ دونوں سمجھتے تھے کہ وہ برقی الذمہ ہو گئے

ہیں۔ خیر!

”تیمور.....“ اس نے گود میں سر رکھتے تیمور کے زم بھورے بالوں کو پیار سے سہلا دیا۔

”ہوں؟“ وہ کچی نیند میں تھا۔

”تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ میں یوسف علیہ السلام کے ذکر پر اُداس کیوں ہو جاتی ہوں، ہے نا؟“

”جی ماما!“ وہ نیم غنودہ سا بولا۔

”پتہ ہے، میں کیوں اُداس ہو جاتی ہوں؟“ اس نے اپنے آنسو پوچھئے۔ ”کیونکہ وہ بہت بھر کرنے والے تھے اور وہ اپنے والد کے بہت پیارے تھے۔“ اسے بولتے ہوئے کچھ اور بھی یاد آ رہا تھا۔

”مگر ان کے اپنے بھائیوں نے ان کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔“ اس کی آنکھوں کے سامنے کچھ مناظر تیزی سے چل رہے تھے۔

”پھر ان کو چند درہم کے عوض مصر میں بیچا گیا۔ ان پر بہتان لگایا۔ ان کو برسانی قید میں رکھا گیا۔ اور پھر ایک دن آیا، جب وہ اسی مصر کے فناں فشر بنے، جس میں بھی ان کو بیچا گیا تھا۔ ان کو اپنا پھرزا ہوا بھائی مل گیا۔ اور وہ جنہوں نے ان پر ہتھیں لگائی تھیں اور وہ جنہوں نے ان کو ان کے گھر سے بے دخل کیا تھا، وہ ان کے پاس معاف مانگنے آئے۔ مگر اس عظیم سنتی نے کچھ نہیں جتنا یا، کچھ نہیں رکنوا یا، سب کو معاف کر دیا۔ میں اس لئے اُداس ہوتی ہوں تیمور! کہ میں صبر کے اس مقام پر کبھی نہیں پہنچ سکی..... کیا تم سن رہے ہو؟“ اس نے چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا اور پھر جھک کر اس کے بالوں کو ٹوٹا۔ تیمور گھری نیند سوچ کا تھا۔



ٹی وی لاونچ کی مرکزی دیوار پر بڑی سی پلازما اسکرین لگی تھی۔ اس پر ایک خوب صورت منظر پوری آب و تاب سے چک رہا تھا۔ روشنیوں سے منور ایک بڑا ساہال، ہزاروں لوگوں کا مجمع۔ اشیج پر بیٹھی نامور دینی شخصیات اور روشنر مپ پر کھڑا وہ شخص جو یتکھر دے رہا تھا۔

ٹی وی کے سامنے صوفی پر بیٹھے ہمایوں داد دنے ریبوت اٹھا کر آواز اوپری کی۔ والیوم کے بڑھتے نقطے اسکرین پر موجود شخص کے کوٹ پر نمودار ہوئے تھے۔ ہمایوں نے ریبوت رکھ دیا۔ اب وہ ہنا پلک جھپکے، ساکت بیٹھا، اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ فیصلہ آج نہیں ہوا، بلکہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہی ہو گیا تھا کہ قرآن صرف عربی کا قرآن ہے۔ اس کے تراجم قرآن نہیں ہیں۔“

وہ روشن چہرے والا شخص اپنے خوب صورت انگریزی لب و لبجھے میں کھہ رہا تھا۔ وہ تحری پیس سوت میں لمبوس تھا۔ چہرے پر نفاست سے تراشیدہ داڑھی تھی اور سر پر سفید جالی دار ٹوپی۔ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ کانچ سی مخوری، چمکتی ہوئی۔ اور مسکراہٹ بہت دلفریب تھی۔ کچھ تھا اس کی محور میں شخصیت میں کہ ہزاروں لوگوں سے بھرے ہاں میں سنائا تھا۔ سب سانس روکے اس کی بات سن رہے تھے۔

”آج کے دور کا مسلم جب قرآن کھولتا ہے تو کہتا ہے کہ اسے اس میں وہ اندازِ کلام نظر نہیں آ رہا، جس کے قصے وہ بچپن سے متا آیا ہے۔ وہ اندازِ کلام جسے سنتے ہی عرب

کے لوگ لا جواب ہو جاتے تھے، سجدے میں گر جاتے تھے، فوراً ایمان لے آتے تھے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اس قرآن کا لاکھ انکار کرنے کے باوجود ابو جہل بن ہشام جیسے لوگ بھی چھپ چھپ کر اسے سننے آتے تھے؟ اور کیا وجہ ہے کہ ہمیں اس میں وہ بات نہیں نظر آتی جو ان عربوں کو نظر آتی تھی؟ ہمیں کیوں یہ صرف قصوں کا مجموعہ لگتا ہے جن کے درمیان چند نصیحتیں ہیں اور نماز روزے کے احکام؟“

ہمایوں نے رسیوٹ اٹھا کر دوبارہ آواز اوپنجی کی اور پھر مضطرب انداز میں اسے داپس رکھ دیا۔

”کیا آپ نے ڈاکٹر مورلیس بکائی کا واقعہ سنایا ہے؟“ اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا اور پورے ہال پہ نگاہ دوڑائی۔ سب دم سادھے اس کو سن رہے تھے۔

”ڈاکٹر مورلیس بکائی ایک فریج ڈاکٹر تھے۔ وہ اپنے پاس آنے والے ہر مسلمان مریض سے کہتے تھے کہ قرآن حق نہیں ہے، بلکہ ایک من گھڑت کتاب ہے۔ مریض بے چارے آگے سے خاموش ہو جاتے۔ پھر ایک دفعہ جب شاہ فیصل ان کے پاس زیر علاج تھے، انہوں نے سہی بات شاہ فیصل سے کہی تو انہوں نے پوچھا۔“ کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟“ ڈاکٹر بکائی نے کہا۔ ”ہاں پڑھا ہے۔“ شاہ فیصل نے پوچھا کہ کیا پڑھا ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ قرآن کا ترجمہ پڑھا ہے۔ اس پر شاہ فیصل نے کہا۔ ”پھر تم نے قرآن نہیں پڑھا کیونکہ قرآن صرف عربی میں ہے۔“

ڈاکٹر بکائی نے اس کے بعد دوسال لگا کر عربی سمجھی، اور پھر جب انہوں نے اصل قرآن پڑھا تو وہ فوراً مسلمان ہو گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگوں نے قرآن نہیں پڑھا ہوتا۔ جو عربی ہم پڑھتے ہیں اس کا لیٹرل درڈ میتگ literal word meaning نہیں آتا ہوتا۔ کسی حد تک یہ ترجمہ اثر کر جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی قرآن کا اصل جانتا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ عربی کا قرآن پڑھتے۔“

ہمایوں کے صوفی کے پیچے جانے کب آہستہ سے فرشتے آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ ناپک جھپکے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”اب اس کے دو طریقے ہیں۔ یا تو آپ پوری عربی سمجھیں، یا آپ صرف قرآن کی عربی سمجھیں اور صرف قرآن کی عربی سمجھ کر بھی آپ بالکل درست طور پر اصل قرآن سمجھ سکتے ہیں۔ انہی کو کچھن؟“

اس نے رُک کر ہال پر نگاہ دوڑائی۔

اشیع کے سامنے نیچے لگے مائیک کے قریب کھڑی ایک پاکستانی لڑکی فوراً آگے بڑھی اور مائیک تھاما۔ ”السلام علیکم ذا کش تیمور!“
”علیکم السلام!“ وہ سر کے خفیف اشارے سے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”سر! مجھے آپ کی بات سن کر یہ سب بہت مشکل لگ رہا ہے۔ عربی بہت مشکل اور چھیدہ زبان ہے۔ یہ ہماری مادری زبان نہیں ہے۔ عام آدمی اسے کیسے سمجھ سکتا ہے؟“
وہ ذرا سامسکرا کیا، اپنا چہرہ مائیک کے قریب لا کیا۔

”بالکل ایسے چیزے ہمارے ملک کے عام آدمی نے دنیا کے علوم حاصل کرنے کے لئے انگریزی سمجھی ہے۔ وہ بھی ہماری زبان نہیں ہے، مگر ہمیں آتی ہے۔ کیا نہیں آتی؟..... عربی سمجھنا تو زیادہ آسان اس لئے بھی ہے کہ یہ اردو سے بہت قریب ہے۔“
لڑکی نے لا جواب ہو کر گھری سانس بھری۔ چھپے پورے ہال میں ایک تمسم بکھر گیا۔
”میرا ایک کوچھن ہے سرا!“ ایک نو عمر، لمبا سالڑکا مائیک پر آیا۔ میں نے آپ کے پچھلے پچھر سے متاثر ہو کر قرآن سمجھنا شروع کیا تھا۔ مگر قرآن پڑھتے اب مجھ پر پہلے والی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ دل میں گداز نہیں پیدا ہوتا۔ میں قرآن پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بھٹک رہا ہوتا ہے۔“

تیمور نے مائیک قریب کیا، پھر بغور اس لڑکے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کہیں جھوٹ تو نہیں بولتے؟“

”جی؟“ وہ بھونچ کارہ گیا۔

”ایک بات یاد رکھئے گا، قرآن صرف صادق اور امین کے دل میں اترتا ہے۔ میں نے اس کتاب کے بڑے بڑے علماء کو دیکھا ہے، جو امانت کی راہ سے ذرا سے پھسلے اور

پھر ان سے قرآن کی حلاوت چھین لی گئی، اور پھر کبھی وہ اس کتاب کو ہاتھ نہ لگا سکتے۔“
بات کرتے ہوئے تیمور ہمایوں کی کانچ سی بھوری آنکھوں میں ایک کرب انجرا
تھا۔ اس کے صوفی کی پشت پر ہاتھ رکھے، فرشتے ساکت کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے
دیوار میں شیلیف بنا تھا۔ ایک طرف میز تھی۔ میز پر تازہ تہہ کی ہوئی جائے نماز ابھی
ابھی رکھی گئی تھی۔

ساتھ شیلیف کے سب سے اوپر والے خانے میں احتیاط سے غلاف میں لپٹی ایک
کتاب رکھی تھی۔ اس کا غلاف بہت خوب صورت تھا۔ سرخ ویلوٹ کے اوپر سلوٹ
ستارے۔ مگر گزرتے وقت نے غلاف کے اوپر گرد کی ایک تہہ جمادی تھی۔ اور وہ شیلیف
اتنا اونچا تھا کہ اس تک اسٹول پر چڑھے بغیر ہاتھ نہیں جانا تھا۔

”جس شخص میں صداقت اور امانت ہوتی ہے اور وہ واقعی قرآن حاصل کرنا چاہتا
ہے تو قرآن اس کو دے دیا جاتا ہے۔“ اسکریں پر وہ روشن چہرے والا شخص کہہ رہا تھا۔
”ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے عرب معاشرے کے بارے میں
عمومی تاثر یہ رکھتے ہیں کہ وہ بہت جاہل، گنوار لوگ تھے اور بیٹیوں کو زندہ دبانے والے
وحشی تھے۔ لیکن ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ مہماں نواز تھے، عہد کی پاس
داری کرتے تھے۔ جہاں تک بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کا تعلق ہے تو یہ کام عرب کے
کچھ غریب قابل کرتے تھے اور اس وقت بھی انسانی حقوق کی تنقیبیں تھیں، جو فدیہ دے
کر ان بچیوں کو چھڑاتی تھیں۔ اور رہی بات صداقت کی تو عرب معاشرے میں جھوٹ
بولنا انتہائی حقیقی عمل سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس شخص پر حیران ہوتے تھے جو جھوٹ بولتا ہو۔
اسی لئے ان لوگوں کو قرآن دیا گیا تھا اور اسی لئے ہم لوگ اس کی سمجھ سے محروم کر دیئے
گئے ہیں۔ کیونکہ نہ تو ہم سچ بولتے ہیں، اور نہ ہی امانت کا خیال رکھتے ہیں، بھلے وہ کسی
ذمہ داری کی امانت ہو، کسی کی عزت کی، یا کسی کے راز کی۔“

محمل مسکرا کر ڈی اسکریں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ سینیار دوہا سے لا بیو آرہا تھا۔ سینیار ختم ہوتے ہی تیمور نے فلاٹ لپٹی تھی۔ اور
وہ جانتی تھی کہ رات کھانے پر وہ ان کے ساتھ ہو گا۔ ابھی اس نے تیمور کے لئے ایک

ڈر کی تیاری بھی شروع کرتا تھی، سو وہ پروگرام چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
تیمور کے لئے کھانا وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے خود تیار کرتی تھی۔ ایک ایک بزری خود
کاٹتی تھی۔ ہاں، آغا جان کا پرہیزی کھانا ملازمہ بنایا تھی۔

وہ پیر ہیوں کے ایک طرف سے نکلتی ہوئی آغا جان کے کمرے کے دروازے کے
باہر رکی اور اسے ہولے سے ٹکٹکھا کر کھولا۔ ”آغا جان! آپ نے ناشتا کر لیا؟“

وہ بیٹھ پہلی بارے تھے۔ ان کے بونٹ فانچ کے باعث ذرا شیر ہے ہو گئے تھے۔ اس کی
آہست سن کر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ جب سے وہ اپنی
اولاد پہ بوجھ بنتے تھے، محمل انہیں اپنے پاس لے آئی تھی۔

”تیمور کہہ رہا تھا، وہ رات تک پہنچ جائے گا۔“

وہ آگے بڑھی اور کھڑے کھڑے ان کا ہاتھ زدی سے تھامے بتانے لگی۔

”میں رات کو کچھ آپسیل بنانے کا سوچ رہی ہوں۔ کتنے دنوں بعد ہم تینوں اکٹھے
کھانا کھائیں گے، ہے نا؟“

آغا جان نے پھر مسکرانے کی سعی کی۔ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے دو آنسو
ٹوٹ کر گرے۔

”آپ فکر مت کیا کریں۔ میں ہوں نا آپ کے پاس۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے
مجھے شفادی، آپ کو بھی دے گا۔“ اس نے زدی سے ان کے آنسو صاف کئے۔ ”اچھا،
مجھے مسجد میں ایک پیچھر دینا ہے، بس گھنٹہ لگے گا۔ میں ابھی چلتی ہوں، جلدی آنے کی
کوشش کروں گی۔ پھر ڈر کی تیاری بھی کرنی ہوگی۔“ وہ گھڑی دیکھتی جانے کے لئے
مزدی۔

آغا جان اب سک سک کر رور ہے تھے۔

باہر آ کر وہ پیر ہیوں کے پاس گئے آئینے کے سامنے رکی۔ سامنے کیل پہ اس کی
پوئی نشگی تھی۔ اس نے پوئی اٹھائی اور لمبے بال سمیٹ کر اوپر پوئی میں جکڑے، پھر ایک
نظر آئینے میں خود کو دیکھا اور مسکرا دی۔

وہ آج بھی اتنی ہی صبح، تروتازہ اور خوب صورت تھی، جتنی برسوں پہلے ہوا کرتی

تھی۔ وہ اوپنی پونی آج بھی اس پر اتنی ہی خوب صورت لگ رہی تھی، جتنی پہلے لگتی تھی۔ اور آج بھی ہر صبح وہ دیں جاتی تھیں، جہاں پہلے جایا کرتی تھی۔ اس نے نئی وی بند کیا۔ (تیمور کا پروگرام ختم ہو چکا تھا) اور میز سے اپنا بیگ اور سفید جلد والا قرآن اٹھائے ”آغا ہاؤس“ سے باہر نکل آئی۔



وہ مسجد جانے سے قبل پندرہ منٹ کے لئے بس اٹاپ ضرور جایا کرتی تھی۔ اسے کئی یرسوں سے اس سیاہ فام لاڑکی کی تلاش تھی، جس نے اس تک قرآن پہنچایا تھا۔ وہ ایک دفعہ اس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔

سنبری سی صبح اتری ہوئی تھی۔ دور کہیں پرندے بول رہے تھے۔ وہ دھمکی رفتار سے چلتی، سفید جلد والا قرآن سینے سے لگائے شیخ پر آئی۔ ہر صبح کی طرح آج بھی وہ اسی موہومِ امید پر ادھر آئی تھی کہ شاید وہ لاڑکی آجائے۔

رات خوب بارش ہوئی تھی۔ سرمنی سڑک ابھی تک گلی تھی۔ وہ سر جھکائے اُداسی بیٹھی سڑک پر چلتی چیوتیاں دیکھ رہی تھی۔

پندرہ منٹ ختم ہونے کو آئے، مگر وہ لاڑکی کہیں بھی نہیں تھی۔ ماہیں ہو کر محمل نے جانے کے لئے بیگ اٹھایا۔

تب ہی اسے سڑک پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بے اختیار سر اٹھایا۔ ایک لاڑکی دور سے چلی آرہی تھی۔

کندھے پر کانج بیگ، ہاتھ میں موبائل، شولڈر کٹ بال کچر میں جکڑے، جیز پر گرتہ پہنے، چیونگم چباتی، قدرے جھنجلاتی ہوئی سی وہ دھپ سے آ کر اس کے ساتھ شیخ پر بیٹھی۔

محمل نیک نک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ لاڑکی روز اس وقت ادھر آئی تھی، مگر آج سے پہلے وہ اسے دیکھ کر اتنی چوکی نہیں تھی۔ اب وہ پاؤں جھلاتی ہوئی اکتا کر موبائل کے ہٹن پر لیں کر رہی تھی۔

”پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو۔“ زیریب غصے سے بڑو اکر اس نے مٹن زور سے دبایا اور موبائل بیگ میں پھینکا۔

وہ ابھی تک یوں ہی اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ بہت دھیرے سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

وہ لڑکی ادھر ادھر گردن گھماتی تلقیدی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ دفعۃِ محمل کی نگاہوں کا ارجمند محسوس کر کے وہ چونکی۔

محمل نے ذرا سنبھل کر نگاہیں جھکالیں۔ نیچے اس لڑکی کا بیگ پڑا تھا، جس پر جگہ جگہ چاک سے اس کا نام لکھا تھا۔

”عشاہ حیدر۔“

وہ زیریب مسکرا دی۔ بہت کچھ یاد آگیا تھا۔

”ایکسکیو زی!“ اس نے چیو نگم چباتا روک کر ایک دم محمل کو مخاطب کیا۔ محمل نے نرمی سے نگاہیں اٹھائیں۔

”جی؟“

”میں روز آپ کو دیکھتی ہوں اور.....“ اس نے محمل کی گود میں بیگ کے اوپر رکھے سفید کور والے قرآن کی طرف اشارہ کیا۔ اور آپ کی اس بیگ کو بھی۔ آپ اتنی کیسر سے اسے رکھتی ہیں۔ اس میں کیا کچھ خاص ہے؟“

محمل نے سر جھکا کر سفید قرآن کو دیکھا، جس کی صاف جلد اب خستہ ہو گئی تھی اور جھلکتے صفحے زرد پڑ گئے تھے۔ وہ دیکھنے سے کوئی بہت قدیم کتاب لگتی تھی۔

”خاص تو ہے۔“ اس نے مسکرا کر سر اٹھایا۔

”اچھا۔ واش سوا اپنیش!؟“ وہ مجس سوئی۔

”اس میں کسی عشاہ حیدر کا ذکر ہے، اس کی زندگی کی کہانی ہے اور اس کے لئے کچھ میسحیز ہیں۔ اس لئے اپنیش تو ہے۔“

وہ لڑکی یک ننگ منہ کھولے اسے دیکھئے گئی۔

”کون..... کون، عشاہ حیدر؟“ بہت دیر بعد بمشکل وہ بول پائی تھی۔

”ہے ایک اس زمین پر بننے والی لڑکی، جس کو لوگوں کی باتیں غلکیں کرتی ہیں، جس کے کہنے سے قبل کوئی اس کے دل کی بات نہیں سمجھتا اور جس کو زندگی سے اپنا حصہ دھول کرنا ہے۔“

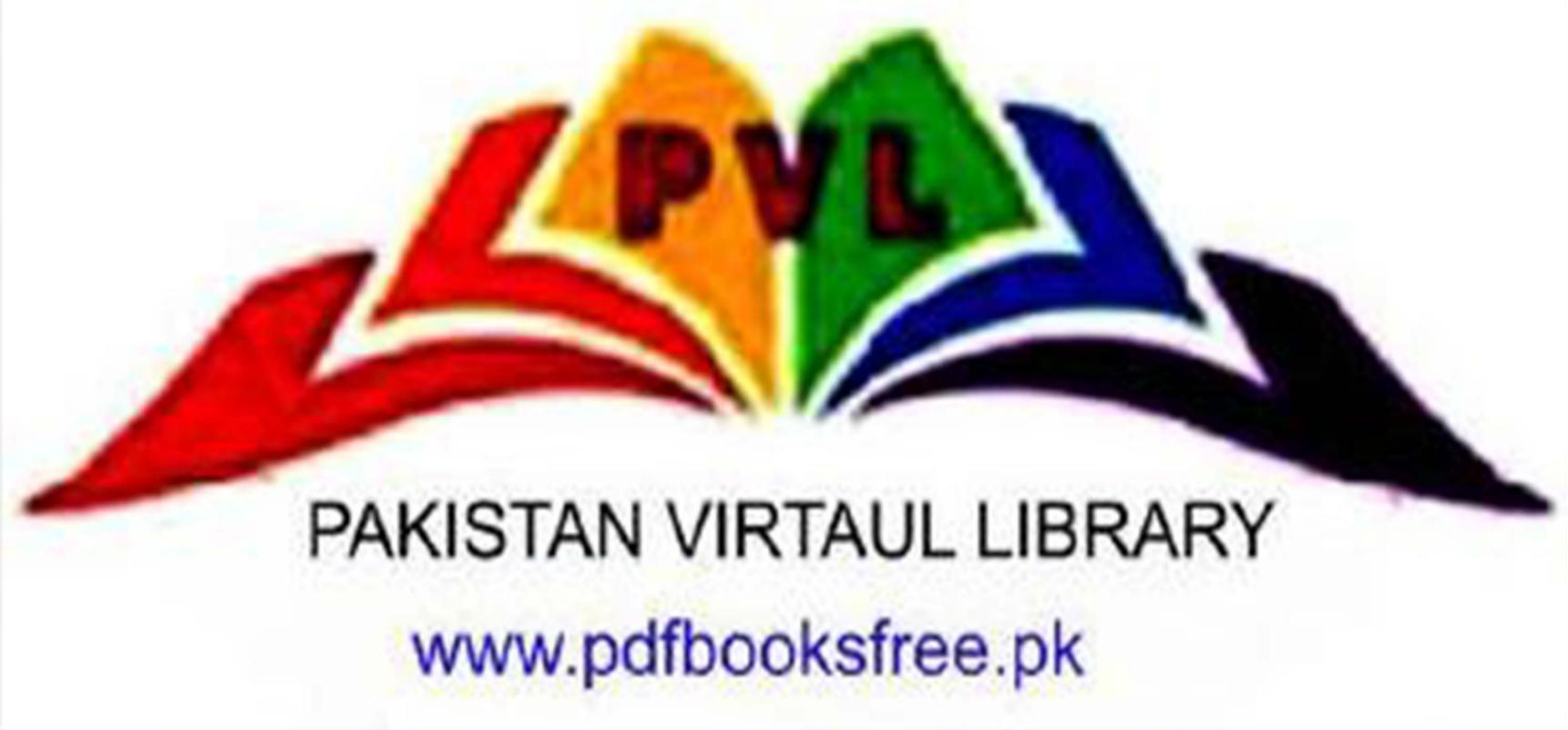
اسی لمحے بس نے ہارن بھایا۔ محمل نے بات روک کر ذور سے آتی بس کو دیکھا۔

”میں چلتی ہوں، تمہاری بس آگئی ہے۔“ وہ سفید جلد والی کتاب اور بیک اٹھانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لڑکی ابھی تک ششدہ رہی بیٹھی تھی۔
بس قریب آ رہی تھی۔

محمل چھوٹے چھوٹے قد اٹھاتی بیٹھ سے دور جانے لگی۔

”سینیں.... بات سینیں..... ایک منٹ رکیں۔“ یک دم وہ بے چینی سے اٹھی اور تیزی سے اس کے پیچھے پیکی۔

(تمت بالآخر)



ISBN: 978-969-602-041-7



القریش پبلی کیشنز

سکردو ڈپوک اردو بازار لاہور۔ فون: 042-37652546, 37668958

قارئین کے نام۔۔۔

محترم قارئین "مصحف" آپ نے خریدی اور پڑھی اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔

آپ نے اس کتاب کو اپنے عزیزوں میں متعارف کرایا اور اپنے پیاروں کو تھنے میں دے کر آپ نے کیا محسوس کیا؟

قارئین "مصحف" کے آئندہ کلر ایڈیشن میں آپ کی رائے بھی شامل کی جائے گی۔ آپ اپنی رائے ادارے کو بھجوائیں آئندہ "مصحف" کے گفت ایڈیشن میں آپ کی رائے شائع کی جائے گی۔ اگر آپ اپنی تصور بھی دینا چاہیں تو وہ بھی شائع کی جائے گی۔

آپ اپنی رائے ای میل info@alquraish.com پر بھی نصیح سکتے ہیں۔
اپنا نام، شہر کا نام، تعلیمی قابلیت، کے ساتھ ارسال کرویں۔

شکریہ
ادارہ

القریش پبلی کیشنز

سُرکِ روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958